آیت اللہ جعفر سبحانی

راہنمائے حقیقت

شیعہ عقائد کے متعلق سوال و جواب

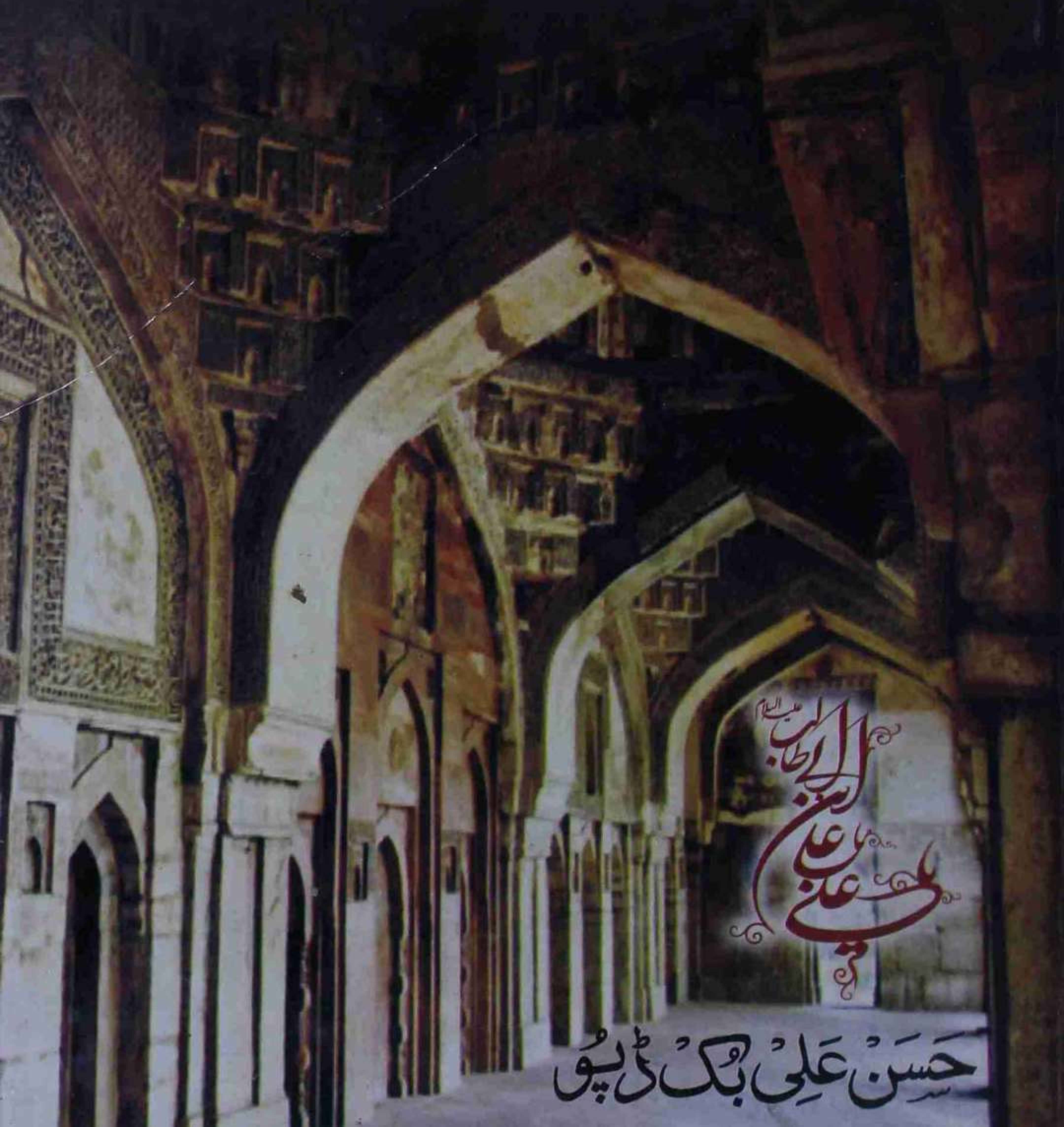

حسن علی بک ڈپو

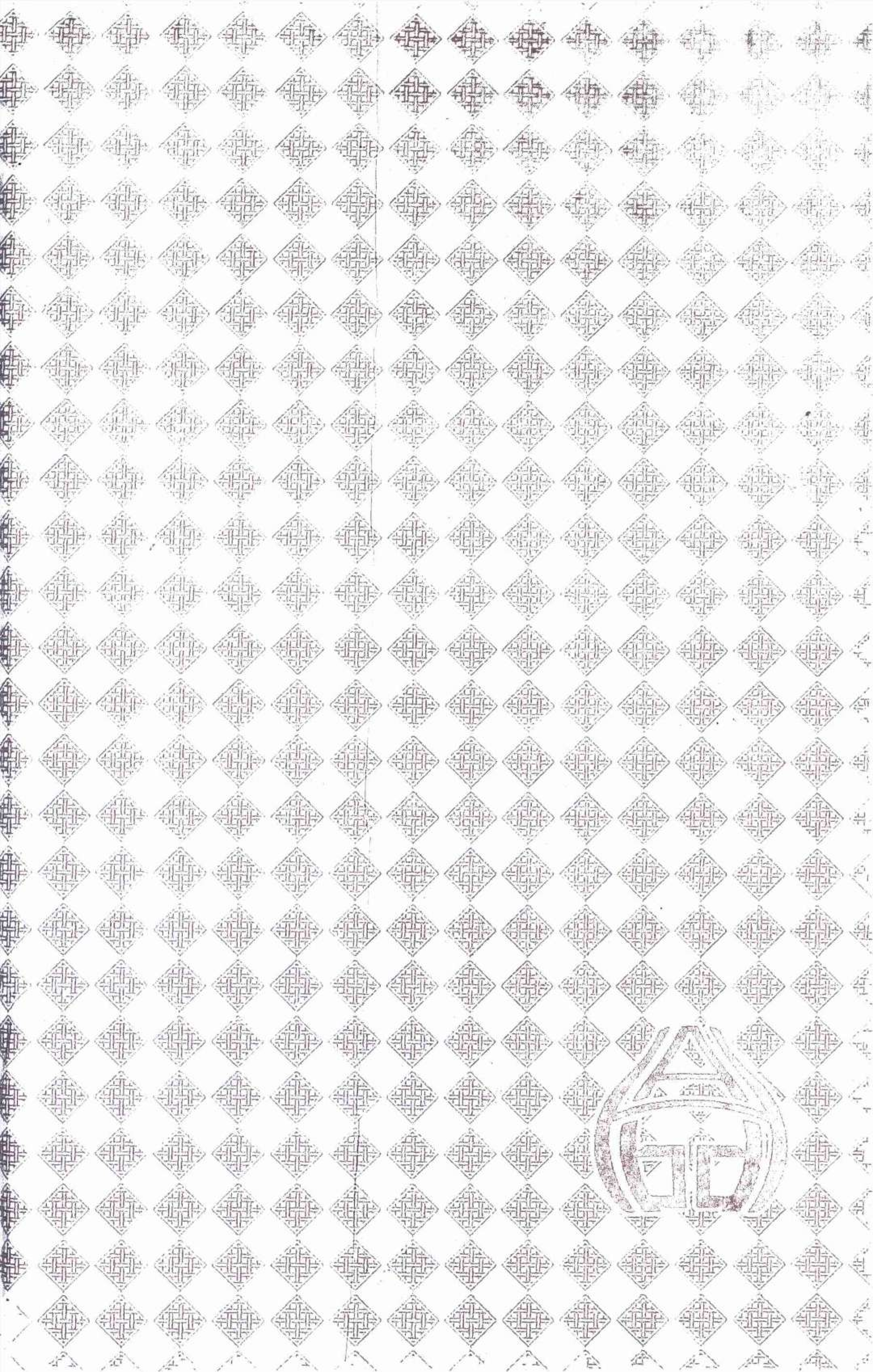

250
786/2381

ع 05.09.11-M NBL

راہنمائے حقیقت

شیعہ عقائد کے متعلق سوال و جواب

جلد اوّل

Acc No. 18164 Date 20/3/11
Section مناظرہ Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

مؤلف

آیت اللہ جعفر سبحانی

ناشر

حسن علی بک ڈپو

بلمقابل بڑا امام بارگاہ کھارادر کراچی، پاکستان۔

فون: 021-32433055

محمد علی بک ڈپو
0300-2985928 021-32242991

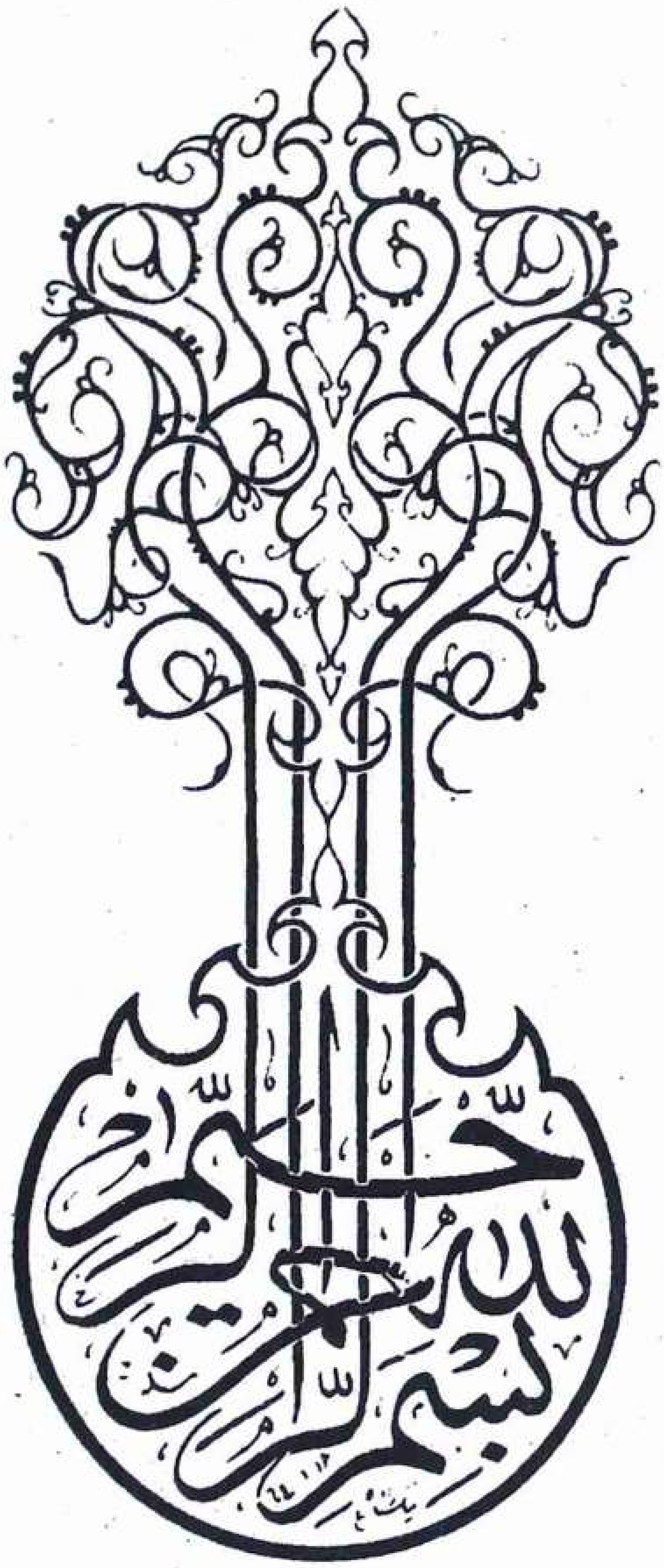
بسم الله الرحمن الرحيم

مشخصات کتاب

نام کتاب	....	رہنمائے حقیقت (جلداول)
مؤلف	....	آیت اللہ جعفر سبحانی
ترجمہ	....	حجۃ الاسلام علامہ محمد حسن جعفری
تصحیح	....	سید فیضیاب علی رضوی
کمپوزنگ	....	جیوانی پریس
		0300-2343346
ناشر	....	حسن علی بک ڈپو
تعداد	....	1000
سال اشاعت	....	2011

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب ھذا کے کسی حصے کی طباعت واشاعت، انداز تحریر، ترتیب، طریقے، جُز یا کُل کسی سائز میں نقل کرنا غیر شرعی اور غیر قانونی ہے

فہرست موضوعات

موضوع	صفحہ
مقدمہ	21
پیش گفتار	23
فصل اول	25
تاریخ تشیع اور اس کی توسیع	
لفظ شیعہ کی تحقیق	26
ا۔ عقیدۂ تشیع نے کس زمانہ میں جنم لیا؟	
سوال: عقیدہ تشیع کی ابتداء کے متعلق بہت سے مفروضے اور مختلف نظریات بیان کیے جاتے ہیں۔ وضاحت فرمائیں کہ عقیدہ تشیع نے کس زمانے میں جنم لیا تھا؟	28
رہبر کے انتخاب کے لئے عقلی تقاضے	29
ا۔ احادیث رسول میں شیعوں کا تذکرہ	32
۲۔ امامت ہمزادِ رسالت ہے	33
۳۔ حدیث منزلت	35
۴۔ حدیث غدیر	37
مذکورہ سفارشات کے نتیجہ میں شیعت کی تشکیل	39

رسول اللہ کے زمانے میں شیعہ 40
تشیع کی پیدائش کے متعلق بلا ثبوت اور غلط نظریات 44
ا۔ تشیع سقیفہ کی کاروائی کا ردعمل ہے۔ 44
۲۔ تشیع کا بانی عبداللہ بن سبا ہے۔ 46
ابن سباء کے مفروضہ کے متعلق محققین کا نظریہ 47
۳۔ تشیع جنگ جمل کی پیداوار ہے۔ 51
۴۔ تشیع اہل ایران کے ذہن رسا کی پیداوار ہے۔ 52
الف: اہل ایران، عراق میں ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ 53
ب۔ یمنی اشعریوں کی ہجرتِ قم 54
ج۔ امام علیؑ رضاؑ کی خراسان آمد 54
۷۔ علویوں کی ایران آمد 56

۲۔ اقلیت شیعہ و اکثریت تسنن

سوال: اگر مذہب شیعہ حق ہے تو پھر اقلیت میں کیوں ہے اور اکثریت مذہب تسنن کی پیروکار کیوں ہے؟ 58

۳۔ کیا ابن علقمی اور خواجہ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خان سے ساز باز کی تھی؟

سوال: کچھ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آخری عباسی خلیفہ ''مستعصم باللہ'' کی حکومت کو تباہ کرنے میں اس کے شیعہ وزیر مؤیدالدین ابن علقمی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور مؤرخین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سازش میں خواجہ نصیر الدین طوسی بھی شامل تھے۔ چنانچہ وزیر اور خواجہ نصیر کی ملی بھگت سے عباسی خلافت کا خاتمہ ہوا اور بغداد پر

ہلاکو خان منگول کی حکومت قائم ہوئی۔ ان واقعات میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے؟ 64
۱۔ دشمن بغداد کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور خلیفہ رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ 66
۲۔ عیسائیوں کی پس پردہ سازشیں 67
۳۔ ابن علقمی کی خردمندانہ تدبیر اور دوسروں کی مخالفت۔ 69
۴۔ بغداد کی شکست فوجی شکست تھی سیاسی شکست نہیں تھی۔ 70
خواجہ نصیر الدین پر تہمت کی حقیقت 71
خواجہ کی علمی خدمات 74

فصل دوم 76

عقائد شیعہ

عقیدہ و شریعت 77

۱۔ روزِ آخرت خدا کا دیدار

سوال: شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ آخرت کے دن ان حسّی آنکھوں سے اسے دیکھا جا سکے۔ جب کہ یہ عقیدہ قران کریم کی آیت اور حدیث صحیح کے خلاف ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ 79
۱۔ رؤیت قلبی و شہود باطنی 80
۲۔ مادی آنکھوں سے دیدارِ خداوندی 80

۳۔خدا کے دیدار کا عقیدہ دراصل درآمد شدہ عقیدہ ہے۔ 81
۴۔قرآن خداوند عالم کو رؤیت بصری سے منزہ مانتا ہے 82
۵۔عقیدہ رؤیت پر قرآن کی تنقید 84
رؤیت کا عقیدہ رکھنے والوں کی دلیل 85
دوسری آیات کی گواہی 88
اثبات رؤیت کے لئے حدیث سے استدلال 89
ابوقرّہ محدث سے امام علی رضاؑ کا مباحثہ 91

۲۔رجعت

سوال: رجعت کا مفہوم ہے کہ قیامت سے پہلے ایک گروہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا اور وہ اس دنیا میں آئیں گے۔آخر شیعہ عقائد میں رجعت کا عقیدہ کیوں شامل ہے؟ جب کہ مرنے کے بعد ہر شخص کے نامہ اعمال کا دفتر بند ہوجاتا ہے اور قیامت سے قبل کسی کا دوبارہ زندہ ہوکر اس جہان میں آنا ناممکن ہے۔(آخر ایسے غیر منطقی عقیدہ کا کیا ثبوت ہے)؟ 94
رجعت تناسخ نہیں ہے 96

۳۔قضاوقدر

سوال: کیا شیعہ قضاوقدر کا عقیدہ نہیں رکھتے؟ 98

۴۔بداء یا نیک و بد اعمال کی وجہ سے تقدیر کا بدل جانا

سوال: شیعہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں۔کیا اس عقیدہ سے خدا کی ناواقفیت ثابت نہیں ہوتی؟ 103

۵۔ مقاماتِ اولیا اور غیبی قوتیں

سوال: کیا انبیاء و اولیاء عام طاقت سے ہٹ کر خارق العادت امور بھی انجام دے سکتے ہیں؟ 109

کمال سے کیا مراد ہے؟ 111

آثارِ بندگی اور کمالِ نفسانی 113

قرآن اور کراماتِ اولیاء 113

۱۔ والد کی بینائی کے لئے حضرت یوسفؑ کا تصرف 113

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے دوستوں کی قدرت نمائی 114

۳۔ حضرت سلیمان کی قدرت نمائی 117

۴۔ حضرت مسیحؑ کے تصرفات 119

ولایت تکوینی اور مسئلہ غلو 121

۵۔ حضرت یوسفؑ اور غیب کی خبریں 122

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبی خبریں۔ 125

۱۔ ایک خارجی کے نصیب کی خبر 126

۲۔ یا علیؑ! بدبخت ترین شخص تم کو شہید کرے گا۔ 126

۳۔ ابوذرؓ عالمِ تنہائی میں مریں گے۔ 127

۴۔ عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ 128

۵۔ تو اونٹ پر سوار ہوگی اور علی سے جنگ کرے گی۔ 130

۶۔ علی! تو تین گروہوں سے جنگ کرے گا۔ 130

فصل سوم 131

اولیائے الٰہی سے توسل

مقدمہ 132

۱۔اولیائے الٰہی سے ارتباط

سوال: مسلمانوں میں اولیائے الٰہی سے توسل اور طلب شفاعت اور ان سے مدد طلب کرنا جیسے افعال رائج ہیں اور اس کی بنیاد اس بات کو قرار دیا جاتا ہے کہ ہم جو کہ جہان فانی میں زندہ ہیں اور اولیائے الٰہی جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ہمارے اور ان کے درمیان ایک طرح کا رابطہ موجود ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اس کی دلیل بیان فرمائیں۔ 135

۱۔جہانِ آفرینش اور علل و معلومات 135

۲۔جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے 136

۳۔قرآن اور بقائے ارواح 137

۴۔دنیا اور برزخ کا ایک دوسرے سے تعلق۔ 139

۱۔حضرت صالحؑ اپنی قوم کی ارواح سے گفتگو کرتے ہیں۔ 140

۲۔حضرت شعیب اپنی قوم کی ارواح سے کلام کرتے ہیں۔ 142

۳۔حضرت رسول اکرمؐ ارواحِ انبیاء سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ 142

۴۔رسول اکرمؐ مقتولینِ بدر سے کلام کرتے ہیں۔ 143

۲۔اولیائے الٰہی سے توسل

سوال: کیا اولیائے الٰہی سے توسل صحیح اور شریعت کے مطابق ہے اور کیا قرآن و

سنت میں بھی اس کا کہیں جواز موجود ہے؟ 146

۱۔ فرائض کی بجا آوری 146

۲۔ خدا کے اسماء وصفات سے توسل 147

۳۔ قرآن کریم کے ذریعے سے توسل 149

۴۔ مومن بھائی کی دعا سے توسل حاصل کرنا 150

۵۔ حیاتِ پیغمبر میں آنحضرت کی دعا سے توسل 151

۶۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپ کی دعا سے توسل 152

۷۔ پاکیزہ افراد کی منزلت کا واسطہ دے کر توسل کرنا 156

پاک انسانوں سے توسل کی تاریخ 159

۱۔ حضرت عبدالمطلبؑ اور شیر خوار محمد مصطفیؐ کا واسطہ 160

۲۔ ابوطالبؑ آنحضرتؐ کے ایام جوانی میں ان سے متوسل ہوتے ہیں۔ 160

۳۔ بچوں اور بزرگوں کے ہمراہ نماز استسقاء 161

۴۔ خلیفہ دوم رسول اکرمؐ کے چچا سے متوسل ہوتے ہیں۔ 162

۵۔ فاطمہ بنت اسدؓ کے حق میں پیغمبر کی دعا 163

توسل کے متعلق سوالات

سوال ۱: کیا مردہ سے دعا کی درخواست اس کی پرستش نہیں ہے؟ 165

سوال ۲: کیا کسی مرنے والے سے دعا کی درخواست کرنا بے فائدہ نہیں ہے؟ 166

سوال ۳: کیا ہمارے اور دنیا سے رخصت ہونے والوں کے درمیان کوئی رکاوٹ ہے؟ 167

سوال ۴: قرآنی آیت "انک لاتسمع الموتی" کا کیا مقصد ہے؟ 168

۳۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا

سوال: قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴿۴﴾ (ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) لہٰذا غیر اللہ سے مدد مانگنا فرمان خداوندی کے خلاف ہے اس آیت کو ہم روزانہ اپنی نمازوں میں دہراتے ہیں۔ 170

۴۔ اولیائے الٰہی سے شفاعت کی درخواست

سوال: کیا اولیا سے شفاعت کی درخواست موجب شرک نہیں ہے اور کیا یہ ان کی عبادت کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ 174
درخواست شفاعت کی حقیقت کیا ہے؟ 175
۱۔ حدیث انس بن مالک 176
۲۔ سواد بن قارب کی حدیث 176
۳۔ حدیث ابوبکر 177
۴۔ حدیث علیؑ 177
۵۔ نوجوان کی حدیث 178
شفاعت اولیاء کے متعلق ایک سوال 178

۵۔ کیا خدا کو مقام اولیاء کی قسم دینا شرک نہیں ہے؟

سوال: کچھ لوگ انبیاء و اولیاء کے مقام کو مدنظر رکھ کر خدا کو ان کے مقام کا واسطہ دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ خدایا! تجھے رسولِ اعظم کے حق کا واسطہ، میرے فلاں بیمار کو شفا

عطا فرما۔ اللہ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے لہٰذا خدا کو ان کے حق کا واسطہ دینا بے سود ہے۔ 181

۶۔غیر اللہ کی نذر ماننا

سوال: شیعہ اور دوسرے مسلمان اولیائے الٰہی کی نذر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دنبہ رسول خداؐ یا حسینؑ بن علیؑ کی نذر ہے۔ جب کہ غیر اللہ کی نذر ماننا ناجائز ہے۔ 184

۷۔کیا غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے؟

سوال: یہ بات عام مشاہدے میں آتی ہے کہ عام مسلمان بالخصوص شیعہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قران اور اپنے ائمہ کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں کیا اس طرح کی قسمیں کھانا از روئے شریعت درست ہے؟ 187

اقوال رسولؐ میں غیر اللہ کی قسم 188

صحیح مسلم میں منقول ہے 189

قسم کی حرمت کے قائل افراد کے دلائل 190

۸۔اولیاء اللہ کے ایام ولادت و وفات منانا

سوال: اولیائے خدا کے ایام ولادت و وفات منانے کا ابھی رواج ہو چلا ہے جب کہ عصر صحابہ میں یہ چیز رائج نہیں تھی۔ یہ بعد کی پیداوار ہے۔ آخر اسے انجام دینے کی کیا دلیل ہے؟ 194

آنحضرتؐ کی مہر و مودت دین اسلام کا حصہ ہے 195

۹۔اولیائے الٰہی کی زیارت قبور

سوال: کیا اولیائے الٰہی کی قبور کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے؟ 199

حرمِ رسولؐ میں حاضری 201

۱۰۔خواتین اور زیارت قبور اور دو سوالوں کے جواب

سوال: کیا عورتوں کے لئے قبروں پر جانا ممنوع نہیں ہے؟ 204

دو سوالات کے جواب 207

۱۱۔زیارتِ قبور کے قصد سے سفر کرنا

سوال: کیا زیارت قبور کے قصد سے سفر کرنا جائز ہے؟ 211

مسلمان اور زیارت کے لئے سفر مدینہ 213

زیارت قبور کو حرام کہنے والوں کی دلیل 216

مساجد سبعہ کی زیارت 219

۱۲۔قبور پر قبہ بنانا

سوال: کیا قبروں پر عمارت بنانا جائز ہے؟ 222

۱۔قبور انبیاء کی حفاظت کے لئے سلف صالح کا کردار 222

۲۔آثار کی حفاظت در حقیقت اصلیت کی حفاظت ہے۔ 222

۳۔انبیاء کے گھرانوں کی بلندی 224

۴۔قبور کی دیکھ بھال مہر و محبت کی علامت ہے۔ 227

۵۔اصحاب کہف اور ان کی قبور پر عمارت کی تعمیر 229

قبور کی ویرانی کے لئے وہابیوں کی دلیل 232

الف۔سند حدیث 233

ب۔دلالتِ حدیث 235

قبورِ اولیاء کی تعمیر کے لئے امام صادقؑ کی حدیث 239

۱۳۔قبور اولیاء کے پاس نماز پڑھنا

سوال: آیا انبیاء واولیاء کی قبر کے پاس نماز پڑھنا اور دعا مانگنا جائز ہے؟ 240

۱۴۔پیاروں کی جدائی پر سوگوار ہونا

سوال: مرحوم عزیزوں پر رونے کے لئے اسلام کا کیا حکم ہے؟ 246

گریہ روکنے کی دستاویز 255

۱۴۔شہداء کی سوگواری

سوال: راہِ حق کے شہدا کی عزاداری کا کیا فلسفہ ہے؟ 260

۱۶۔جنازہ کو مقاماتِ مقدسہ منتقل کرنا۔

سوال: دیکھا گیا ہے کہ شیعہ اپنے جنازوں کو مقامات مقدسہ کی طرف منتقل کرتے ہیں۔کیا یہ کام جائز ہے؟ 264

فصل چہارم 267

شیعوں کی نظر میں قران کا مقام

مقدمہ 268

۱۔شیعوں کے نزدیک قران کا مقام ومنزلت

سوال: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیعہ قران کریم میں تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں، کیا یہ بات درست ہے؟ 270

عدم تحریف اور علمائے شیعہ 275

۲۔ کتاب ''فصل الخطاب'' پر تنقید

سوال: محدث نوری ایک مشہور شیعہ عالم تھے۔ انہوں نے تحریف کے اثبات کے لئے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''فصل الخطاب'' ہے۔ اگر شیعہ تحریف کے قائل نہیں ہیں تو وہ اس کتاب کی تردید کیوں نہیں کرتے؟ 279

۳۔ مصحف فاطمہ سلام اللہ علیہا

سوال: کہا جاتا ہے کہ شیعوں کے پاس ایک اور قرآن ہے جسے ''مصحف فاطمہؑ'' کہا جاتا ہے۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟ 283

''اسلام میں 'مُحدَّث'' 287

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا محدثہ تھیں 288

۴۔ مُصحفِ علی

سوال: کیا حضرت علی بن ابی طالبؑ کے پاس کوئی علیحدہ مصحف موجود تھا؟ 289

۵۔ دعا کو قرآن سے زیادہ اہمیت دینا

سوال: شیعہ حضرات قرآن کریم کی بہ نسبت دعاؤں کی کتابوں کو زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ 292

۶۔ تحریف کی روایات کو کتب حدیث سے حذف کیوں نہیں کردیا جاتا؟

سوال: جب شیعہ قرآن کو تحریف سے پاک مانتے ہیں تو وہ ایسی روایات کو اپنی کتب حدیث سے حذف کیوں نہیں کردیتے؟ 294

۷۔شیعہ اور آیات متشابہات کی تاویل

سوال: کیا شیعہ حضرات اپنے مذہب کی تائید کے لئے آیات قرآن کی تاویل کرتے ہیں؟ 296

تاویل کی ایک اور قسم 299

۸۔عصر رسول میں قرآن کی جمع آوری

سوال: کیا عصرِ رسالت میں جمعِ قرآن کا دعویٰ فضائل خلفاء سے انکار کے لئے نہیں ہے؟ 301

فصل پنجم 305

امامت بہ نگاہ شیعہ

مقدمہ 306

۱۔امامت در قرآن

سوال: اگر امامت کا تعلق اصول سے ہے تو قرآن مجید میں اسے بیان کیوں نہیں کیا گیا؟ 309

وہ آیات جن کا تعلق مسئلہ امامت سے ہے: 309

۱۔آیت ولایت: 309

۲۔آیت ''اولی الامر'' 312

۳۔آیت اکمالِ دین 313

۲۔قرآن کریم میں ائمہ کے نام

سوال: قرآن مجید میں بارہ ائمہ کے نام کیوں نہیں بیان کیے گئے؟ 314
ا۔نام سے تعارف 315
۲۔تعداد سے تعارف 315
۳۔صفت سے تعارف 315
نام لینے سے بھی اختلاف ختم نہیں ہوتا۔ 317

۳۔امامت ونبوت کا فرق

سوال: امامت و نبوت میں کیا فرق ہے۔اسی طرح سے امام و نبی میں کیا فرق ہے،شیعہ حضرات محمد مصطفیؐ کو اپنا نبی مانتے ہیں اور علیؑ اور ان کی اولاد کو اپنا امام مانتے ہیں؟ 319
آیئے دیکھیں کہ امام کون ہوتا ہے؟ 320

۴۔ائمہ کے علم وآگاہی کا سرچشمہ

سوال: شیعہ بالخصوص شیعہ امامیہ اپنے عقائد اور احکام کا کچھ حصہ قرآن اور سنتِ رسول سے لیتے ہیں لیکن زیادہ مواقع پر وہ اپنے ائمہ کی روایات پر انحصار کرتے ہیں۔ واضح کریں کہ ائمہ شیعہ کے علم وآگاہی کا سرچشمہ کیا ہے؟ 322
الف: رسول خدا سے منقول 323
ب۔نقل از کتاب علیؑ 324
ج۔کتاب وسنت سے استنباط 325
د۔خدائی الہامات 327

۵۔ بارہ امام

سوال: ائمہ کے لئے بارہ کی تعداد پر ہی اصرار کیوں ہے۔ یہ تعداد کم و بیش کیوں نہیں ہوسکتی؟ 330

۶۔ بارہ ائمہ کی امامت پر عقیدہ کا زمانہ

سوال: کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ عہدِ رسالت میں موجود تھا یا امام حسن عسکریؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوا؟ 333

۷، ائمہ شیعہ اور مسندِ خلافت

سوال: یہ سچ ہے کہ جابر بن سمرہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے بارہ خلفاء کی حدیث روایت کی ہے۔ لیکن شیعوں کے بارہ امام اس کے مصداق نہیں ہیں کیونکہ وہ مسندِ خلافت پر کبھی فائز نہیں ہوئے تھے۔ 335

۸۔ بارہ ائمہ کی حدیث کی توثیق

سوال: کیا جابر بن سمرہ کی بیان کردہ بارہ ائمہ کی حدیث از روئے سند ضعیف نہیں ہے؟ 337

9۔ بارہ افراد کی امامت اور عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید

سوال: کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے ماخوذ نہیں ہے؟ 339

۱۰۔ حضرت علیؑ کی وصایت

سوال: آپ حضرات حضرت علیؑ کو وصی رسولؐ کیوں سمجھتے ہیں؟ 341

۱۔مرحلہِ تجہیز: 341

۲۔آنحضرتؐ کی جانشینی 341

عہد رسالت کے شعرا اور وصایت علیؑ کا ذکر 343

۱۱۔''اولی الامر'' سے کون لوگ مراد ہیں؟

سوال: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۃ النساء/۵۹) میں اولی الامر سے خاص افراد کیوں مراد لیے جاتے ہیں؟ 346

۱۲۔حدیث غدیر میں لفظ مولیٰ کا معنی

سوال: حدیث غدیر میں ''من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ'' کے الفاظ وارد ہیں کیا لفظ ''مولا'' سے محب اور مددگار مراد نہیں ہے؟ 351

۱۳۔چھ رکنی شوریٰ میں شمولیت

سوال: حضرت علیؑ نے حضرت عمر کی مقرر کردہ چھ رکنی شوریٰ میں شرکت کی تھی۔کیا آپ کی شرکت سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ آپ امامت کے لئے شورائی نظام کو قبول کرتے تھے؟ 360

اسلامی مصلحتوں کی وجہ سے خلفا سے تعاون کی پالیسی 364

۱۴۔نہج البلاغہ اور نصِ امامت

سوال: کیا نہج البلاغہ میں حضرت علی اور ان کی اولاد کے لیے کوئی نص امامت موجود ہے؟ 366

مقام اہل بیت 366

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین۔ الصلوۃ والسلام والتحیۃ والاکرام علی سید الانبیاء والمرسلین ابی القاسم محمد و اھل بیتہ الطاھرین الذین اذھب اللہ عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تینتیس برس تک خداوند عالم کے پیغام کو دنیا تک پہنچایا اور مرحلہ بہ مرحلہ اسلام کی وضاحت کی آخر کار اٹھارہ ذی الحجہ ۱۰ ہجری میں آپ نے حکم خداوندی سے حضرت علی ابن ابی طالب ؑ کو امت اسلامی کا پیشوا اور امام مقرر فرمایا اس کے ساتھ دین اور آپ ؐ کی رسالت کی تکمیل ہوگئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ ؐ نے عالمِ فانی کو چھوڑ کر عالمِ باقی کی طرف رحلت فرمائی۔

آنحضرت ؐ نے اپنی وفات سے قبل قران واہل بیت ؑ کی شکل میں دو گرانقدر موتی امت کے حوالے کیے۔ آپ ؐ نے امت اسلامیہ کو ان کی پیروی کا حکم دیا۔ آپ ؐ نے قران واہل بیت ؑ کی پیروی کی صورت میں امت کو یہ ضمانت دی تھی کہ وہ گمراہی سے محفوظ رہیں گے۔

"اِنّیِ تارِکٌ فیکُمُ الثّقلین کِتاب اللہ وَ عترتی ما اِنْ تمسّکتُم بِھما لَنْ تَضِلُّوا بَعدی ابداً"

لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند در چند وجوہ جن کے بیان کا یہ وقت نہیں ہے، لوگوں نے آنحضرت ؐ کی اس وصیت پر عمل نہ کیا اور افراد امت کی اکثریت نے قران اور اہل بیت ؑ کی پیروی میں جدائی ڈال دی اور پھر جوں جوں وقت گذرتا گیا اسلامی معاشرہ مشکلات میں مبتلا ہوتا گیا، مذہبی اختلافات میں توسیع ہوتی گئی اور اس سے اسلام دشمن افراد کو موقع ملا کہ انہوں نے

عقائد میں شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کوایک دوسرے کا جانی دشمن بنادیا اور اس طرح سے مسلمانوں کے قیمتی ذخائر ومنابع پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کوافلاس و جہالت اور پسماندگی کے حوالے کر دیا۔

اور آج چودہ سو کچھ برس بعد بھی یہ بین الاقوامی لٹیرے ان ہی حربوں سے میدان میں اترے ہیں اور مسلمانوں کے ملکوں جیسے عراق وافغانستان کوانہوں نے اپنی تباہ کن بمباریوں سے خاک وخون میں نہلا دیا ہے اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کوٹکڑے ٹکڑے کرر ہے ہیں اور اس طرح بہشت کے امیدوار ہیں! یہ استعمار گر امت اسلامیہ کوتباہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں صدر اسلام کے خوارج اوران کی جنایات کوزندہ کرر ہے ہیں۔

اس وقت علماء اور دانشمندوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حقائق کوواضح کریں اور شبہات کا جواب دیں تا کہ اسلامی دنیا میں خوارج کے باطل نظریات کی قلعی کھولی جا سکے اور اسلامی معاشرہ افتراق واختلاف سے محفوظ رہ سکے۔

اس وقت جو کتاب آپ کے سامنے ہے اس میں اسی فریضہ کوادا کیا گیا ہے اور یہ کتاب استاد اور فقیہ متفکر وفرزانہ حضرت آیت اللہ حاج شیخ جعفر سبحانی دامت برکاتہ کی تالیف لطیف ہے۔ آپ کی تمام تر زندگی اسلامی علوم ومعارف کی تحقیق میں بسر ہوئی ہے اور آپ نے مکتب اہل بیت کے تعارف ودفاع کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں اور آپؒ نے ہر قدم پر طالبانِ حقیقت کی رہنمائی کی ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم انہیں سلامتی اور درازی عمر عطا کرے ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب امت اسلامی کی وحدت میں اہم کردار ادا کرے گی۔

معاون آموزش و پژوہش بعثہ مقام معظم رہبری

۱۳۸۵/۴/۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

تحقیق کی حس انسانی روح کے ابعادِ اربعہ کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اگر انسانی میں یہ حسِ موجود نہ ہوتی تو انسان اپنے تکامل کی جانب قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔

چنانچہ علم و دانش اور قدرت و قوت کی قلمرو اس حس تحقیق کا نتیجہ ہے اور اس حس سے ہی زندگی کی گرہیں کھلتی ہیں اور جہان کے راز منکشف ہوتے ہیں۔

یہی حسِ تحقیق جوانوں کو سوال کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں کہ حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھنا چاہیے۔ جوان ابتدا میں تعجب سے سوال کرتے ہیں لیکن تحقیق و تحلیل کے بعد وہ حقیقت کے راستے پر چلنے لگ جاتے ہیں۔

اس مجموعہ میں جن سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں یہ سوالات دراصل بیت اللہ الحرام کے کچھ زائرین کی طرف سے اٹھائے گئے تھے اور انہوں نے بڑے اشتیاق سے ان سوالات کے جواب طلب کیے تھے۔

یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مخالفینِ شیعہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح کے سوالات اٹھا کر لوگوں کو مکتبِ اہل بیت کی پیروی سے روک سکیں گے حالانکہ جب لوگ ان سوالات کے تسلی بخش جواب سنتے ہیں تو وہ مذہب اہل بیتؑ اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ سوالات معاونت آموزش و پژوہش بعثہ حج مقام معظم رہبری، کی وساطت سے جمع

کیے گئے اور پھر ہمارے سپرد کردیئے گئے۔ بندہ کو یہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہوا کہ مذکورہ تمام سوالات کے جواب دیئے جائیں۔ اگرچہ ان میں بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب ہماری اور ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں پہلے سے دیا جاچکا ہے۔ امید ہے کہ یہ علمی اور منطقی گفتگو بہت سے اذہان کو متاثر کرے گی اور پیروانِ مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوگی۔

سوال اور جواب کی حیثیت برقی رو کے مثبت و منفی چارج کی سی ہے اور جب منفی اور مثبت برقیئے ملتے ہیں تو اس سے روشنی پیدا ہوتی ہے جو دل و جان و عقل و خرد کو منور کردیتی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بعض جوابات کے تحت کچھ مطالب میں آپ کو تکرار دکھائی دے گی۔ لیکن یہ تکرار بھی کسی فائدہ سے خالی نہیں ہے ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قارئین کو گزشتہ مطالب کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔ اگرچہ کسی مطلب کی ظرف رجوع کرنا ایک گروہ کے لئے مفید ہے اور بعض افراد کے لئے باعثِ سردردی ہے۔

مؤسسہ امام صادقؑ

جعفر سبحانی

۱۳۸۵/۴/۱۰

فصل اول

تاریخ تشیع اور اس کی توسیع

۱۔ عقیدۂ تشیع نے کس زمانہ میں جنم لیا؟

۲۔ اگر عقیدۂ تشیع برحق ہے تو اس کے پیروکاروں کی تعداد کیوں کم ہے؟

۳۔ کیا ابن علقمی اور خواجہ نصیر الدین نے ہلاکو خان سے تعاون کیا تھا؟

HASSAN ALI BOOK DEPO

پیش لفظ

لفظ شیعہ کی تحقیق

لغت میں لفظ شیعہ کے معنی اتباع اور پیروی کرنے والے کے ہیں اسی لئے قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ کہا گیا ہے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے " وَاِنَّ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ لَاِبۡرٰهِيۡمَ ۘ‏ ۸۳ "۔ (سورۂ الصّٰفّٰت / ۸۳) یقیناً نوح کے پیروکاروں میں سے ابراہیم تھے۔

عُرفی محاورات میں کسی شخص کے دوستوں اور پیروکاروں کو شیعہ کہا جاتا ہے[1] اس لفظ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اطلاق مفرد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے یعنی ایک شخص ہو یا دس افراد انہیں شیعہ ہی کہا جاتا ہے۔ تشیع یعنی کسی شخص یا (منزلت و) مقام کی پیروی کرنے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن متکلمین، اور فقہاء اور مورخین کی اصطلاح میں شیعہ اسے کہا جاتا ہے جو حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے محبت رکھے اور انہیں امت کا سیاسی اور علمی رہنما سمجھے اور مسئلہ خلافت کے لئے نفسِ پیغمبر کے حق کا عقیدہ رکھتا ہو اور خلافت کو انتخابی اور شورائی مسئلہ نہ سمجھتا ہو۔

یہی اصلی تشیع کا جزوِ اعظم اور اس کی روح ہے۔ جب کہ دوسرے کلامی اور فقہی مسائل تشیع کے دائرہ سے باہر ہیں کیونکہ عین ممکن ہے کہ تمام فرقے ان مسائل میں متفق ہوں یا مختلف نظریات رکھتے ہوں۔ شیعہ بھی اس قاعدے سے خارج نہیں ہیں بہت سے مسائل میں وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے ہم عقیدہ ہیں۔

اختلافی مسائل میں بھی شیعہ منفرد نہیں ہیں اگر وہ ایک مسئلہ میں کسی گروہ کے مخالف ہیں

---

[1] - شیعة الرجل اتباعه وانصاره - شیعہ کسی شخص کے پیروکاروں اور مددگاروں کو کہا جاتا ہے۔

توکسی دوسرے مسلمان فرقے سے کاملاً متفق ہیں چنانچہ 'خلافیات' کے عنوان پر لکھی گئی کتابوں کے مطالعے سے یہ مطلب اچھی طرح سے واضح ہوجاتا ہے(۱)۔

شیعہ دنیائے اسلام کا بہت بڑا فرقہ ہے جس کی ابتدا عہد نبوت میں ہوئی تھی اور اس نے پیروکار پیدا کیے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد تدریجی طور پر اس کی نشونما ہوتی رہی چنانچہ تشیع نے اسلام کے عظیم تمدن کو منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا اور مدینت کے تمام مراحل میں تشیع نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

اس باب میں ہم تین سوالات کے جواب دیں گے جن میں سے پہلا سوال انتہائی اہم ہے۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔ شیخ طوسی کی کتاب خلاف کی طرف رجوع فرمائیں۔

عقیدہ تشیع نے کس زمانے میں جنم لیا؟

سوال: عقیدہ تشیع کی ابتداء کے متعلق بہت سے مفروضے اور مختلف نظریات بیان کیے جاتے ہیں۔ وضاحت فرمائیں کہ عقیدہ تشیع نے کس زمانے میں جنم لیا تھا؟

جواب: اس طرح کے سوالات عام طور پر علم الکلام کے ایسے مکاتب فکر اور ایسے مذہبی فرقوں کے متعلق کیے جاتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد وجود میں آئے ہوں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب اشعری کب اور کیوں وجود میں آیا؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ مذہب اشعری علم الکلام کا ایک مکتب فکر ہے جس کو ابوالحسن اشعری (ولادت ۲۶۰ھ۔ وفات ۳۲۴ھ) نے متعارف کرایا تھا۔ اور اس مکتب فکر نے چوتھی صدی ہجری کے شروع میں جنم لیا تھا۔

اس کے مقابل مذہب معتزلہ ہے وہ بھی علم الکلام کا ایک مکتبِ فکر ہے جس کا بانی حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) کا شاگرد واصل بن عطاء (۸۰۔۱۳۰ھ) تھا۔

اس طرح کے مکاتب فکر کی پیدائش کی تاریخ کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کا سوال فقہی مذاہب کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مذہب حنفی کو ابوحنیفہ (۸۰۔۱۵۰ھ) نے متعارف کرایا تھا اور مذہب شافعی کی اساس محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰۔۲۰۴ھ) نے رکھی تھی۔ اس طرح سے باقی فقہی مذاہب کی تاریخ پیدائش مشخص ہے۔

جب کہ تشیّع کلامی اور فقہی مذہب نہیں ہے جس نے اسلام اور رسول اسلام کے بعد جنم لیا ہو کہ ہم اس کی پیدائش کے متعلق درج بالا سوال کر سکتے ہوں۔

تشیع کی تاریخ اسلام کی تاریخ کے ساتھ ہے اور حقیقت میں تشیّع اس اسلام کا دوسرا نام ہے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا تھا اور اس اسلام کی تعلیمات میں ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ انسانی رہبری اور امامت کا سلسلہ ان افراد کے ذریعے سے جاری رہے گا جنہیں خدا نے اس کام کے لئے مقرر کیا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا تعارف کرایا ہے۔

یہ بنیادی اصول اسلام کی بقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور حقیقت تشیع کو تشکیل دیتا ہے۔ رسول خداؐ نے اپنے عہد مبارک مین اس کا اعلان کیا تھا اور صحابہ کے ایک گروہ نے اسے قبول کیا تھا اور وہ لوگ رحلت پیغمبر کے بعد بھی اس عہد پر باقی رہے تھے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ صحابہ زمانہ پیغمبر اور رحلت پیغمبر کے بعد ابتدائی شیعہ تھے۔

اس کے برعکس ایک گروہ نے اس قاعدے کو نظر انداز کیا اور غیر مخصوص رہبری کا عقیدہ اختیار کیا۔

تشیع کا یہ مفہوم اسلامی تاریخ کا ایک حصہ اور آئین اسلام کی واقفیت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے رہبری و امام کی تعیین تعلیماتِ اسلام کا ایک جز تھی اور حیات رسولؐ میں اس کا اعلان کیا گیا تھا۔

رہبر کے انتخاب کے لئے عقلی تقاضے

احادیث و تاریخ کی ورق گردانی سے قبل ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حکومت اسلامی کی باگ ڈور کس کے ذمہ ہونی چاہیے؟

دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے دینی قیادت اور اسلامی ملک کے معاملات چلانے کے لئے کسی فرد کو معین کیا تھا یا یہ کہ آپؐ نے یہ کام مہاجرین و انصار کی صوابدید پر چھوڑ کر داعیِ اجل کو

لبیک کہا تھا؟

اجتماعی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیادت کے لئے ایک مرد کو معین کیا تھا آپؐ نے حکمِ خداوندی کو انتخابِ امت پر ترجیح دی تھی۔ کیونکہ آنحضرت کی رحلت کے وقت تین مضبوط اور انتہائی طاقتور دشمن اسلامی معاشرے کو چیلنج کر رہے تھے۔ مشرق کی طرف سے آتش پرست مجوسی (اسلامی ریاست کے لئے خطرہ تھے اور) مغرب کی طرف سے عیسائی (اسلام و مسلمین کے لئے شدید خطرہ تھے) اور اندرونی طور پر ففتھ کالم منافق تھے جن کے پاس اچھے خاصے وسائل موجود تھے۔ منافقین کے وجود پر قران کریم کی وہ آیات دلالت کرتی ہیں جو مختلف سورتوں میں ان کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔

چنانچہ ان حالت میں اسلامی معاشرے کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہؐ ایک صاحبِ قدرت، صاحب علم اور زاہد و پارسا شخص کو امت کی قیادت کے لئے مقرر کریں تا کہ آپ کی وفات کے بعد مذکورہ چیلنجوں سے نمٹا جاسکے، تمام قوتیں اس کی زیر قیادت اسلام کی حفاظت کے لئے یکجا ہو سکیں اور خطرات کی اس تکون سے نبرد آزما ہو سکیں۔ اگر آنحضرت اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیتے اور قیادت و رہبری کو امت کی صوابدید پر چھوڑ دیتے تو مذکورہ مشکلات کے ساتھ ایک اور مشکل کا بھی اضافہ ہو جاتا اور وہ مشکل مسلمانوں میں اختلاف کی صورت میں نمودار ہو سکتی تھی جس سے داخلی جنگ کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ تاریخی حقائق پر توجہ دینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انتخاب پر انتصاب کو اولیت حاصل تھی۔

باالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت سازی کے متعلق دو ہی نظریات کارفرما ہیں ایک نظریہ نص و انتصاب کا ہے اور دوسرا نظریہ انتخاب کا ہے اور وہ بھی مہاجرین و انصار کے توسط سے۔

اس مسئلہ کے لئے ہم پیغمبر اکرمؐ کے موقف کا قریب سے جائزہ لیتے ہیں کیونکہ یہ مسئلہ

تین مفروضوں سے باہر نہیں ہے۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد حکومت سازی کے لئے کچھ نہیں کہا تھا۔

۲۔ آنحضرتؐ نے طرز حکومت کے لئے اپنے موقف کا اظہار کیا تھا اور اسے شوریٰ کے سپرد کر کے چلے گئے تھے۔

۳۔ اپنے تربیت یافتہ افراد میں سے کسی لائق فرد کا رہبری کے لئے انتخاب کیا تھا۔

چونکہ دین کامل ہے اور اسے روز قیامت تک جاری رہنا ہے لہٰذا پہلا مفروضہ اکمال دین اور استمرارِ دین کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام انفرادی آئین نہیں ہے اور اس کی تعلیمات شخصی عبادت اور انفرادی دعاؤں تک محدود نہیں ہیں اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کو ہر طرح کی قانون سازی سے بے نیاز کرتا ہے اور روزِ قیامت تک انسانی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ ایسے جامع دین کا لانے والا مسائل حکومت سے خاموش اور لاتعلق نہیں رہ سکتا کہ اس بارے میں بولنے سے حیا کرے کیونکہ بقائے دین اس سے وابستہ ہے۔

جب کہ دوسرا مفروضہ کچھ حد تک قابل قبول ہے کہ پیغمبر اکرم مسائل حکومت سے لاتعلق نہ تھے۔ لیکن اگر آپؐ نے حکومت بنانے کا کام شوریٰ کی بنیاد پر چھوڑ دیا ہوتا تو چاہیے تھا کہ آپؐ اپنے ارشادات میں اس کی طرف اشارہ فرماتے اور شوریٰ کے شرائط و ضوابط کو باریکی سے بیان فرماتے اور اپنی حیاتِ ظاہری کے دوران مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اس سلسلے میں کوئی عملی اقدام کرتے کہ آپؐ کے بعد مسلمان کسی حیرت و سرگردانی میں مبتلا نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات مبارکہ اور احادیث نبوی اور تاریخ پیغمبر میں شورائی نظام حکومت کے لئے کوئی بھی نصِ صریح کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حد تو یہ ہے کہ خلیفہ اول کے بعد تعیینِ خلافت شورائی بنیاد پر نہ ہوئی بلکہ پچھلے خلیفہ کی نامزدگی پر ہی ایک شخص زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔

اسلام میں حکومت کوئی معمول بات نہیں ہے جو صرف "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورۂ الشوریٰ/ ۳۸) کے ایک جملہ پر ختم ہو جائے۔ بلکہ اس میں بہت سے احکام وامور شامل ہیں جن کے جزئیات وشرائط کی وضاحت کے لئے پیغمبر اکرمؐ کی خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔

تیسرا مفروضہ سابقہ دو مفروضوں سے کہیں زیادہ قابلِ قبول ہے اور اتفاق یہ ہے کہ رسول مقبولؐ کی احادیث اور حیات رسولؐ کی تاریخ سے یہی نظریہ ثابت ہوتا ہے۔ اس اجتماعی تجزیہ کے بعد اب ہم حدیث وتاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ا۔ احادیث رسول میں شیعوں کا تذکرہ

حضرت رسولؐ کی حیات طیبہ میں ہی علیؑ کے پیروکاروں کو لفظ شیعہ سے یاد کرنے کا آغاز ہوا تھا۔ اور بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم نے حضرت علیؑ کے پیروکاروں کو لفظ شیعہ سے یاد کیا تھا چنانچہ محدثین ومفسرین لکھتے ہیں کہ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (سورۃ البیّنہ/۷)
ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں۔ تو رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

"هُوَ اَنْتَ وَشيعَتُكَ يَومَ القِيامَةِ راضِينَ مَرضِيّينَ"
یعنی تو اور تیرے شیعوں سے قیامت کے روز خدا راضی ہوگا اور وہ خدا سے راضی ہونگے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت نے فرمایا:

"اَنْتَ وَ شِيعَتُكَ وَمَوعِدِى وَ مَوعِدُكُمُ الْحَوضُ، اذاجَاءَتِ الاُمَمُ لِلْحِسَابِ تُدعَونَ غُرّاً مُحَجَّلِينَ"
علی! تم اور تمہارے شیعہ اور میری اور تمہاری وعدہ گاہ قیامت کے دن حوض کوثر کے پاس ہے۔ جب امتیں حساب کے لئے پیش ہوں گی تو تم لوگوں کو اس حالت میں بلایا جائے گا کہ

تمہارے چہروں اور پیشانیوں سے نور چمک رہا ہوگا۔

اس آیت سے مربوط روایات تفسیر کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں جن میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اکرم نے حضرت علیؑ کے پیروکاروں کو شیعہ کے نام سے یاد کیا تھا۔ بطور نمونہ حسب ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے پیروان علیؑ کو رسول اکرمؐ نے اپنی زبان پاک سے لفظ شیعہ کا لقب دیا تھا۔ ان روایات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حکومت سازی کی تعین کا بھی پتا چلتا ہے۔

۲۔ امامت ہمزادِ رسالت ہے

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے مقامِ امامت مقامِ نبوت سے علیحدہ ہے۔ بنی وحی کو حاصل کرتا ہے اور دین کی بنیاد رکھنے والا ہوتا ہے جب کہ امام نہ تو وحی لینے والا ہوتا ہے اور نہ ہی دین کی بنیاد رکھنے والا ہوتا ہے۔ بلکہ بیانِ احکام اور ان کے نفاذ کے لئے جو رسول پر ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کے بعد وہی ذمہ داریاں امام پر ہوتی ہیں۔ امام احکام اسلام اور عقائد اسلامی کے بیان کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور امورِ مملکت کا مُدیر ہوتا ہے۔

روایات کے بموجب جب پیغمبر اکرمؐ نے بنی ہاشم کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اسی دن آپ نے حضرت علیؑ کی جانشینی اور رہبری کا بھی اعلان کیا تھا۔ نبوت اور امامت کے بیک وقت اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت اور امامت ہمزاد ہیں اور یہ دونوں عُہدے خدا کی طرف سے وحی الٰہی کے تحت ملا کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ کتب تاریخ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین برس تک خفیہ دعوت دی پھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر

۱۔ درمنشور جلد ۶ ص ۵۸۹، الصواعق المحرقہ ص ۱۶۱۔ نہایہ ابن اثیر مادہ ''قمح'' جلد ۴ ص ۱۱۰۔ مناقب ابن المغازلی ص ۲۹۳۔ اور دیگر کتب واضح رہے کہ سیوطی نے درمنشور میں ان احادیث کو تفسیر طبری اور تاریخ ابن عساکر سے نقل کیا ہے۔

"وانذر عشیرتك الاقربین" (سورۃ الشعرآء ۲۱۴) (آپؐ اپنے قرابت داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں) کی آیت مجیدہ نازل فرمائی۔ آپؐ نے چالیس افراد کو دعوت دی جو سب بنی ہاشم کے اہم افراد تھے۔ آپؐ نے سب کو کھانا کھلایا۔ پھر آنحضرتؐ نے اپنی گفتگو کا یوں آغاز کیا:

''آج تک کوئی شخص اپنے خاندان کے لیے اس سے بہتر نہیں لایا جو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی لایا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں خدا کی توحید و یکانگت اور اپنی رسالت کی دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس راہ میں میری مدد کرے وہ میرا بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہوگا''۔

آپؐ نے یہ جملہ فرما کر کچھ دیر انتظار کیا تا کہ دیکھیں کہ آپؐ کی دعوت پر کون لبیک کہتا ہے۔ اس وقت پوری محفل پر سناٹا چھا گیا تمام حاضرین کے سر جھکے ہوئے تھے اور سب گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اس مجمع میں اچانک حضرت علیؑ اٹھے۔ اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی انہوں نے خاموشی کو توڑا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منہ کر کے کہا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کام میں آپ کی مدد کروں گا''۔

پھر حضرت علیؑ نے اپنا ہاتھ آنحضرتؐ کی طرف دراز کیا تا کہ آپ سے فدا کاری کا عہد کریں اس موقع پر آنحضرت نے علیؑ کو بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی گفتگو کو دہرایا۔ پھر علیؑ اٹھے اور اپنی آمادگی کا اعلان کیا۔ اس بار بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے تیسری بار اپنی پیش کش کا اعادہ کیا لیکن اس بار بھی حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی کھڑا نہ ہوا۔ تب آنحضرتؐ نے علیؑ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر بزرگان بن ہاشم کے اجتماع میں یہ تاریخی جملے ارشاد فرمائے:

"ان هذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا"۔(1)

ترجمہ: بے شک یہ میرا بھائی اور میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہے اس کے فرمان کو سنو اور اطاعت کرو۔

تاریخ تشیع کی روشنی میں یہ حدیث امامت کے ہمزادِ نبوت ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ صرف ایک موقع نہیں تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کی رہبری کے لئے اپنا جانشین مقرر کیا ہو۔ اس کے علاوہ بھی آنحضرتؐ نے کئی مواقع پر اس امر کی وضاحت کی تھی۔ جس کے متعلق ہم یہاں سرسری اشارہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

۳۔ حدیث منزلت

حدیث منزلت مشہور احادیث میں سے ہے اس حدیث کو تمام محدثین و مورخین نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے:

جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے لئے تبوک کا رُخ کیا تو حضرت علیؑ کو ہمراہ نہیں لے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ میں منافقین کی فتنہ انگیزی کا مقابلہ کرنے کے لئے آپؑ کا وجود ضروری تھا۔

منافقین نے افواہ اڑائی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور علی بن ابی طالب کے تعلقات آپس میں کشیدہ ہو چکے ہیں اسی لئے وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے۔ حضرت علیؑ نے خود کو لشکر اسلام تک پہنچایا اور (رسول اللہؐ کو) اس افواہ کے بارے میں بتلایا۔

جواب میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ ملاحظہ فرمائیں: تاریخ طبری جلد ۲ ص ۳۱۹۔ ۳۲۱ مطبوعہ دار المعارف مصر، تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۶۲۔ ۶۳ طبع دار صادر بیروت۔ سیرت حلبی جلد ۱ ص ۳۱۱۔ مطبوعہ البھیۃ، مصر۔ تاریخ ابن عسکر جلد اول ص ۸۵۔ حدیث ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱ طبع بیروت۔ تفسیر خازن، علاء الدین شافعی جلد ۳ ص ۳۷۱ طبع مصر کے علاوہ اور بہت سی کتب۔

كَذَبُوا وَلٰكِنِّي خَلَفْتُكَ لِمَا تَرَكْتُ وَرَائِي، فَارْجِعْ وَاخْلُفْ فِي أَهْلِي وَأَهْلِكَ أَفَلَا تَرْضَىٰ يَا عَلِيُّ أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَىٰ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي"۔ (۱)

انہوں نے جھوٹ کہا ہے میں نے تمہیں اپنے گھر اور خانوادہ کی حفاظت کے لئے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ لوٹ جاؤ اور میرے اور اپنے خانوادہ میں میرے جانشین بن جاؤ۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت حاصل ہو جو کہ ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی۔ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت علیؑ حضرت ہارون کی طرح تمام صلاحیتوں اور اختیارات کے حامل تھے سوائے منصبِ نبوت کے۔

حضرت ہارونؑ کا ایک منصب حضرت موسیٰؑ کی وزارت تھا اور اس منصب کے لئے حضرت موسیٰ نے دعا مانگی تھی:

وَاجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿۲۹﴾ هٰرُونَ أَخِي ﴿۳۰﴾ (سورۂ طٰہٰ)

اور میرے لئے میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو وزیر بنا

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے منصب نبوت کے استثناء سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ہارونؑ کی تمام مسؤلیت کے حضرت علیؑ حامل تھے۔ یہ جانشینی صرف غزوہ تبوک تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ غزوہ تبوک اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے۔ اگر اس سے صرف غزوہ تبوک کے ایام میں جانشینی مقصود ہوتی تو اس کلی ضابطہ اور استثنائے نبوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

۱۔ صحیح بخاری/غزوہ تبوک، جلد ۶ ص ۳ سال طباعت ۱۳۱۴ھ۔ صحیح مسلم باب فضائل علی جلد ۷ ص ۱۲۰۔ سنن ابن ماجہ، (باب فضائل اصحاب پیغمبر) جلد اول ص ۵۵۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۵۱۹۔ ۵۲۰۔

۴۔ حدیث غدیر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علیؑ کی امامت، قیادت و رہبری پر بہت سے احادیث دلالت کرتی ہیں۔ البتہ ہم اس بحث کے لئے صرف تین احادیث پر اکتفا کرتے ہیں۔ آغاز رسالت میں پہلی حدیث ''یوم الدار''، حدیث منزلت دورانِ رسالت اور حدیث غدیر، رسول اللہؐ کی عمر شریف کے آخری حصے میں۔ (اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۰ ہجری میں دس ہزار مسلمانوں کو لے کر فریضۂ حج انجام دینے اور انہیں اس کے مناسک کی تعلیم دینے کے لئے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے روزِ عرفہ اور منیٰ میں جامع خطبات ارشاد فرمائے۔

مناسک حج کی ادائیگی کے بعد آپؐ نے مکہ چھوڑا اور جب آپؐ پانی کے ایک چشمہ کے قریب پہنچے جسے ''غدیر خم'' کہا جاتا تھا، اس وقت امینِ وحی تشریف لائے اور آپؐ کو وہاں ٹھہرنے کا حکم ملا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ فرمان نازل فرمایا:

يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (سورۃ المائدہ ۵/ ۶۷)

ترجمہ: اے رسول! جو کچھ آپؐ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں۔ اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے خدا کی رسالت کی تبلیغ ہی نہیں کی اور اللہ آپؐ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

چنانچہ اس حکم کے بعد پورے بیابان میں اذان کی آواز گونجی پھر آپؐ نے یہ خطبہ دیا:

''تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور اسی پر توکل کرتے ہیں اور ہم خدا سے اپنے نفوس کے شر اور اپنے اعمال کی برائیوں سے پناہ طلب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گمراہوں کو راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے۔ خدا جسے

ہدایت کردے تو اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

لوگو! وہ وقت قریب ہے جب میں دعوتِ حق پر لبیک کہوں گا اور تمہارے درمیان سے چلا جاؤں گا۔ مجھ سے بھی پوچھا جائے گا اور تم سے بھی پوچھا جائے گا.........۔

لوگو! جس کا میں مولا اور رہبر ہوں اس کا علیؑ بھی مولا اور رہبر ہے (۱)۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آخری جملے کو تین بار دہرایا اور پھر آپ نے فرمایا:

خدایا! جو علیؑ سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور جو علیؑ کو تنہا چھوڑ دے تو بھی اسے تنہا چھوڑ۔

جو یہاں موجود ہے وہ میرا یہ پیغام ان تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

ابھی یہ عظیم الشان اجتماع ختم نہیں ہوا تھا کہ وحی کا فرشتہ نازل ہوا اور اس نے خدا کی طرف سے یہ آیت پہنچائی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (المائدہ/۳)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا ہے (۲)۔

حدیث غدیر کا تعلق متواتر احادیث سے ہے۔ اس کے تواتر کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ایک سو بیس صحابہ نے اس کی روایت کی ہے اور تابعین میں سے نواسی (۸۹) افراد نے اس حدیث کو نقل

۱۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ

۲۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے زور سے تکبیر کہی اور فرمایا: میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت کو مکمل کیا اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے راضی ہوا۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ اپنی جگہ سے نکلے اور آپؐ کے صحابہ نے گروہ در گروہ حضرت علیؑ کو مبارک باد دی اور کہا کہ آپ ہمارے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا بن گئے۔

کیا ہے۔ مجموعی طور پر چودہ صدیوں میں تین سو ساٹھ علمائے اہل سنت نے اس کی روایت کی ہے اور اگر ہم اس کے ساتھ شیعہ علماء کو شامل کر دیں تو یہ حدیث تواتر کے اعلیٰ ترین درجہ پر دکھائی دے گی۔ (۱)

مذکورہ سفارشات کے نتیجہ میں شیعت کی تشکیل

ہم مذکورہ بالا تین احادیث پر ہی قناعت کر رہے ہیں۔ آنحضرت کی انہی احادیث کے نتیجہ میں حیات پیغمبرؐ میں ایک گروہ حضرت علیؑ کے گرد جمع ہو گیا تھا اور وہ لوگ حضرت علیؑ کی پیروی میں مشہور ہو گئے تھے۔

چنانچہ مشہور محقق جناب محمد کرد علی نے اپنی کتاب ''خطط الشام'' میں لکھا ہے۔:

''رسول اسلامؐ کی حیات طیبہ میں بزرگ اصحاب کا ایک گروہ حضرت علیؑ کی دوستی اور محبت میں مشہور ہو گیا تھا۔ جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت دو چیزوں پر کی تھی۔ پہلی چیز تمام مسلمانوں کی خیر خواہی تھی اور دوسری چیز حضرت علیؑ کی پیروی اور ان کی ولایت تھی۔

ابو سعید خدری کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو پانچ چیزوں کی دعوت دی گئی تھی لیکن لوگوں نے چار چیزوں پر عمل کیا اور پانچویں کو چھوڑ دیا۔

۱۔ سنن ترمذی جلد ۵ ص ۲۹۷۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۴۵ حدیث ۱۲۱۔

مستدرک حاکم نیشاپوری جلد ۳ ص ۱۱۰۔ مسند احمد بن جنبل جلد اول ص ۸۸ حدیث ۹۶۱، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۶۷۲۔ خصائص نسائی ص ۹۴۔ ۹۵۔ ۵۰۔

مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱۲ ص ۷۸، حدیث ۱۲۱۶۷۔ مشکوٰۃ المصابیح جلد ۳ ص ۲۴۶، الریاض النضرہ محب الدین طبری جلد ۲ ص ۱۶۹ طبع خانجی۔

ہم حدیث غدیر کے لئے فی الحال مندرجہ بالا حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس حدیث کی مزید تحقیق کے جویا حسب ذیل دو کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۔ عبقات الانوار تالیف میر حامد حسین ہندی المتوفی ۱۳۰۶ھ

۲۔ الغدیر۔ تالیف محقق عالی قدر عبد الحسین امینی (۱۳۲۰۔ ۱۳۹۰ھ)

پوچھا گیا کہ وہ چار چیزیں کون سی ہیں جنہیں لوگوں نے قبول کیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ وہ نماز، زکوٰۃ، ماہ رمضان کے روزے اور بیت اللہ الحرام کی زیارت۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ لوگوں نے کس بات کو چھوڑ دیا ہے؟

انہوں نے کہا کہ وہ چیز علی بن ابی طالبؑ کی ولایت ہے۔

ان سے پوچھا گیا کہ کیا علیؑ کی ولایت بھی مذکورہ چار چیزوں کی طرح سے فرض ہے؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔ ولایت علیؑ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی طرح سے واجب ہے۔

ایسے ہی افراد میں حضرت ابوذر غفاریؓ، عمار یاسرؓ، حذیفہؓ بن یمان، خزیمہؓ بن ثابت ذوالشہادتین، ابوایوبؓ انصاری، خالد بنؓ سعید اور قیسؓ بن سعد بن عبادہ شامل ہیں۔ (۱)

رسول اللہ کے زمانے میں شیعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ احادیث جن کا نمونہ ہم نے ابھی پیش کیا ہے، ان کے علاوہ دیگر بیسیوں احادیث جو کہ کتب تفسیر وحدیث میں مرقوم ہیں، نے سرزمین اسلام میں شیعت کی تخم ریزی کی۔ پھر یہ بیج آہستہ آہستہ پھلا پھولا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی وجہ سے صحابہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو دل وجان سے حضرت علیؑ کی شیدائی تھی اور وہ شیعیانِ علیؑ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس جماعت کے افراد نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اپنے عہد و پیمان کی حفاظت کی چنانچہ یہی افراد تاریخ اسلام میں ابتدائی شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کے بعد ہر زمانہ میں جیسے جیسے لوگوں کو مسئلہ امامت اور خلافتِ علیؑ کی حقانیت کا علم ہوتا گیا اتنا ہی عقیدہ تشیع کے ماننے والوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

تشیع کا آغاز سرزمین حجاز سے ہوا اور حجاز کی سرزمین ہی تشیع کی جنم بھومی ہے پھر جب امیر المومنینؑ نے دارالخلافہ کو عراق منتقل کیا تو تشیع میں اور ترقی ہوئی اور دنیا کے مختلف مقامات پر تشیع

۱۔ محمد علی کردکی کتاب خطط الشام جلد ۵ ص ۲۵۱

کا عقیدہ پھیلا۔ یہاں ہم امیر المومنینؑ کے مشہور ترین شیعوں کے نام لکھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سب کا تعلق اصحاب پیغمبرؐ سے ہے۔ ان ناموں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلے حصہ میں بنی ہاشم کے افراد کے نام لکھتے ہیں اور دوسرے حصہ میں بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا نام لکھیں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضرت علیؑ سے پیوستہ تھے اور اغیار سے کٹے ہوئے تھے۔

بنی ہاشم میں سے حسب ذیل افراد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۱۔عبداللہ بن عباس ۲۔فضل بن عباس

۳۔عبیداللہ بن عباس ۴۔قثم بن عباس

۵۔عبدالرحمن بن عباس ۶۔تمام بن عباس

۷۔عقیل بن ابی طالب ۸۔ابوسفیان بن حرث بن عبدالمطلب

۹۔نوفل بن حرث ۱۰۔عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب

۱۱۔عون بن جعفر طیار ۱۲۔محمد بن جعفر طیار

۱۳۔ربیعہ بن حرث بن عبدالمطلب ۱۴۔طفیل بن حرث

۱۵۔مغیرہ بن نوفل بن حارث ۱۶۔عبداللہ بن حرث بن نوفل

۱۷۔عبداللہ بن ابی سفیان بن حرث ۱۸۔عباس بن ربیعہ بن حارث

۱۹۔عباس بن عتبہ بن ابی لہب ۲۰۔عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث

۲۱۔جعفر بن ابی سفیان بن حرث۔

بنی ہاشم کے علاوہ بطور نمونہ حسب ذیل نام لیے جاسکتے ہیں۔

۲۲۔سلمان محمدی ۲۳۔مقداد بن اسود کندی

۲۴۔ابوذر غفاری ۲۵۔عمار بن یاسر

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۲۶۔حذیفہ بن یمان

۲۷۔خزیمہ بن ثابت

۲۸۔ابوایوب انصاری (مدینہ میں میزبان رسولؐ)

۲۹۔ابوہیثم مالک بن تیہان

۳۰۔ابی بن کعب

۳۱۔سعد بن عبادہ

۳۲۔قیس بن سعد بن عبادہ

۳۳۔عدی بن حاتم

۳۴۔عبادہ بن صامت

۳۵۔بلال بن رباح حبشی

۳۶۔رسول خداؐ کا آزاد کردہ غلام ابورافع

۳۷۔ہاشم بن عتبہ

۳۸۔عثمان بن حنیف

۳۹۔سہل بن حنیف

۴۰۔حکیم بن جبلہ عبدی

۴۱۔خالد بن سعید بن عاص

۴۲۔ابن حصیب اسلمی

۴۳۔ہند بن ابی ہالہ تمیمی

۴۴۔جعدہ بن ہبیرہ

۴۵۔حجر بن عدی کندی

۴۶۔عمرو بن حمق خزاعی

۴۷۔جابر بن عبداللہ انصاری

۴۸۔محمد بن ابی بکر

۴۹۔ابان بن سعید بن عاص

۵۰۔زید بن صوحان عبدی

مذکورہ بزرگوں کے حالات سے آگاہی کے لئے اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔خوش قسمتی سے کچھ محققین نے اس موضوع کو اہمیت دی ہے اور اس عنوان پر کتابیں تالیف کی ہیں۔اس عنوان پر مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ انتہائی مفید ہے:

۱۔سید علی خان مدنی نے اس عنوان پر مکمل کتاب لکھی ہے جس کا نام انہوں نے "الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعۃ الامامیہ" رکھا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے شیعوں کے طبقہ اولیٰ میں شیعہ صحابہ کا تعارف کرایا ہے۔اس کا پہلا باب شیعان بنی ہاشم اور دوسرا باب غیر بنی ہاشم شیعوں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے طبقہ دوم میں تابعین کا تعارف کرایا ہے جو حضرت علیؑ کی پیروی میں معروف تھے۔ بعد ازاں ہر صدی کے نامور شیعوں کے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ علامہ شرف الدین عاملی (۱۲۹۰۔۱۳۷۷ھ) نے شیعہ صحابہ کے ناموں کی فہرست پیش کی ہے، انہوں نے ان کے حالات زندگی نہیں لکھے لیکن انہوں نے اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ ان کے بعد آنے والے اہلِ قلم ان شیعہ صحابہ کے حالات زندگی لکھیں۔(۱)

۳۔ شیخ محمد حسین کاشف الغطاء (۱۲۹۴۔۱۳۷۳ھ) نے ''فجر الاسلام'' کتاب کی رد میں ''اصل الشیعۃ واصولھا'' نامی کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے شیعہ صحابہ کے نام لکھے اور ان کی تشیع کے کچھ نمونے بھی پیش کیے۔ انہوں نے مذکورہ بزرگوں کے اثبات تشیع کے لئے ابن عبدربہ کی کتاب ''الاستیعاب'' اور ابن حجر کی کتاب ''الاصابہ'' سے استفادہ کیا ہے۔(۲)

۴۔ مشہور خطیب ڈاکٹر شیخ احمد وائلی نے اپنی گرانقدر کتاب ''ہویۃ التشیع'' میں ایک سو تیس صحابی شیعوں کے ناموں کی فہرست پیش کی ہے جو کہ حضرت علیؑ کی وصایت و خلافت کے قائل تھے۔

موصوف نے بحث کا یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سرزمین اسلام میں تشیع کی تخم ریزی سب سے پہلے حضرت رسول خداؐ نے کی تھی اور آپ کی تعلیمات بہت سے اصحاب کے تشیع کا ذریعہ ثابت ہوئی تھیں۔

۵۔ مؤلف کتاب ہذا نے بھی اپنے دروس میں شیعہ صحابہ کا حروف تہجی کی ترتیب سے تعارف کرایا تھا جسے محترم مہدی پیشوائی نے جمع کر کے دو جلدوں میں شائع کرایا تھا۔ بعد میں دانش مند محترم آقائے خوش نویس نے اس کا عربی ترجمہ کر کے انہیں شائع کرایا۔

۱۔ الفصول المہمہ فی تالیف الامہ ص ۱۷۹۔۱۹۰

۲۔ اصل الشیعۃ واصولھا ص ۵۳۔۵۴

تشیع کی پیدائش کے متعلق بلا ثبوت اور غلط نظریات

ایک گروہ جسے نہ تو تاریخ شیعہ کا علم ہے اور نہ ہی اس کی پیدائش کے متعلق کچھ پتا ہے نے کوشش کی ہے کہ تشیع کی پیدائش کے متعلق کچھ خودساختہ نظریات پیش کیے جائیں اور ان میں سے کچھ کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تشیع سقیفہ کی کاروائی کا ردعمل ہے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ سقیفہ میں ایک گروہ نے حضرت ابوبکر کی خلافت کے حق میں رائے دی تھی جب کہ صحابہ رسولؐ کے ایک گروہ نے انہیں خلیفہ ماننے سے انکار کر دیا تھا اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم حضرت علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے کی بیعت نہیں کریں گے۔ (۱) چنانچہ اسی دن تشیع، تسنن کے مقابلے پر نمودار ہوئی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سقیفہ کی کاروائی انتہائی دردناک واقعہ ہے اور یہاں اس بحث کا پورا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ابھی پیغمبر اکرمؐ کا جسد اطہر دفن نہیں ہوا تھا اور بنی ہاشم اور کچھ دیگر افراد آنحضرتؐ کے غسل و کفن میں مصروف تھے کہ انصار کے دو قبائل اوس و خزرج خلافت کے حصول کے لئے جمع ہو گئے اور جب حضرت ابوبکر و عمر کو ان کی کاروائی کی اطلاع ملی تو انہوں نے رسول خداؐ کے جسد اطہر کو چھوڑ دیا اور اپنے ساتھ اور تین افراد کو لے کر سقیفہ چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے خلافت اور امت کی رہبری کے متعلق باتیں کیں۔ قبیلہ اوس نہیں چاہتا تھا کہ قبیلہ خزرج کا کوئی شخص خلیفہ بن جائے (اسی رقابت کے پیش نظر) انہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی۔ جب کہ قبیلہ خزرج کے افراد نے اس کے ردعمل میں یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم علیؑ کے علاوہ اور کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

۱۔ طبری جلد ۲ ص ۴۴۳۔ ۴۴۴

آخرکار پہلا گروہ کامیاب ہوکر سقیفہ سے باہر آیا اور انہوں نے راستے میں اور مسجد نبوی میں لوگوں کو بیعت کی دعوت دی۔

اسی دوران ایک گروہ حضرت علیؑ کے گھر میں یا کسی اور جگہ اکٹھا ہوا۔ وہ سب حضرت علیؑ کی امامت و رہبری کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ اس دن تشیع نے جنم لیا تھا۔

جواب: یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سقیفائی سیاست سے ناراض افراد نے عصبیت میں آکر حضرت علیؑ کی خلافت کا نعرہ بلند کیا تھا بلکہ یہ لوگ رسول اکرمؐ کی احادیث کی وجہ سے خلافتِ علیؑ پر اصرار کر رہے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ رسولؐ مقبول کی وصیت پر عمل ہونا چاہیے۔

مسعودی مروج الذہب میں وفات رسولؐ کے بعد کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

امام علیؑ اور ان کے پیروکاروں کا ایک گروہ ان کے گھر میں بیٹھ گیا۔ وہ لوگ حضرت ابوبکر کی بیعت کے لئے نہیں گئے کیونکہ وہ حضرت علیؑ کی پیشوائی کے طلبگار تھے۔ (۱)

صحابہ کے ایک گروہ نے جب یہ سنا کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی ہے تو انہوں نے ان پر اعتراض کیا۔ مثلاً سلمانؓ فارسی اٹھے اور انہوں نے کہا کہ تم لوگ بوڑھوں کے پیچھے چلے ہو اور تم نے سرچشمہ علم سے منہ موڑ لیا ہے۔ اگر تم لوگ رسول خداؐ کے خاندان میں خلافت کو رہنے دیتے تو دو افراد بھی اس کے متعلق اختلاف نہ کرتے (۲)

ابوذرؓ وارد مدینہ ہوئے اور انہیں سقیفہ کا علم ہوا تو انہوں نے صحابہ کی طرف رُخ کیا اور ان پر تنقید کی اور کہا کہ تم لوگ پست چیز پر قانع ہو گئے ہو اور تم نے رسول خداؐ کے رشتہ کو نظر انداز کر دیا۔ اگر تم اہل بیت کی پیروی کرتے تو دو شخص بھی تم سے اختلاف نہ کرتے۔ (۳)

سقیفہ کی بیعت پر صحابہ کی تنقید کے یہ چند نمونے تھے۔ یہ عظیم القدر صحابہ حضرت علیؑ کی

۱۔ کتاب الوصیہ ص ۱۲۱

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۶ ص ۴۳۔

۳۔۔ الامامۃ والسیاسۃ۔ ابن قتیبہ دینوری جلد اول ۱۷ ص ۱۲

پیشوائی کے خواہش مند تھے اور یہ طرز تفکر سقیفہ کی کاروائی کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوا تھا اس کی بجائے یہ طرز فکر رسول اللہؐ کی سفارش اور آنجناب کے علیؑ کے پیشوا ہونے کے بارے میں اعلان کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

۲۔ تشیع کا بانی عبداللہ بن سبا ہے۔

کچھ متعصب افراد جو کہ تشیع کو داغدار بنانا چاہتے ہیں اور وہ اسے درآمد شدہ نظریہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں اور وہ اسے ایک یہودی کی کارستانی بتاتے ہیں۔

یہ متعصب افراد اس مفروضہ کو ترویج دے رہے ہیں کہ یمن میں ایک یہودی رہتا تھا جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا اور وہ "ابن الامۃ السودا" (سیاہ فام لونڈی کا بیٹا) کے نام سے مشہور تھا۔ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں اس نے اسلام کا ظاہری لبادہ اوڑھا تھا اور اس نے شام، بصرہ، کوفہ اور مصر جیسے اسلامی مراکز میں گشت کی اور وہ لوگوں کو حضرت علیؑ کی امامت کی دعوت دیتا تھا اور وہ یہ پرچار کرتا تھا کہ حضرت علیؑ رسول خداؐ کے وصی ہیں اور وہ خاتم الاوصیاء ہیں جیسا کہ رسول خدا خاتم الانبیاء ہیں جب کہ عثمان نے مقام خلافت غصب کیا ہوا ہے اور اس نے یہ منصب حضرت علیؑ سے چھینا ہوا ہے۔

اس نے ہر جگہ اس نظریہ کی تبلیغ کی اور وہ حضرات ابوذر غفاری، عمار یاسر، محمد بن حذیفہ، محمد بن ابی بکر، صعصعہ بن صوحان عبدی اور مالک اشتر جیسے صحابہ و تابعین کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے بہت بڑے گروہ کو دھوکا دیا اور اپنے گھر میں بیٹھ کر خلیفہ ثالث کے قتل کے محرکات فراہم کیے۔ آخر کار حضرت عثمان کو قتل کرا کے حضرت علیؑ کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہوگیا"۔(۱)

یہ غلط اور بے سند مفروضہ طبری کا پیش کردہ ہے۔ اس کے بعد کچھ مؤرخین نے طبری کی

۱۔ تاریخ طبری: ج ۳ ص ۳۷۸

پیروی کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں لکھا۔لیکن ان لوگوں نے نہ تو اس مفروضہ کی سند پر توجہ کی اور نہ ہی اس کے خودساختہ مضمون پر دھیان دیا۔

ابن سباء کے مفروضہ کے متعلق محققین کا نظریہ

طبری کا یہ بیان کئی حیثیتوں سے ناقابلِ قبول ہے:

۱۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گمنام یہودی مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی مراکز کے تن تنہا دورے کرے اور صحابہ وتابعین کو اپنا ہمنوا اور ہم خیال بنا لے؟

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نومسلم یہودی اتنا طاقت ور بن جائے کہ وہ ہزاروں افراد کو اسلام کے مرکز مدینہ میں بھیج کر صحابہ کی آنکھوں کے سامنے خلیفہ وقت کو قتل کرا دے؟ اور حضرت علیؑ کو وصی رسول کے عنوان سے متعارف کرائے؟

یہ توجیہ تاریخی حقائق سے میل نہیں کھاتی، بلکہ چاہئے کہ خلیفہ کے قتل کی وجہ سے مدینہ کے اندر ہی ان کے افعال کا جائزہ لے کر تحقیق کی جائے۔

۲۔ اوراق تاریخ اس بات کے شاہد ہیں کہ حضرت عثمان ومعاویہ کسی کو بھی تنقید کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور جس کسی نے بھی ان پر ہلکی سی تنقید کی تو اسے سخت ترین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے عظیم صحابی نے دولت جمع کرنے پر تنقید کی تو ان پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا اور انہیں مدینہ سے جلاوطن کر کے ''ربذہ'' میں بھیج دیا جہاں انہوں نے نہایت ہی بے کسی کی حالت میں وفات پائی تھی۔

حضرت عمار یاسرؓ بھی عثمانی روش پر تنقید کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ ان پر ناراض ہو گیا اور اس کے حکم سے اس کے غلاموں نے عمار یاسر کو اتنے تازیانے مارے کہ ان کی پسلی ٹوٹ گئی تھی۔ اس طرح دیگر مخالفین جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعود دورانِ خلافتِ عثمان تشدد اور توہین کا نشانہ بنائے گئے۔

ایسی سخت گیر پالیسی کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ خلافتِ اسلامی اتنی طاقت رکھنے کے باوجود (کہ جس میں جلیل القدر صحابیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا) ایک یہودی فرد کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں افراتفری پیدا کردے اور شام ومصر وکوفہ پر تسلط جمالے اور ایک فوج کے ساتھ مدینہ پہنچے اور خلیفہ کو اقتدار سے ہٹادے اور ایک دوسرے خلیفہ کو مقرر کردے؟

۳۔ طبری کے خود ساختہ نظریہ کو تسلیم کرنے والے حضرات سے گذارش ہے کہ اگر بفرض محال یہ بات حقیقت ہے تو پھر انہیں عدالت صحابہ کے نظریہ سے دستبرداری اختیار کر لینی چاہیے کیونکہ ایک طرف وہ تقدیس صحابہ کے گن گاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ عادل تھے اور کسی صحابی کے متعلق بھی جرح وتعدیل درست نہیں ہے اگر واقعی صحابہ عادل تھے تو پھر عمار یاسر، ابوذر غفاری، محمد بن حذیفہ اور عبداللہ بن مسعود جیسے بزرگ صحابہ اور اکابر تابعین ایک یہودی کے جنگل میں کیسے پھنسے؟

۴۔ مذکورہ تاریخی اور عقلی تجزیہ کے بعد ہم طبری کی بیان کردہ روایت کا سرسری سا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ طبری نے آنکھ بند کر کے جن لوگوں سے اس خود ساختہ داستان کو نقل کیا ہے ان راویوں کی حیثیت خود علمائے اہل سنت کی نظر میں کیا ہے؟

طبری نے اس داستان کو جن لوگوں کی سند سے نقل کیا ہے ان پر کسی بھی صورت اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لیجئے طبری کی سند ملاحظہ فرمائیں:

سری نے شعیب سے، اس نے سیف سے، اس نے عطیہ سے اور اس نے یزید فقعسی سے روایت کی ہے کہ...... (۱)

آیئے علم الرجال کی روشنی میں اس داستان کے راویوں کی وثاقت کا جائزہ لیں۔

۱۔ تاریخ طبری جلد ۳ ص ۳۷۸

ا۔سری نام کے دو راوی اہل سنت میں معروف ہیں۔

الف: سری بن عبداللہ ہمدانی: علم الرجال کے مشہور ماہر یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ یہ شخص کذاب اور ضعیف تھا۔(۱)

ب۔سری بن عاصم بن سہل ہمدانی۔ یہ شخص بغداد میں رہتا تھا اس کی وفات ۲۵۸ھ میں ہوئی۔ تاریخ طبری کے مؤلف نے اس کی زندگی کا کچھ حصہ پایا تھا۔اس کے متعلق علمائے رجال کا یہ کہنا کافی ہے کہ وہ کذّاب اور حدیث کا چور تھا(۲)

۲۔شعیب بن ابراہیم کوفی۔ یہ شخص مجہول الحال تھا۔ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ شخص سیف بن عمر کی کتابوں کا راوی ہے لیکن ہم اسے نہیں پہچانتے۔

۳۔سیف بن عمر۔اس روایت کے ضعف کا مرکزی سبب یہی شخص ہے اس کے متعلق ابن حبان کہتے ہیں کہ سیف بن عمر خود ساختہ احادیث و تاریخ کو مشہور شخصیات کی طرف منسوب کرتا تھا اور احادیث اختراع کرتا تھا۔ یہ شخص زندیقی (بے دینی) سے متہم تھا۔ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی بیان کردہ تمام روایات مجہول اور نا قابل قبول ہیں(۳)

ہم طبری کی بیان کردہ داستان پر صرف اتنی ہی تنقید پر اکتفا کرتے ہیں اگرچہ اس کی سند پر اس سے کہیں زیادہ ایرادات وارد کیے جاسکتے ہیں۔انہی حقائق کے مدنظر ڈاکٹر طہ حسین جیسے مشہور محققین نے ابن سبا کی شخصیت سے انکار کیا ہے اور اسے تاریخی افسانہ قرار دیا ہے۔ڈاکٹر طہ حسین کے علاوہ اور بھی بہت سے محققین نے اس کو افسانہ تاریخی سے تعبیر کیا ہے یہاں سب کے

۱۔میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۱۱۷

۲۔میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۱۱۷۔لسان المیزان جلد ۳ ص ۱۴۵

۳۔میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵۔لسان المیزان جلد ۳ ص ۱۴۵۔میزان الاعتدال جلد اول ص ۴۳۸۔

بیانات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔(۱)

محقق معاصر علامہ مرتضیٰ عسکری رضوان اللہ تعالیٰ نے کتاب عبداللہ بن سبا لکھ کر اس تاریخی افسانے کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے اور انہوں نے دلائل قاہرہ سے ثابت کیا ہے کہ عبداللہ بن سباء کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا۔ یہ سیف بن عمر جیسے کذاب لوگوں کی تراشی ہوئی داستان ہے۔(۲)

صبحی صالح اپنی کتاب ''نظریۃ الامامۃ'' میں لکھتے ہیں:

یہ بات بعید نہیں ہے کہ ایک یہودی فتنہ انگیزی کرے۔ لیکن یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں ہے کہ ایک یہودی مسلمانوں کے عقائد پر اتنا اثر ڈال دے کہ انہیں سنی اور شیعہ دو گروہوں میں تقسیم کردے۔(۳)

شیعی کتب رجال میں مذکور ہے کہ عبداللہ بن سباء نے غلو کا اظہار کیا تھا اور امیر المومنینؑ نے اسے غلو کی وجہ سے سزا دی تھی۔(۴)

واضح رہے کہ ایسے شخص کے وجود کا اعتراف اور چیز ہے اور پورے جہانِ اسلام کو متزلزل کرنے والے عبداللہ بن سبا کے وجود کا اعتراف ایک الگ چیز ہے۔

۱۔ مزید تفصیل کے لیے ڈاکٹر طہٰ حسین کی کتاب الفتنۃ الکبریٰ ص ۱۳۴ اور اصل الشیعہ ص ۷۳ اور الغدیر جلد ۹ ص ۲۲۰۔۲۲۱ کا مطالعہ فرمائیں۔

ڈاکٹر طہٰ حسین کی اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے جس کو دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلی جلد کا نام ''حضرت عثمان تاریخ و سیاست کی روشنی میں'' اور دوسری جلد کا نام ''حضرت علیؑ تاریخ و سیاست کی روشنی میں'' ہے اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کرایا ہے۔

۲۔ علامہ مرتضیٰ عسکری کی کتاب عبداللہ بن سبا کا اردو زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے، ہم قارئین سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔

۳۔ نظریۃ الامامۃ ص ۳۷۔

۴۔ رجال کشی ص ۹۸۔ شمارہ ۴۸۔

۳۔ تشیع جنگ جمل کی پیداوار ہے۔

جرمن مستشرق ''ولھاوزن'' نے ''الشیعہ والخوارج'' نامی کتاب میں کہا ہے کہ شیعہ جنگ جمل کے ساختہ پرداختہ ہیں۔

موصوف نے لکھا ہے کہ قتل عثمان کی وجہ سے مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک حزبِ علیؑ اور دوسرا حزبِ معاویہ تھا۔ شیعہ علیؑ، شیعہ معاویہ کے مقابلہ پر آئے اور جب معاویہ نے حکومت پر تسلط حاصل کیا تو اس کے بعد لفظ شیعہ علیؑ کے پیروکاروں کے لئے مخصوص ہو گیا۔ (۱)

جواب: (موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے)۔ جنگ جمل سے تشیع کا آغاز نہیں ہوا تھا بلکہ جنگ جمل میں شیعوں کی عسکری اور سیاسی قوت کا ظہور ہوا تھا۔

امیر المومنینؑ خلفائے ثلاثہ کے عہد حکومت میں بر بنائے مصلحت خاموش رہے تھے لیکن اس دوران آپؑ نے ہمیشہ خلفاء کی رہنمائی اور مدد کی تھی۔ حالانکہ آپ اپنے مقام و منزلت سے آگاہ تھے اور خلافت کے لئے اپنی نامزدگی پر یقین رکھتے تھے لیکن اس وقت کے حالات کسی مخالفت کی اجازت نہیں دیتے تھے اور آپ نے اسلام کی بہتری خاموشی ہی میں دیکھی اسی وجہ سے آپؑ اور آپ کے شیعوں کی قوت میدان عمل میں نہ آئی تھی۔ لیکن قتل عثمان کے بعد مدینہ میں موجود صحابہ نے حضرت علیؑ کو خلیفہ منتخب کیا اور لوگوں کی پشت پناہی کی وجہ سے آپ پر حجت تمام ہو گئی۔ طلحہ و زبیر جیسے لوگ معاویہ کے فریب میں پھنس گئے اور بنی امیہ کی مالی امداد کو دیکھ کر انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔

یہ دونوں 'سادہ لوح' افراد خلافت کی امید میں بصرہ چلے گئے اور انہوں نے حضرتؑ کے گورنر کو مار پیٹ کر بصرہ سے نکال دیا اور وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔

حضرت علیؑ نے دیکھا کہ اگر وہ خاموش رہتے ہیں تو اسلامی مملکت میں ہرج و مرج پیدا

۱۔ الخوارج والشیعہ ص ۱۴۶

ہو جائے گا۔ لہٰذا باغیوں کو دھکیلنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں ہے۔ ان حالات میں رسول اللہؐ کے صحابہ بھی حضرت علیؑ کے ہمنوا تھے۔ اس وقت تشیع کو خلافت بلافصل کے معنی میں ظاہر کرنے کا موقع نہیں تھا بلکہ مقصود اسلامی نظام کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ اس وقت تشیع اور شیعہ کے نام سے مکتب فکر پیدا کرنا مقصود تھا۔ خوش قسمتی سے (جنگِ جمل کا) یہ فتنہ ایک دن سے بھی کم تر وقت میں ختم ہو گیا تھا۔

۴۔ تشیع اہل ایران کے ذہن رسا کی پیداوار ہے۔

تمام مفروضوں میں سے سب سے زیادہ کمزور مفروضہ جس کا کبھی کبھی اظہار بھی کیا جاتا ہے وہ یہ ہے: اہل ایران قوم پرست تھے اور وہ اسلام کی توسیع اور عربوں کی حکومت کو ناپسند کرتے تھے: اسی لئے انہوں نے عقیدہ تشیع کا اختراع کیا اور حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کی پیروی کے نام پر ایک مذہب قائم کیا تا کہ عربوں کے تسلط سے نجات مل سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مفروضہ کو تراشنے والا شخص ایران میں تاریخ تشیع سے قطعاً نابلد تھا۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں تشیع کی تخم ریزی ہوئی تھی۔ تشیع کا بیج مدینہ میں ہی کاشت کیا گیا تھا اور مدینہ میں ہی اس کی نشونما ہوئی تھی پھر امیر المومنین کے دورِ حکومت میں تشیع کو عراق میں فروغ حاصل ہوا اور جب تشیع کا نظریہ عراق میں پھل پھول رہا تھا تو اس وقت ایران میں کہیں شیعیت کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

پھر جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تو کئی صدیوں تک ایران پر بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت قائم رہی اور ان ادوار میں اہل ایران کی اکثریت اہل تسنن پر مشتمل تھی۔ البتہ کسی کسی جگہ شیعہ بھی دکھائی دیتے تھے۔

ایران میں تشیع کے فروغ کے کچھ علل و اسباب ہیں۔ ایران کا تشیع دس صدیوں کے عوامل کا نتیجہ ہے۔ یہاں ہم ایران میں تشیع کے فروغ کے اسباب کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں:

الف: اہل ایران، عراق میں ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔

جب عربوں نے اہل ایران کے خلاف جنگ قادسیہ لڑی تو اس وقت ایرانی لشکر سے چار ہزار ایرانی سپاہیوں نے ایرانی فوج کو چھوڑ کر عرب فوج کے ساتھ شمولیت اختیار کی تھی اور انہوں نے دل کی گہرائیوں سے ایمان قبول کیا تھا۔

ایرانی سپاہیوں نے عربوں سے یہ میثاق لیا تھا کہ جنگ کے اختتام کے بعد انہیں آزادی ہوگی وہ جہاں چاہیں جا سکیں گے اور انہیں یہ بھی آزادی ہوگی کہ جس قبیلہ سے چاہیں گے اس کے حلیف بن سکیں گے اور انہیں بھی باقی مسلمانوں کی طرح سے مالِ غنیمت میں حصہ دیا جائے گا۔

لیکن افسوس ہے کہ جب جنگ ختم ہوئی تو ایرانی فوجیوں کے ساتھ ہونے والے وعدوں کو پیروں کے نیچے ڈال دیا گیا اور افسوس ہے کہ ان کی تحقیر کا آغاز کر دیا گیا اور آج کی اصطلاح کے مطابق انہیں دوسرے درجہ کے شہری کا درجہ دیا گیا اور انہیں لفظ ''موالی'' کے نام سے یاد کیا گیا اور انہیں پست ترین اور کم آمدنی والے کاموں پر لگا دیا گیا (۱)

عربوں کے تعصب کی انتہا یہ تھی کہ حضرت عمر طواف میں مصروف تھے انہوں نے دو افراد کو فارسی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے سنا تو انہوں نے کہا کہ عربی بولا کرو کیونکہ فارسی بولنے سے انسان کی جواں مردی ختم ہو جاتی ہے (۲)

پھر جب امیر المومنینؑ برسر اقتدار آئے تو آپؑ نے ہر ایک سے یکساں برتاؤ کیا جب قوم پرست عربوں نے آپؑ پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کی کتاب میں نسل اسماعیل اور دوسری نسل کے لوگوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ (۳) یہ عدالت علیؑ اور اولادِ علیؑ کے لئے

۱۔ العقد الفرید جلد ۳ ص ۴۱۳

۲۔ اقتضاء الصراط المستقیم۔ ابن تیمیہ ص ۲۵

۳۔ ابن ہلال ثقفی، الغارات: ۴۶

مایۂ امتیاز تھی بنسبت اس کے کہ امویوں کے دور میں موالیان کی تحقیر عروج پر تھی تاریخ نے اس تمام تحقیر اور ناانصافی کو محفوظ کیا ہوا ہے۔

ب۔ یمنی اشعریوں کی ہجرتِ قم

سعد بن مالک کے دو بیٹے تھے ایک کا نام عبداللہ تھا اور دوسرے کا نام احوص تھا یہ دونوں یمن میں رہتے تھے اور علیؑ کے شیعہ تھے۔ یہ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔ پھر جب سنہ ۱۲۱ ھ میں امام زین العابدین کے فرزند زید نے بنی امیہ کے خلاف قیام کیا تو حضرت زید کی فوج کے علم بردار احوص تھے۔ حضرت زید شہید ہو گئے آپ کی فوج مغلوب ہو گئی۔ اس معرکہ میں احوص گرفتار ہوئے اور کئی سالوں تک زندان میں رہے آخر کار انہیں زندان سے رہائی نصیب ہوئی تو انہوں نے اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں عراق چھوڑ کر قم چلے جانا چاہیے۔

چنانچہ وہ اپنے خاندان کے افراد کو لے کر قم آئے۔ اس وقت قم ایران میں تشیع کے مرکز کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔ ان کی آمد کے بعد قبیلۂ اشعری سے تعلق رکھنے والے افراد آہستہ آہستہ قم آ گئے جہاں ایک شیعی مرکزِ علم و حدیث تشکیل پا رہا تھا۔ مزید توضیح کے لئے تاریخ قم کا مطالعہ فرمائیں (۱)

امویانِ عراق کے ستم سے صرف اشعری ہی قم نہیں آئے بلکہ احمد بن محمد بن خالد کا تیسرا پوتا بھی زید شہید کے انقلاب کے بعد قم "برق رود" میں آیا اور یہاں آ کر سکونت اختیار کی۔ (۲)

ج۔ امام علیؑ رضاؑ کی خراسان آمد

امام علی رضاؑ کی ہجرت بھی ایران میں تشیع کے فروغ کا ایک سبب تھی۔ نیشاپور کے محدثین کا آپؑ کا باشکوہ استقبال اور حدیث سننے کی خواہش، خراسان کے لوگوں کے دلوں میں اہل

۱۔ حسن بن محمد بن حسن قمی، تاریخ قم، تحقیق سید جلال الدین تہرانی ص ۲۴۷ رجال نجاشی، شمارہ ۱۹۶

۲۔ رجال نجاشی: ج ا شمارہ ۱۱۰۔

بیتؑ کی عظمت کی دلیل ہے۔ جس پر آپؑ نے اپنے آبائے طاہرین کی سند پر مشتمل یہ حدیث بیان کی کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے:

"کَلِمَۃُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حِصۡنِی فَمَنۡ دَخَلَ حِصۡنِی اٰمِنَ مِنۡ عَذَابِی"

''لا الہ الا اللہ کی گواہی میرا مضبوط قلعہ ہے جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا''۔

پھر چند لحات بعد آپؑ نے کجاوہ سے سر نکال کر فرمایا: "بِشُرُوطِهَا وَ اَنَا مِنۡ شُرُوطِهَا" اکیلا لا الہ الا اللہ کہنا کافی نہیں ہے اس کی بھی کچھ شرائط ہیں اور میری امامت پر اعتقاد رکھنا بھی اس کی شرائط میں سے ہے۔(۱)

اس حدیث کے ذریعے سے ایک ایسے انسان نے تشیع کی تبلیغ کی تھی جو کہ علوم اہل بیت کا وارث تھا اور جس نے پیغمبر اکرمؐ کے فرمان کو ایک صاف ستھرے اور ہر آلودگی سے پاک چشمہ سے نقل کیا تھا۔

جب آپ طوس تشریف لائے اور آپؑ نے مامون الرشید کے دربار میں یہود و نصاریٰ اور محدثین اہل سنت کے علاوہ نیچریوں اور مادہ پرستوں سے مناظرے کیے تو ان مناظروں سے ان افراد پر آپؑ کی علمی فوقیت کا اظہار ہوا(۲) جس کی وجہ سے اہل خراسان کے دلوں میں محبتِ اہل بیتؑ نے گھر کر لیا اور یوں خراسان کے علاقے میں تشیع کے نظریات کو فروغ نصیب ہوا۔ کتاب احتجاج (طبرسی) اور زندگانی امام رضا علیہ السلام اس بارے میں زیادہ تفصیلات پیش کرتی ہیں۔

عوام الناس کو مائل دیکھ کر مامون ڈرا اور ایک مخصوص سازش سے آپؑ کو زہر دیدیا پھر

۱۔ صدوق، عیون اخبار الرضا جلد ۲ ص ۱۴۸

۲۔ عیون اخبار الرضاؑ، صدوق، جلد ۲ ص ۱۳۹ ۔ ۱۵۸

آپ کے سوگ میں مگر مچھ کے آنسو بہائے (۱)

۷۔علویوں کی ایران آمد

امام رضاؑ کی ہجرت اور ولی عہدی قبول کرنے کے بعد بہت سے علویوں نے حجاز و عراق سے ایران ہجرت کی اہالیانِ ایران اولاد پیغمبرؐ سمجھ کر ان کا احترام کرتے تھے۔

چنانچہ حسین بن علی شہید فخ کے قیام وشہادت کے بعد عبداللہ بن حسن بن حسن اہل کوفہ کے ایک گروہ کو لے کر دیلم آئے۔ان کی آمد یہاں تشیع کے فروغ کا سبب ہوئی اس کے علاوہ دیلم، طبرستان اور موجودہ مازندران کے کچھ علاقوں پر ایک لمبے عرصے تک علویوں کا تسلط قائم رہا اور وہاں غالباً زیدی تشیع حکم فرما رہا تھا۔

ایران کے جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو پورے ایران میں ہمیں امام زادگان دکھائی دیتے ہیں جن کی اکثریت ائمہ اہل بیتؑ کی اولاد ہے۔ جو ایران میں پھیل گئے تھے۔

اور انہوں نے اپنے اعمال و اقوال سے تشیع کی تبلیغ کی تھی۔ چنانچہ طبرستان میں ۶۷ رے میں ۶۶ اور قم میں ۲۳ امام زادوں کے مزارات ہیں۔سادات کے یہ بکھرے ہوئے مقابر زبانِ حال سے تشیع کے ایران میں پھیلانے کی داستان بیان کر رہے ہیں (۲)۔ایران میں تشیع کی نشوونما بغداد کی عباسی خلافت کی قوت وضعف سے مربوط رہی۔ چوتھی صدی میں حکومت بغداد ہر لحاظ سے کمزور ہو چکی تھی اور ۲۵ ۳ھ میں عباسی خلافت عملی طور پر صرف بغداد تک محدود ہوگئی۔(۳)

چنانچہ خلافت عباسیہ کی اسی کمزوری سے بنی بویہ نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے اپنی حکومت کو شیراز سے بغداد تک وسعت دے ڈالی۔ اور ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک حکومت

۱۔ارشاد، مفید، جلد ۲ ص ۲۶۹

۲۔طبرستان، دیلمان، وگیلان میں مدفون علویوں سے آگاہی حاصل کرنے کے مستشرق، ویلفرد مادلونگ کی کتاب 'اخبار ائمہ الزیدیۃ فی طبرستان ودیلمان، وجیلان'، کا مطالعہ کریں۔علاوہ ازیں 'تاریخ تشیع در ایران' کا مطالعہ بھی مفید ہے۔

۳۔منتظم، ابن جوزی، جلد ۶ ص ۲۸۸۔

کی۔ یہ لوگ مائل بہ تشیع تھے اس لئے ان کو دورِ حکومت میں تشیع کی تبلیغ میں اضافہ اور پھر تدریجی طور پر شیعت کا پودا سیستان و بلوچستان سمیت ایران کے اکثر علاقوں میں پھیل گیا۔

ساتویں صدی ہجری میں منگول بادشاہ ہلاکو خان نے عباسی خلافت کو ختم کر دیا پھر اس کی نسل میں سے سلطان محمد خدا بندہ نے تشیع کا عقیدہ اختیار کیا اور باقی مذاہب کی طرح سے شیعہ مذہب نے بھی قانونی جواز کا درجہ پایا۔ حالانکہ اس وقت ایران میں اکثریت اہل سنت کی تھی لیکن شیعت کا پودا ایران کے بیشتر مقامات میں مشرق سے مغرب تک پھیلنے پھولنے لگا البتہ مذہبِ تشیع کا رواج اور دوسرے مذاہب کا زوال صفویوں کے دور میں دسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔

ایران میں تشیع کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس نظریہ کی بھرپور تردید ہوتی ہے کہ اہل ایران نے سنی عربوں سے انتقام لینے کے لئے تشیع کا عقیدہ اپنایا تھا۔

۲

اقلیت شیعہ و اکثریت تسنن

سوال: اگر مذہب شیعہ حق ہے تو پھر اقلیت میں کیوں ہے اور اکثریت مذہب تسنن کی پیروکار کیوں ہے؟

جواب: اکثریت نہ تو حقانیت کی علامت ہے اور نہ ہی اقلیت باطل ہونے کی نشانی ہے۔ جب ہم انبیائے کرام کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم تک ہمیشہ اہل حق اقلیت میں رہے ہیں۔ قرآن جس وقت انبیاء کی مستقل مزاجی کی جدوجہد کا تذکرہ کرتا ہے تو مسلسل دہراتا ہے کہ ان پر ایمان لانے والے بہت کم ہوتے تھے۔

قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو نوسو پچاس برس تک دین کی تبلیغ کی تھی۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (سورۂ عنکبوت ۱۴)

(وہ ان میں نوسو پچاس برس تک رہے۔) لیکن اس طویل ترین تبلیغ کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ اس کا جواب قرآن مجید نے ان الفاظ میں دیا ہے:

وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ (سورۂ ھود ۴۰)

(تھوڑے سے افراد کے علاوہ اس پر اور کوئی ایمان نہ لایا۔)

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ (سورۂ سباء ۱۳)

(میرے بندوں میں شکرگزار افراد بہت ہی کم ہیں۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اکثریت کی پیروی کرنے سے خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (سورۃ الانعام/۱۱۶)

اگر آپؐ نے روئے زمین پر رہنے والی اکثریت کی اطاعت کی تو وہ آپؐ کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ (سورۂ یوسف/۱۰۳)

(آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں پھر بھی لوگوں کی اکثریت ایمان نہیں لائے گی۔)

اہل باطل کی اکثریت ماضی کا قصۂ پارینہ نہیں ہے۔ آج بھی دنیا میں اہل باطل کی اکثریت ہے۔ آپ دنیا کے ممالک کا جائزہ لیں تو آپ کو مسلمان کم دکھائی دیں گے اور غیر مسلم اکثریت میں دکھائی دیں گے۔ آپ چین کو دیکھیں جس کی اس وقت آبادی ایک ارب تیس کروڑ سے تجاوز ہے اور ہندوستان پر نظر کریں جس کی آبادی ایک ارب ہے۔ ان ممالک میں لوگوں کی اکثریت مادہ پرستوں اور بت پرستوں پر مشتمل ہے۔

اگر ہم مسلمانوں کی آبادی ایک ارب تیس کروڑ شمار کریں تو دنیا کی چھ ارب کی آبادی کے مقابلہ میں مسلمان اقلیت میں دکھائی دیں گے۔

ہم یہاں امیر المومنینؑ کا ایک قولِ زرین پیش کرتے ہیں اس کا پس منظر یہ ہے کہ جنگ جمل کے موقع پر ایک شخص نے حضرت علیؑ سے عرض کیا:

’’آپ طلحہ وزبیر سے جنگ کرنا چاہتے ہیں جب کہ ان دونوں کو پیغمبرؐ کے عظیم صحابہ میں سے شمار کیا جاتا ہے؟‘‘

امامؑ نے جواب میں فرمایا: ’’تجھے مغالطہ ہوا ہے تو نے حق و باطل کا معیار افراد و شخصیات کو قرار دیا ہے یاد رکھو کہ حق و باطل کا معیار شخصیات نہیں ہوتیں حق کو پہچانو اہل حق کو پہچان لو گے اور باطل کو پہچانو اہل باطل خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔‘‘(۱)

یہ درست ہے کہ شیعہ باقی مسلمان آبادی کے مقابلہ میں اقلیت میں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے لئے دنیا میں ایک عظیم جمعیت کو تشکیل دیتے ہیں اور دنیا کے اکثر مما لک میں اثر ونفوذ رکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ مما لک ایران، عراق، آذربائیجان، بحرین اور لبنان میں شیعہ اکثریت میں ہیں ان مما لک کے علاوہ باقی مما لک میں بھی شیعوں کی قابلِ دید آبادی پائی جاتی ہے اور ہر جگہ ان کی مساجد، مدارس اور ادارے موجود ہیں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہم صرف چند مما لک میں رہنے والے شیعوں کے اعداد وشمار کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے یہ اعداد وشمار دائرۃ المعارف مسیحی جہان طبع ۱۹۸۰ / ۱۳۵۹ ش سے جمع کیے ہیں۔ اور آج جب کہ بیس سے زیادہ سال گزر چکے ہیں یقیناً اس دوران شیعہ آبادی میں اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا ان اعداد وشمار کو تازہ ترین اعداد وشمار نہیں سمجھنا چاہیے۔

ہم یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اعداد وشمار صرف شیعہ اثنا عشریہ کے ہیں ان میں زیدیہ اور اسماعیلیہ جیسے فرقے شامل نہیں ہیں۔

۱۔ شہید مطہری، جاذبہ ودافعہ امام علی۔ بحوالہ ’’علی وبنوہ‘‘ ڈاکٹر طہ حسین مصری

مندرجہ ذیل چارٹ ملاحظہ فرمائیں:

ملک کا نام	کل آبادی	مسلمانوں کی تعداد	شیعوں کی تعداد	شیعوں کا تناسب
ایران	۳۸۴۹۲۰۰۰	۳۷۶۹۴۰۰۰	۳۴۰۰۰۰۰۰	۸۸/۳فیصد
عراق	۱۳۱۴۵۰۰۰	۱۲۵۸۹۰۰۰	۷۵۰۰،۰۰۰	۵۷/۱فی صد
بحرین	۲۹۴۰۰۰	۲۷۹۳۱۰	۱۶۰۰۰۰	۵۴/۴فیصد
لبنان	۳۳۶۰۰۰۰	۲۰۰۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰۰	۲۹/۸فیصد
کویت	۱۴۳۹۰۰۰	۱۳۶۸۶۰۰	۲۷۰۰۰۰	۱۸فیصد
پاکستان	۸۲۹۵۲۰۰۰	۸۰۳۲۰۳۵۰	۱۲۰۰۰۰۰۰	۱۴/۵فیصد
افغانستان	۲۲۰۳۸۰۰۰	۲۱۸۸۵۳۵۰	۱۳۰۰۰۰۰	۵/۹فیصد
ترکی	۴۵۳۶۳۰۰۰	۴۵۰۱۸۰۰۰	۱۵۰۰۰۰۰	۲/۳فیصد
سعودی عرب	۱۰۹۰۰۰۰۰	۱۰۷۶۸۰۰۰	۲۵۰۰۰۰۰	۳/۳فیصد
ہندوستان	۵۴۷۱۲۳۰۰۰	۸۰۵۴۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰۰۰	۱/۸فیصد
سابق سویت یونین	۲۶۸۱۱۵۰۰۰	۳۰۲۹۷۰۰۰	۴۰۰۰۰۰۰	۱/۵فیصد
سوریہ (شام)	۸۵۳۶۰۰۰	۷۶۴۵۸۵۰	۵۰۰۰۰	۰/۶۰فیصد
دیگر ایشیائی ممالک			۳۰۰۰۰	
براعظم امریکہ			۲۷۰۰۰۰	
یورپ			۱۰۰۰۰۰	
براعظم افریقہ			۴۰۰۰۰	
آسٹریلیا			۱۰۰۰۰	
کل آبادی	۴۳۷۴۰۰۰۰۰۰	۷۲۳۰۰۰۰۰۰	۷۲۷۵۰۰۰۰	۱/۷فیصد

HASSAN ALI BOOK DEPOT

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ قرنِ اول کی طرح سے آج بھی شیعہ جغرافیائی طور پر دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں (۱)

شیعیت کے متعلق یہ تاریخی جغرافیہ مسلمان ممالک کے اعداد وشمار کو دیکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور مرحوم اسماعیل فاروقی کی مرتب کردہ اطلس تاریخی ادیان کے عین مطابق ہے۔ (۲)

An Atlas introduction to shis Islam Moojan Momen, World population History, Colin of Britannica World Mc Everyday.

The cambridge Atlas of the Middle East and of Data world.

World al-Cultural Atlas of Islam, Ismael Ragi Africa, Faruqi.

Religions, al-Faruqi and David Historial Atlas of the E.north

Islam, Joseph Schacht and Bosworth Legacy of C.E.

The Muhammadan world north Africa Middle East and today

Muslim Minorities in and other eds)) S.M. Zwemer the, The panguin today, M.Ali

Kettani World Dictionary, John R, the Worlds living Religions, Robert Hinnells(ed) Hume.

یہاں اس حقیقت پر بھی توجہ دینی چاہیے کہ شیعہ ہمیشہ اپوزیشن اور حکمرانوں کے نظام کے مخالف کے طور پر جانے جاتے رہے ہیں اور سیاسی نظاموں نے شیعوں کو کچلنے اور تباہ کرنے کے لئے انہیں ''روافض'' کا نام دیا تھا اور ہر دور میں شیعوں کو کچلنے کے اقدامات کیے گئے۔ چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی نے مشرقی خراسان کو فتح کیا تو اس نے شیعوں اور معتزلہ کو سختی سے کچلا تھا۔ اس نے دونوں مذاہب کے پیروکاروں کا قتل عام کیا اور ان کے کتب خانوں اور علمی و تاریخی آثار کو تباہ کیا تا کہ تشیع اور معتزلہ کا کوئی نشان باقی نہ رہے اور اس کے برعکس اس نے اہل حدیث اور

۱۔اٹلس کیمبرج مشرق وسطیٰ وشمال افریقہ ص ۳۹

۲۔متن میں مذکور منابع کے علاوہ عثمان مرغی کی کتاب ''الشیعۃ فی مصر'' ص ۴۷۔۵۹ پر بھی اسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کرامیہ فرقے کو تقویت دی۔ وہ معتزلہ اور شیعوں کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتا تھا۔ (۱)

صلاح الدین ایوبی، نے فاطمیوں سے خیانت کے بعد مصر میں شیعوں کے قتل عام کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے لاتعداد گروہوں کو قتل کیا تھا (۲)

حکومت عثمانی کے عہد میں سلطان سلیم نے نوح نامی ایک حنفی فقیہ کے فتویٰ پر ترکی میں چالیس ہزار شیعوں کے سر قلم کیے گئے۔ (۳)

لبنان میں جزار کی حکومت کے دوران جبل عامل میں خونی حمام وجود میں لائے گئے اور شیعوں کی منظم نسل کشی کی گئی۔ یہاں تک کہ ان کی کتابوں سے کئی عرصہ تک نانبائیوں کے تنور روشن کیے گئے۔ (۴)

اتنی بار قتل عام کے بعد بھی اگر شیعہ ایک مضبوط ثقافت کے ساتھ موجود ہیں اور اسلام اور سائنس کے علوم میں اعلیٰ ترین قابلیت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں تو اسے خدائی معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے اور یہ خدا کی خصوصی عنایت ہے کہ اس نے اسلام حقیقی کے مظہر مذہب کو کسی تحریف کے بغیر پندرہویں صدی ہجری تک پہنچایا ہے اور خوش قسمتی سے روز بروز اس کی روشنی میں اضافہ ہو رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دلوں کو منور کر رہا ہے اور تاریخ کے چہرے سے جہالت اور تعصب کے پردے ہٹا رہا ہے۔

۱۔ خراسان کے ایک شخص عبداللہ بن کرام نے اپنی ریاکاری اور حیلہ وتزویر سے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب کا گرویدہ بنایا تھا۔ سلطان محمود غزنوی بھی اس کے پیروکاروں میں سے تھا جس نے شیعوں اور اہل کلام پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔ (یادداشت ہائے قزوینی، حواشی، جلد ۷ ص ۶۰) بحوالہ لغت نامہ دھخدا

۲۔ اعیان الشیعہ جلد ۳ ص ۳۰۔ مظفر، تاریخ الشیعہ ص ۱۹۲

۳۔ البلاد العربیہ والدولۃ العثمانیہ، حصری۔ ص ۴۰۔ اعیان الشیعہ جلد اول، ص ۳۰۔ ۱۳ وہاں چالیس ہزار کی بجائے ستر ہزار بیان کیا گیا ہے۔ شرف الدین عاملی الفصول المھمۃ ص ۱۴۰، طبع نجف۔

۴۔ دائرۃ المعارف اللبنانیہ، فؤاد البستانی، در شرح حال ابراہیم یحییٰ۔

۳

کیا ابن علقمی اور خواجہ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خان سے سازباز کی تھی؟

سوال: کچھ مورخین لکھتے ہیں کہ آخری عباسی خلیفہ ''مستعصم باللہ'' کی حکومت کو تباہ کرنے میں اس کے شیعہ وزیر مؤید الدین ابن علقمی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور مورخین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سازش میں خواجہ نصیر الدین طوسی بھی شامل تھے۔ چنانچہ وزیر اور خواجہ نصیر کی ملی بھگت سے عباسی خلافت کا خاتمہ ہوا اور بغداد پر ہلاکو خان منگول کی حکومت قائم ہوئی۔ ان واقعات میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے؟

جواب: مذکورہ افراد پر ہلاکو خان کے ساتھ ساز باز کرنے کا الزام سب سے پہلے ابن تیمیہ نے لگایا تھا۔(۱)

اس کے بعد یکے بعد دیگرے سنی مورخین نے اس تہمت کا تکرار شروع کیا۔ حالانکہ شیعہ ہونے کے سوا کوئی چھوٹی سی دلیل اور ثبوت ان کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آیئے اب ہم اس تہمت کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ ابن تیمیہ، مجموعۃ الرسائل، قاہرہ، ۱۹۰۵ء، ص ۹۷

ہم خواجہ سے پہلے ابن علقمی وزیر کے متعلق بیان کرتے ہیں کیونکہ اس پر خواجہ کی بہ نسبت زیادہ الزامات تراشے گئے ہیں۔

اس بحث کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ابن علقمی کا تعارف کرایا جائے تاکہ اس کی صحیح پہچان کے بعد ہم بہتر انداز میں فیصلہ کرسکیں۔

جس کسی نے بھی اس وزیر محمد بن احمد بن علقمی کے بارے میں گفتگو کی ہے اسے علم و فضل، دانش، تدبیر وسیاست سے متصف قرار دیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس بارے میں مشہور مورخ ابن طقطقی کی رائے پر توجہ دی جائے وہ کہتا ہے: ابن علقمی کا تعلق بنی اسد قبیلہ سے تھا۔ اس کے دادا نے نہر علقمہ کھودی تھی۔ اس نے بچپن میں علم وادب حاصل کیا پھر وہ ایک بڑے عہدے پر فائز ہوگیا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا خوش نویس اور انشا پرداز تھا۔ وہ فاضل، عاقل، سخی، فیاض اور متین انسان تھا۔ وہ سیاست کے داؤ پیچ اچھی طرح سے جانتا تھا اور وہ اہل ادب کا قدردان تھا۔ وہ علماء کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی تھی جس میں اس نے اپنی طرف سے دس ہزار کتابوں کا عطیہ دیا تھا۔ علمی شخصیات اپنی کتابوں کا اُس کے نام پر انتساب کرکے اسے ہدیہ کرتے تھے۔ چنانچہ ''صاغانی'' لغوی نے لغت کی مشہور کتاب ''العباب'' کا انتساب اسی کے نام سے کیا تھا۔

وہ لوگوں کی دولت کے لئے اپنے آپ کو قانون کا پابند سمجھتا تھا۔ جب موصل کے حاکم بدرالدین نے اس کے پاس گراں بہا تحائف روانہ کیے تو اس نے وہ تمام تحائف خلیفہ کی خدمت میں پیش کردیئے اور اسے ماجرا سے آگاہ کیا اور کہا کہ مجھے یہ تحائف واپس کرتے ہوئے حیا دامن گیر تھی لہٰذا ان تحائف کو آپ قبول کریں چنانچہ خلیفہ نے وہ تحائف وصول کیے اور والی موصل کو بدلے میں بارہ ہزار دینار بھجوائے۔(۱) تاریخ میں اس کے غیر معمولی علم اور تدبر کی تعریف اور

۱۔ الفخری ص ۳۳۷، ۳۳۹ چاپ دار صادر، بیروت۔

بڑائی میں اسی قسم کی باتیں لکھی گئ ہیں۔اب ہم واپس آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ایسا شخص جو اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے دورِ وزارت میں خلافت کی بقا کے لئے صرف کر رہا ہو وہ یہ اقدام کرے گا کہ خلافت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور خود بھی منگولوں کے سامنے سرنگوں ہو جائے حالانکہ وہ اس وزارت پر چودہ سال متمکن رہا ہو؟

ہم مضبوط دلائل سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں خلافت اسلامی کا سقوط جبر تاریخ کا تقاضا تھا اور سقوط بغداد کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر عائد نہیں کی جاسکتی۔اس وقت نظام خلافت کا ڈھانچہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ وہ کسی دشمن کے مقابلہ کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ دشمن بغداد کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور خلیفہ رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔

ابن کثیر نے جو کہ ابن تیمیہ کا پیروکار ہے، اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

منگول سپاہ نے دار الخلافہ بغداد کا محاصرہ کیا اور وہ مسلسل شہر کی طرف تیر اندازی کرنے میں مصروف تھے۔ان میں سے ایک تیر خلیفہ کی کنیز کو لگا جو اس وقت خلیفہ کے سامنے رقص کرنے میں مصروف تھی۔تیر لگنے سے کنیز کی موت واقع ہوگئی یہ کنیز خلیفہ کو بڑی پیاری تھی۔کنیز کی موت کا خلیفہ کو سخت صدمہ ہوا اور وہ چیخنے چلانے لگا۔(۱)

جس ملک کا سربراہ ایسے سخت ترین حالات میں بھی دشمن سے غافل ہو اور شہر کے دفاع کی بجائے رقص و سرود میں ڈوبا ہوا ہو تو ایسے ملک کو دشمن کی یلغار سے بچانا ناممکن ہوتا ہے۔

ہم نے بھی سقوط خلافتِ عباسی کو اسی لئے جبر تاریخ کا نتیجہ کہا ہے کیونکہ اس کے سقوط

۱۔البدایہ والنہایہ، ابن کثیر جلد ۱۳ ص ۲۰۰ اور بعد کے صفحات۔

کے اسباب خود خلفاء کے اپنے پیدا کردہ تھے۔ (۱)

منگولوں کی آمد اور تسلط سے پہلے کی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ امراء ایک دوسرے سے حکومت چھیننے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور خلیفہ کا کام صرف یہ تھا کہ وہ فاتح فریق کو سند حکومت لکھ کر دیتا تھا۔ امراء کو صرف اپنے اقتدار کی فکر تھی، انہیں بیرونی دشمن کی کوئی پرواہ نہ تھی اور خلیفہ عیش و نوش میں مصروف رہتا تھا۔

۲۔ عیسائیوں کی پس پردہ سازشیں

۴۹۱ھ سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا تھا اور یہ سلسلہ ۶۱۶ھ تک جاری رہا۔ ان جنگوں میں صلیبیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی لئے اکثر صلیبیوں نے یہ علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مشرق کی سرزمین سے شیطان نے ۶۱۶ھ میں اپنا سینگ نکالا اور چنگیز خان اسلامی ممالک کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ (۲)

یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ مغربی صلیب اور مشرقی بُت کے درمیان ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ کیونکہ جیسے ہی صلیبی جنگوں کا اختتام ہوا اسی سال عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملوں کا آغاز ہوا اور اس حملہ کا بہانہ یہ تھا کہ خوارزم شاہ نے چنگیز کے سفیروں کو قتل کیا تھا۔

منگول فوج نے مسلمانوں کے مشرق علاقوں کا رُخ کیا اور جہاں بھی گئے وہاں قتل اور بربادیوں کی داستانیں رقم کیں اور ان کے مقابلے پر بہت ہی کم مقاومت دیکھنے میں آئی۔

عباسی خلافت کی تباہی میں ایک اور عنصر نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ عنصر یہ تھا کہ ہلاکو خان کے مشیروں میں عیسائی اور بدھ مذہب کے پیروکار بھی شامل تھے اور وہ اسے بغداد پر حملہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔

۱۔ علامہ اقبال نے کیا ہی خوب کہا تھا: آ تجھ کو بتاؤں کہ تقدیر امم کیا ہے۔ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر۔ (من المترجم)

۲۔ تاریخ مختصر الدول، ص ۲۰۳

چنانچہ پروفیسر ڈاکٹر صفا لکھتے ہیں:

''جب ہلاکو خان ایران میں آیا تو اس وقت خود اور اس کے بیٹے بدھ مذہب کے پیروکار تھے جب کہ اس کی ماں اور اس کی بیوی دونوں عیسائی مذہب کی پیروکار تھیں اور اس کی فوج میں زیادہ تعداد نائمان، کرائیت اور اویغور جیسی عیسائی اقوام کی تھی۔

اسی لئے فطری طور پر ہلاکو خان نے اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دین عیسوی پر بھی خصوصی توجہ کی تھی۔ چنانچہ بغداد میں رہائش پذیر عیسائیوں نے خلیفہ کے سقوط کے لئے اس سے باقاعدہ معاہدہ کیا تھا۔

ہلاکو خان کی ماں اور اس کی بیوی ''دوقوز خاتون'' کا تعلق کرائیت قوم کے شاہی خاندان سے تھا۔ دوقوز خاتون نے عیسائی کرائیت قوم کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ جملہ عیسائی افراد کو تقویت فراہم کی تھی اور اس کے عہد میں عیسائیوں کی قوت میں اضافہ ہوا تھا۔ ہلاکو خان اپنی بیوی کی وجہ سے اس گروہ پر نوازشات کرتا تھا جس کی وجہ سے پورے ملک میں نئے کلیسا وجود میں آئے اور عسکرگاہ کے دروازے پر کلیسا بنایا گیا جہاں دوقوز خاتون جا کر عبادت کرتی اور ناقوس بجایا کرتی تھی''۔(۱)

جس دور میں منگول فوج نے حملہ کا آغاز کیا تھا تو اس وقت مؤید الدولہ ابن علقمی معصوم بچہ تھا۔ منگول لشکر بجلی کی تیزی سے شرقِ اسلامی اور ماوراء النہر سے گزر کر خراسان آیا پھر خراسان سے رَے (موجودہ تہران) پہنچا۔ پھر اس لشکر نے اصفہان و ہمدان کو تاراج کیا اور موصل جا پہنچا۔

چنانچہ جن عوامل کی وجہ سے دوسرے شہروں میں مسلمانوں کو شکست ہوئی انہی عوامل کی وجہ سے مسلمانوں کو بغداد میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ منگولوں کی جنگوں کا سلسلہ ۶۱۶ھ سے شروع ہوا تھا اور ۶۵۶ھ میں سقوط بغداد پر اس کی انتہا ہوئی۔ مورخین آخر چالیس سالہ جنگ پر نظر

۱۔ تاریخ ادبیات در ایران، ص ۱۱۴۔ جو کچھ گیومہ میں بیان کیا گیا ہے یہ جامع التواریخ کی روایت ہے۔

کیوں نہیں کرتے صرف سقوط بغداد پر ہی ان کی نگاہیں کیوں جاتی ہیں؟

منگولوں کی تاراج کا سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ چنانچہ ابن اثیر نے اپنی کتاب 'الکامل' میں ۶۲۳ھ کے حالات وواقعات کے ضمن میں یہ جملے لکھے ہیں: مصیبت اتنی بڑی ہے کہ زبان اسے بیان کرنے سے اور قلم اسے رقم کرنے سے قاصر ہے اور کوئی بھی مسلمان ان حالات کو نہ تو سن سکتا ہے اور نہ انہیں پڑھ سکتا ہے۔

ابن اثیر نے مزید لکھا:

میں کئی برسوں تک ان واقعات کو نقل کرنے سے احتراز کرتا رہا کیونکہ ان واقعات کی سنگینی کو میں لکھنے سے قاصر تھا۔ اے کاش! میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا یا میں ان واقعات سے پہلے مرگیا ہوتا......۔(۱)

۳۔ ابن علقمی کی خردمندانہ تدبیر اور دوسروں کی مخالفت۔

تاریخ بیان کرتی ہے کہ جب منگول فوج نے ایران پر حملہ کیا تو ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنے آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کے پاس قیمتی تحائف بھیجے۔ عوام الناس کا یہ اقدام مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ ابن تیمیہ کا شاگرد ابن کثیر لکھتا ہے وزیر علقمی نے خلیفہ کو یہ پیش کش کی کہ ہمیں چاہیے کہ ہلاکو خان کی خدمت میں گرانقدر تحائف روانہ کریں تا کہ وہ بغداد پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ لیکن ایک سنی وزیر جو کہ اس کا رقیب تھا اور اس کا نام ''ابن دویدار'' یا ''دواتدار'' تھا، نے خلیفہ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور کہا کہ وزیر یہ چاہتا ہے کہ تحائف بھیج کر اپنے آپ اور اپنے خاندان کو منگول لشکر کے شر سے محفوظ رکھے اور اگر خلیفہ نے کچھ بھیجنا ہی ہے تو انتہائی کمتر درجے کے تحائف روانہ کرے۔

جب ہلاکو کے پاس بے قیمت تحائف پہنچے تو انہیں دیکھ کر ہلاکو خان آگ بگولہ ہو گیا اور

۱۔ الکامل، ابن اثیر جلد ۱۲، ص ۳۵۸-۳۶۱

اس نے بغداد کا محاصرہ کرلیا۔ ادھر خلیفہ کی فوج کی تعداد کم تھی، ان کے حوصلے پست تھے اور تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ (۱)

۴۔ بغداد کی شکست فوجی شکست تھی سیاسی شکست نہیں تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بغداد کی شکست سیاسی نہیں تھی بلکہ فوجی شکست تھی۔ کیونکہ فوج کا سالار ''ابن دویدار'' تھا جو کہ سنی وزیر تھا اور وہ ابن علقمی سے رقابت رکھتا تھا۔ اب اگر بغداد کے دفاع میں کوتاہی ہوئی تو اس کی ذمہ داری فوج کے سالار پر عائد ہوتی ہے نہ کہ سیاسی وزیر پر۔ جب کہ مورخین کہتے ہیں کہ عباسی فوج ناکارہ ہو چکی تھی، اس کی تعداد بھی ناکافی تھی اور ان کے حوصلے پست تھے جب کہ منگول لشکر کے پاس جدید ترین ہتھیار تھے اور مسلسل فتوحات کی وجہ سے ان کے حوصلے بلند تھے۔

اگر ابن علقمی اور ہلاکو خان میں کوئی ساز باز ہوئی ہوتی تو منگول تسلط کے بعد شیعہ یقیناً محفوظ رہتے۔ جب کہ عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ جب منگول فوج نے بغداد فتح کیا تو انہوں نے غیر فوجی لوگوں پر حملہ کیا، شہر کو آگ لگا دی اور جو بھی سامنے آیا اسے بے دریغ قتل کیا۔ اتنی خونریزی ہوئی کہ مکانوں کے پرنالوں سے انسانی خون بہنے لگا۔ اس یلغار میں صرف یہودی اور عیسائی ہی محفوظ رہے تھے۔ (۲)

سقوط بغداد کے علل و اسباب پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہم ان ہی معروضات پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ کچھ محقق مورخین نے اس واقعہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور انہوں نے دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ سقوط بغداد میں ابن علقمی اور محقق خواجہ نصیر الدین کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ شائقین کو ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۱۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، در حوادث ۶۵۶ھ

۲۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۰۰۔ ۲۱۳

مرحوم سید محسن امین جبل عاملی نے اعیان الشیعہ میں اس واقعہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور وہ بحث میں سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔ (۱)

خواجہ نصیر الدین پر تہمت کی حقیقت

مخالفین شیعہ، شیعوں کو بدنام کرنے کے لئے وزیر مؤید الدین ابن علقمی کے علاوہ خواجہ نصیر الدین طوسی (۵۹۷ تا ۶۷۲) پر بھی کہ دنیا جن کی دانش کے آگے سرنگوں ہے، یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے منگولوں کی حمایت کی تھی۔ چنانچہ سادہ لوح افراد اور خاص طور پر متعصب افراد نے اس افواہ کو آگے بڑھایا۔

خواجہ نصیر الدین ۵۹۷ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپنا طوس ہی میں گزرا۔ پھر تکمیل علم کے لئے انہوں نے نیشاپور ہجرت کی۔ نیشاپور کے باکمال اہل علم سے کسب فیض کرنے کے بعد انہوں نے کسب دانش کے لئے مختلف شہروں میں جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ علمی شخصیات سے ملاقات کی اور اس غرض سے انہوں نے کچھ عرصہ رے (موجودہ تہران) میں بسر کیا۔ پھر انہوں نے قم اور اصفہان کے فاضل افراد سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد وہ عراق چلے گئے اور انہوں نے معزالدین سالم بدران مصری سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ''اجازہ'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ (۲)

آپ عراق ہی میں تھے جب ۶۱۶ھ میں منگولوں نے خراسان کی طرف سے اپنے حملوں کا آغاز کیا انہوں نے مشرق اسلامی میں ایسی تباہی پھیلائی جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اس دوران خواجہ نے اپنے وطن واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نیشاپور سے طوس آئے اور اپنے گھر

۱۔ اعیان الشیعہ جلد ۹، ص ۸۲۔۱۰۱

۲۔ کتاب غنیۃ النزوع جلد اول کے مقدمہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اجازہ کا متن اس میں مذکور ہے۔ یہ کتاب مؤسسہ امام صادق کے توسط سے شائع ہوئی ہے۔

گئے لیکن آپ کے گھر کے دروازے بند تھے۔ وہاں ایک بوڑھے شخص نے آپ کو بتایا کہ آپ کا خاندان اس شہر کو چھوڑ کر ''قائن'' میں منتقل ہو گیا ہے۔ آپ وہاں سے ''قائن'' آئے وہاں اپنا مقام منوایا پھر ۶۲۸ھ میں سلسلۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔

ابھی آپ کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ''قہستان'' (۱) کے والی ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور نے آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ آپ نے قلعہ قہستان میں بیٹھ کر ''ابن مسکویہ'' کی کتاب 'طہارۃ الاعراق' کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ لیکن کیونکہ اہل قلعہ اور ان کے سردار ناصر الدین اسمٰعیلی مذہب رکھتے تھے تو خواجہ نے ارادہ کیا کہ خلیفہ عباسی کے شیعہ وزیر علقمی کی مدد سے عراق پہنچیں اور وہیں زندگی گزاریں۔

چنانچہ آپ نے ابن علقمی کو اس مضمون کا ایک خط تحریر کیا۔ افسوس ہے کہ وہ خط ناصر الدین کے ہاتھ لگ گیا اس وجہ سے اسماعیلیوں نے خواجہ کو گرفتار کر کے قزوین کے مضبوط ترین قلعہ ''الموت'' میں نظر بند کر دیا۔ یہ اسماعیلیوں کا مضبوط ترین قلعہ تھا۔ اس قلعہ میں آپ تقریباً ۲۶ سال ایک محترم قیدی کے طور پر رہے۔

البتہ ایام نظر بندی میں اسماعیلیوں کے کتب خانوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ نے اپنی کتاب ''شرح اشارات'' کے آخر میں اپنی بے کسی کو اس شعر سے ظاہر کیا ہے:

به گردا گرد خود چندان که بینم
بلا انگشتری ومن نگینم (۲)

جب اپنے اردگرد نگاہ کرتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آزمائش انگوٹھی ہو اور میں نگینہ ہوں۔

۶۵۴ھ میں منگول افواج نے قلعہ الموت پر قبضہ کیا اور اسماعیلی حاکم قتل ہوا تو خواجہ کو نظر بندی سے آزادی ملی۔ ہلاکو خان خواجہ کے علمی مقام اور علم فلکیات و نجوم میں ان کے تبحرِ علمی

۱۔ جنوب خراسان جس میں قائن، فردوس، طبس اور بجستان کے علاقے شامل ہیں۔

۲۔ شرح اشارات: ج ۳ ص ۴۱۲

سے واقف تھا چنانچہ اس نے خواجہ اپنے ساتھ سفر کرنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک ۶۵٦ ھ میں سقوط بغداد کا واقعہ پیش آیا اور وہ کچھ ہوا جو کہ نہ ہونا چاہیے تھا۔

اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے خلفائے عباسی کی بے تدبیری و نااہلی ہی سقوط بغداد کا باعث بنی تھی۔

وہ جنگ جو چالیس سال قبل خراسان سے شروع ہو رہی تھی اور آہستہ آہستہ پورے عالمِ اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، اس پورے عرصہ میں عباسی خلیفہ چین کی بانسری بجاتا رہا۔ اس نے منگولِ لشکر سے نمٹنے کی کوئی تدبیر تک نہ کی تھی۔ گویا وہ کہتا تھا کہ ہمارے لئے تو بغداد ہی کافی ہے۔

مستعصم آخری عباسی خلیفہ تھا اور یہ خون ریزی اور لہو ولعب کا رسیا تھا۔ اس نے اپنے دورِ خلافت میں ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا ایک بھی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے بیٹے ''ابوبکر'' نے شیعانِ بغداد کا قتل عام کیا تھا اور ان کے اموال کو غارت کیا تھا۔ چنانچہ محدّث قمی رقم طراز ہیں:

''جب آخری عباسی خلیفہ مستعصم خلیفہ بنا تو اس نے مملکت کے امور اپنے وزیر مؤید الدین ابن علقمی کے سپرد کر دیئے اور خود کبوتر بازی، لہو ولعب اور لذت اندوزی میں مشغول ہو گیا۔ اسی کے دورِ خلافت میں اس کے بیٹے ''ابوبکر'' نے بغداد کے محلہ ''کرخ'' کو تباہ و برباد کیا تھا جو شیعوں کا مسکن تھا اور بہت سے سادات کو قیدی بنایا تھا''۔ (۱)

ایک وقت ہلاکو خان نے ہمدان سے عباسی خلیفہ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ ''ایلخانی'' حکومت سے معافی مانگ لے اور ان سے تعلقات قائم کرے تو پھر ممکن ہے کہ میں بغداد کا رُخ نہ کروں خلیفہ نے ہلاکو کے مطالبے کو درخور اِعتنا نہ سمجھا الٹا اسے دھمکیاں دیں اور گستاخیاں کیں، جب وہ خوابِ خرگوش سے بیدار ہوا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ مورخین بیان کرتے

۱۔ المنتہی، ص ۳۷۳، محدث قمی

ہیں کہ جب ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا اور خلیفہ کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت ہلاکو نے خلیفہ سے خفیہ خزانہ طلب کیا۔ جب خزانہ اس کے سامنے پیش کیا گیا تو ہلاکو خان نے اس کی بے تحاشا دولت کو دیکھ کر کہا کہ جب تیرے پاس اتنا مال موجود تھا تو تو نے اپنی ملت کو بچانے کی فکر کیوں نہ کی اور تو نے اس سے ہتھیار کیوں نہ خریدے؟ اگر تو نے اس سے ہتھیار خریدے ہوتے تو آج ہم دریائے جیحون عبور کرنے کی جسارت ہی نہ کرتے۔ اب تک مسلمانوں کو ہم نے بے دریغ قتل کیا ہے تو نے آخر ان کی مدد کیوں نہ کی؟ (۱)

خواجہ کی علمی خدمات

خواجہ اسلام کی عسکری قوت سے مایوس ہو چکے تھے لیکن وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ وہ دنیائے اسلام کی علمی خدمت سر انجام دے سکتے ہیں۔

ہلاکو خان کو خواجہ پر اعتماد تھا چنانچہ اس نے خواجہ کی دو درخواستوں کو قبول کیا:

۱۔ خواجہ نے پہلی درخواست یہ کی تھی کہ بغداد میں علوم فلسفہ، نجوم، طب فقہ اور حدیث کی تعلیم کے لئے مدارس کھولنے کی اجازت دی جائے جن کے اخراجات اوقاف اسلامی سے ادا کیے جائیں۔

۲۔ خواجہ نے دوسری درخواست یہ کی تھی کہ وہ انہیں ''مراغہ'' میں ایک عظیم رصدگاہ بنانے اور اس رصدگاہ میں علماء و محققین کو کام کرنے کی اجازت دے۔

(جب رصدگاہ قائم ہو گئی) تب اہل علم نے جو کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے تھے اس شہر کا رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے علم و دانش کے چراغ جلنے لگے۔ خواجہ نے اس شہر میں ایک کتب خانہ قائم کیا جس میں چار لاکھ کتابیں جمع کیں۔ اہل علم کو مراغہ لانے کے لئے خواجہ نے فخر الدین مراغی کو ذمہ داری سونپی کہ وہ اطراف و اکناف میں جا کر اہل علم کو مراغہ آنے کی دعوت دے۔ چنانچہ مصری پروفیسر عبدالمتعال صعیدی کے بقول منگول لشکر نے جو کچھ پامال کیا تھا خواجہ

۱۔ خواجہ نصیر آسمان ہنر و آفتاب زمین۔ ص ۲۰۳ بحوالہ جہانگشای جوینی ذیل خواجہ نصیر جلد ۳ ص ۲۸۰۔

اسے ازسرِ نو زندہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے علاوہ خواجہ نے اہم کام یہ انجام دیا کہ اپنی دانائی سے منگول حکمرانوں کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ ہلاکو خان کی موت کے بعد جب اس کا پہلا بیٹا برسراقتدار آیا تو ہلاکو کے دوسرے بیٹے نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے منگول امراء اور سپاہیوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ (۱)

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔ اعیان الشیعہ، حصہ مستدرک جلد اول ص ۱۹۷۔ ۲۰۶

خواجہ کی بے گناہی کے ثبوت کے لئے حسب ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں:

۱۔ جامع التواریخ رشیدی۔ جہاں گشای جوینی۔ ۳۔ خواجہ نصیر الدین طوسی آسمان ہنر و آفتاب زمین۔ ۴۔ خواجہ نصیر یا در وحی و عقل۔ ۵۔ تاریخ ادبیاتِ ایران ڈاکٹر صفا۔

فصل دوم

عقائدِ شیعہ

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔روزآخرت خدا کا دیدار

۲۔رجعت کا عقیدہ

۳۔قضاوقدر

۴۔بداا ور انسانی سرنوشت

۵۔انبیاء واولیااورغیبی قوتیں

مقدمہ

عقیدہ و شریعت

''عقیدہ'' اور ''شریعت'' ایسے دو الفاظ ہیں جو علمائے اسلام کے درمیان رائج ہیں۔

لفظ عقیدہ کا اطلاق ان اصول پر کیا جاتا ہے جو ایمان لانے کے لئے ضروری شمار کیے جاتے ہیں اور اس میں کوئی عملی پہلو نہیں ہوتا۔ البتہ ان اصول پر ایمان و اعتقاد انسانی کردار پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

توحید سے لے کر معاد کی آخری جزئیات تک کا تعلق عقیدہ سے ہے اور عقیدہ کے اثبات کے لئے قرآن مجید اور احادیث متواترہ اور براہین عقلیہ کی ضرورت ہے۔

لفظ ''شریعت'' کا اطلاق احکام کے اس سلسلے پر کیا جاتا ہے جن کی تشریع کا ہدف ان پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ اور احکام کے لئے یقین کا حصول خواہ ممکن ہو یا نہ ہو پھر بھی ہمیں حجت شرعی پر عمل کرنا پڑتا ہے اگرچہ اس کی صحت کا ہمیں یقین نہ ہو۔

ہم یہاں اپنے محترم قارئین کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہب شیعہ میں عقائد کے لئے خبر واحد اور دیگر ظنی دلائل کو ناکافی شمار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شیعہ کتاب میں کوئی روایت دکھائی دے تو اسے مؤلف یا شیعوں کا عقیدہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عقیدہ و ایمان کے لئے خبر واحد ناکافی ہوتی ہے۔ خبر واحد بعض اوقات مفید ظن بھی نہیں ہوتی تو اسے مفید یقین کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

ہماری اس وضاحت سے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو سکتی ہے کہ شیعہ امامیہ پر زیادہ تر اعتراضات اسی لئے وارد کیے جاتے ہیں کہ لوگ ہمارے اس قاعدہ سے بے خبر ہیں۔

چنانچہ لوگ کسی شیعہ کتاب میں کوئی روایت دیکھتے ہیں تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ حدیث عقائد شیعہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ شیعہ امامیہ اس موضوع پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

ایک اور نکتہ جس کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شیعہ امامیہ قران کریم کے علاوہ کسی بھی کتاب کو من حیث المجموع صحیح کا درجہ نہیں دیتے۔ قران ہی واحد کتاب ہے جس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ قران کے علاوہ باقی جتنی بھی کتابیں ہیں ان میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط روایات بھی ہیں۔ لہٰذا محققین کو چاہیے کہ وہ کسی کتاب کی روایت کو خواہ وہ الکافی ہی میں کیوں نہ ہو، آنکھیں بند کر کے صحیح روایت تسلیم نہ کریں۔

الکافی اگرچہ مذہب شیعہ کی عظیم اور اہم کتاب ہے پھر بھی اس میں ضعیف روایات موجود ہیں۔

معروف شیعہ حدیث شناس علامہ مجلسی (۱۰۳۷ - ۱۱۱۰ھ) نے مرآۃ العقول میں اصول کافی اور فروع کافی کی تمام روایات پر تحقیق کی ہے اور صحیح اور غیر صحیح روایات کو جدا کیا ہے۔

اس فصل میں ہم کچھ ایسے اصول اعتقادی کی وضاحت کریں گے جن پر مخالفین نے ابہام کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ اور اس ذریعہ سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ حقیقت کے رخ روشن سے پردے ہٹائے جائیں اور حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

۱

روزِ آخرت خدا کا دیدار

سوال: شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ آخرت کے دن ان حسّی آنکھوں سے اسے دیکھا جا سکے۔ جب کہ یہ عقیدہ قرآن کریم کی آیت اور حدیث صحیح کے خلاف ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

جواب: رؤیت الٰہی کے متعلق مسلمانوں میں دو طرح کے عقیدے پائے جاتے ہیں۔

۱۔ گروہ ''عدلیہ'' کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ظاہری آنکھوں سے نہ تو اس جہاں میں دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی آخرت میں دکھائی دے گا وہ اس سے کہیں بلند و بالا ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک کر سکیں۔

واضح رہے کہ خدا کے غیر مرئی ہونے کا عقیدہ صرف شیعوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جب کہ معتزلہ کی طرح سے غیر شیعہ افراد بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اس گروہ کے پیشوا اہل بیتؑ رسولؐ اور بالخصوص حضرت علیؑ ہیں۔ آپؑ نے اپنے خطبات میں خدا کے مرئی ہونے اور اس کے لوازم جسمانی سے تنزیہ بیان کی ہے۔

۲۔ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس جہاں میں خدا کے دیدار کو ناممکن کہتے ہیں اور آخرت میں اسے جائز سمجھتے ہیں اس عقیدہ کے حامل اہل حدیث اور اشاعرہ ہیں۔ اس عقیدہ کی بنیاد قرآن کریم کی ایک آیت کا غلط نتیجہ اخذ کرنے پر ہے اور اس کے علاوہ اس عقیدہ کی بنیاد خبر واحد

پر ہے۔

اس مسئلہ کا تعلق عقیدہ سے ہے اور عقیدہ میں انسان کسی غیر معصوم کا مقلد نہیں ہو سکتا اس لئے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ دلیل و برہان کے ساتھ عقیدہ قائم کرے۔ رؤیت خداوندی کی دو طرح سے تفسیر کی جاتی ہے:

۱۔ رؤیت قلبی و شہود باطنی

رؤیت قلبی ایمان کامل کے سائے میں نصیب ہوتی ہے۔ رؤیت کی یہ قسم ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس طرح کی رؤیت اولیائے الٰہی کو نصیب ہوتی ہے اور اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ ''ذعلب یمانی'' امیر المومنینؑ کے ایک صحابی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت علیؑ سے عرض کیا کہ آیا آپؑ نے اپنے خدا کو دیکھا ہے؟ امامؑ نے جواب دیا کہ میں دیکھے بغیر رب کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں؟ اس وقت اس نے عرض کیا کہ آپؑ نے اسے کیسے دیکھا؟

امامؑ نے جواب دیا:

"لَاتُدْرِکُهُ الْعُیُونُ بِمُشَاهَدَةِ الْعَیَانِ وَلٰکِنْ تُدْرِکُهُ الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْإِیمَانِ" (۱)

ظاہری آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن دل حقائق ایمان سے اسے پا لیتے ہیں۔

۲۔ مادی آنکھوں سے دیدارِ خداوندی

مادی آنکھوں سے خدا کا دیدار ناممکن ہے اور اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ رؤیت حسی کے کچھ شرائط ہیں اور جب تک یہ شرائط موجود نہ ہوں اس وقت تک دیکھنے کا عمل

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۹

مکمل نہیں ہوسکتا اور رؤیت کے شرائط یہ ہیں:

۱۔ حسِ بینائی سالم ہونی چاہیے۔

۲۔ دیکھنے والے اور جسے دیکھا جا رہا ہے ان کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے۔

۳۔ جسے دیکھا جا رہا ہے وہ بہت دور نہ ہو اور بہت نزدیک بھی نہ ہو۔

۴۔ دیکھنے والے اور جسے دیکھا جا رہا ہے، ان کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

۵۔ جسے دیکھا جائے وہ (ہوا کی طرح) بے رنگ نہ ہو۔

۶۔ دیکھنے کے لئے کافی مقدار میں روشنی بھی موجود ہو۔

۷۔ دیکھے جانے والے کے لئے کسی خاص سمت میں ہونا ضروری ہے۔

اگر خدا کی رؤیت کا عقیدہ رکھا جائے تو مذکورہ شرائط کی وجہ سے ہمیں خدا کو جسم و جسمانیت سے متصف ماننا پڑے گا۔ جب کہ دنیا کے تمام مسلمان خدا کو جسم و جسمانیت سے پاک مانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں "لیس کمثلہ شئ" (سورۂ الشوریٰ/ ۱۱) کوئی چیز اس کی مانند نہیں ہے۔ عقل کے قطعی فیصلہ کے بعد بھلا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قیامت کے دن حسّی آنکھوں سے خدا کا دیدار کیا جائے گا؟

۳۔ خدا کے دیدار کا عقیدہ دراصل درآمد شدہ عقیدہ ہے۔

خدا کی رؤیت کا مسئلہ دراصل باہر سے درآمد شدہ مسئلہ ہے اور یہ عقیدہ "یہودی احبار" سے منتقل ہو کر اسلامی دنیا میں وارد ہوا ہے اور کچھ مسلمانوں نے سوچے سمجھے بغیر اسے قبول کر لیا ہے۔ رؤیت خدا کے مسئلہ کو عہد نامہ قدیم میں بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم عہد نامہ قدیم سے اس کے چند ثبوت پیش کرتے ہیں:

الف۔ میں نے خداوند کو دیکھا جو کہ بلند تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کہا مجھ پر افسوس، میری

آنکھوں نے خداوند رب الافواج کو دیکھا ہے(۱)

ب۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے تخت لگائے گئے ہیں اور خدائے قدیم ان پر بیٹھا ہوا ہے اس کا لباس برف کی مانند سفید ہے اور اس کے سر کے بال پشم کی طرح سے پاکیزہ ہیں اس کا تخت ایک شعلہ نور تھا۔(۲)

ج۔ بہر حال میں تو اس کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں (۳)

د۔ سلیمان اپنے پروردگار پر ناراض ہوا۔ کیونکہ اس کا دل خدا سے پھر چکا تھا۔ اسرائیل کا خدا اسے دوبار دکھائی دیا تھا۔(۴)

ہ۔ میں نے خدا کو دیکھا جو کہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا اور سمندر کی تمام سپاہ اس کے حضور کھڑی ہوئی تھی۔(۵)

تحریف شدہ عہد نامہ قدیم کے پیروکاروں نے ''رؤیت کا نظریہ'' کچھ اسلامی محدثین کے اذہان میں داخل کیا اور انہوں نے اس درآمد شدہ عقیدہ کو اسلامی عقیدہ کے طور پر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔

۴۔ قرآن خداوند عالم کو رؤیت بصری سے منزہ مانتا ہے

قرآن اللہ تعالیٰ کو رؤیت حسّی سے بلند و بالا مانتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ‌ۚ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ﴿۱۰۳﴾ سورة الانعام ۱۰۳

۱۔ اشعیاء: ۶/۱/۶

۲۔ دانی ایل: ۷/۹

۳۔ مزامیر داؤد: ۱۷/۱۵

۴۔ ملوک اول ص ۱۱

۵۔ ملوک اول/ ۲۳

(آنکھیں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں جب کہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے وہ لطیف (برتراز رؤیت) اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔)

اس آیت میں لفظ ''درک'' استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ وسیع مفہوم کا حامل ہے اور اس کی خصوصیات اس وقت واضح ہوتی ہیں جب اس کی نسبت حواس میں سے کسی حاسہ کی طرف کی جائے۔ اگر لفظ درک کی نسبت آنکھ کی طرف ہو تو اس سے دیکھنا مراد ہوتا ہے اور اگر اس لفظ کی نسبت کان کی طرف ہو تو اس سے سننا مراد ہوتا ہے۔ لہٰذا اب اگر کوئی یہ کہے ''ادر کته ببصری'' میں نے اپنی آنکھ سے اس کا ادراک کیا۔ اب اگر وہی متکلم بعد میں یہ کہے "وما رأیته" میں نے اسے نہیں دیکھا۔ تو اس کا یہ کلام ایک دوسرے کا متناقض شمار کیا جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جملہ میں رؤیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی لئے دوسرے جملہ کو پہلے جملہ کی نقیض قرار دیا جائے گا۔

اس تمہید پر توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس آیت اور اس کے بعد پیش کی جانے والی دو آیات میں خدا کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ ﴿١٠٣﴾ (سورۃ الانعام ۱۰۳)

(آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔)

۲۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ (سورۃ الانعام/۱۴)

(وہ روزی دیتا ہے اسے روزی نہیں دی جاتی)

۳۔ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (۳سورۃ المؤمنون/۸۸)

(وہ پناہ دیتا ہے اسے پناہ نہیں دی جاتی۔)

اس وضاحت کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آخرت میں خدا کا دیدار اسلامی عقائد کا جز ہے؟

۵۔ عقیدہ رؤیت پر قرآن کی تنقید

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ رؤیت خداوندی کا عقیدہ دراصل یہودیوں کا عقیدہ ہے جسے عالم اسلام میں درآمد کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے رؤیت خداوندی کا مطالبہ کیا تھا، اس پر قرآن نے پوری شدت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے۔ اس سلسلہ کی حسب ذیل تین آیات پر توجہ فرمائیں:

۱۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۵ (سورۃ البقرۃ آیت ۵۴)

(اس وقت کو یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم اس وقت تک تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم اللہ کو آشکارا طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس درخواست کے نتیجہ میں تمہیں بجلی نے پکڑا تھا اور تم دیکھ رہے تھے۔

۲۔ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً۔ (سورۃ النساء/۱۵۳)

اہل کتاب آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے لئے آسمان سے کتاب نازل کریں۔ اس مطالبہ پر آپ تعجب نہ کریں۔ انہوں نے موسیٰ سے تو اس سے بڑا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ آپ ہمیں آشکارا طور پر اللہ کو دکھائیں۔

۳۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا۝۲۱ (سورۃ الفرقان ۲۱)

وہ لوگ جو روز جزا پر ایمان نہیں رکھتے، کہا ہے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ لیتے۔ ان لوگوں نے اپنے دلوں میں تکبر کیا ہے اور سرکشی اور عناد کی راہ اختیار کی ہے

مسئلہ رؤیت پر خدا کی شدید ناراضگی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذات اقدسِ الٰہی

اس سے کہیں بلند و بالا ہے کہ وہ ایک مقام پر قرار پکڑے اور ہماری آنکھیں اسے ایسے دیکھ سکیں جیسا کہ ہم چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہیں۔ اگر ذاتِ احدیت کا آخرت میں مشاہدہ ممکن ہوتا تو رؤیت کے سوال پر خدا اتنی ناراضگی کا اظہار نہ کرتا اس کی بجائے ان کو یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس جہاں میں تمہاری درخواست قابل قبول نہیں ہے۔ صبر کرو جہاں آخرت میں تم اسے ایسے دیکھو گے جیسا کہ تم چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو۔

رؤیت کا عقیدہ رکھنے والوں کی دلیل

وہ افراد جو جہانِ آخرت میں خدا کی رؤیت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت مجیدہ ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ (سورۃ القیامہ)

(اس دن چہرے تروتازہ اور شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور اس دن جو چہرے پریشان ہوں گے۔ وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر شکن عذاب ٹوٹنے والا ہے۔)

چنانچہ رؤیت خداوندی کا عقیدہ رکھنے والے "الی ربہا ناظرۃ" (اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) کی آیت مجیدہ کو آخرت میں رؤیت الٰہی کی دلیل کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ اس جملہ کا مطلب کیا ہے؟ اس کے متعلق دو احتمال پائے جاتے ہیں۔

الف۔ وہ اپنی حسّی آنکھوں سے خدا کی طرف دیکھ رہے ہوں گے

ب۔ وہ خدا کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، یہ اس بات کا کنایہ ہے کہ وہ اس کی رحمت کے منتظر ہوں

گے۔

مذکورہ معانی میں سے حتمی معنی کون سا ہے اس کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ مذکورہ بالا چاروں آیات پر گہرا غور وفکر کیا جائے۔

اب ہم اس جملہ کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

استدلال میں پیش کی جانے والی آیت سمیت مجموعی طور پر یہ چار آیات ہیں اور ان آیات کے درمیان ایک طرح کا تقابل اور موازنہ پایا جاتا ہے۔ یعنی کہ پہلی آیت کا تقابل تیسری آیت سے اور دوسری آیت کا تقابل چوتھی آیت سے کیا گیا ہے۔ اور اگر ہم اس تقابل کو واضح کرنا چاہیں تو ان آیات مجیدہ کی اس طرح سے تنظیم کر سکتے ہیں۔

''وجوہ یومئذٍ ناضرۃ'' کی پہلی آیت کے مدمقابل ''وجوہ یومئذٍ باسرۃ'' تیسری آیت ہے ''الی ربھا ناظرۃ'' کی دوسری آیت کے مدمقابل ''تظن ان یفعل بھا فاقرۃ'' کی چوتھی آیت ہے۔ جب ہم ان آیات کا تقابلی جائزہ لیں گے تو آیت کا مفہوم بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گا۔

اب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''الی ربھا ناظرۃ'' کی آیت مجیدہ کا مفہوم اشاعرہ کے مطابق یہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف نگاہ کر رہے ہوں گے۔ جب کہ عدلیہ کے نزدیک اس کا مفہوم رحمت کے انتظار میں بیٹھنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو میں سے کون سا مفہوم صحیح ہے؟ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے چوتھی آیت کلیدی کردار ادا کر رہی ہے یعنی ''تظن ان یفعل بھا فاقرۃ'' اس آیت کا مطلب انتہائی واضح ہے کہ اس دن مرجھائے ہوئے پریشان چہرے کمرشکن عذاب کے انتظار میں ہوں گے۔

جب چوتھی آیت کا مفہوم یہ ہے تو پھر اس کی تقابلی آیت سے اس کا متضاد مفہوم مراد ہے اور وہ یہ ہے کہ تروتازہ وشاداب چہرے رحمت کے انتظار میں ہوں گے اور مذکورہ چار آیات کا

حاصل مطلب یہ ہے کہ:

قیامت کے دن لوگوں کی دو قسمیں ہوں گی۔

۱۔ شاداب وشگفتہ چہروں والے

۲۔ غمگین و پریشان چہروں والے

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلا گروہ جزا اور رحمت کا منتظر ہوگا اور دوسرا گروہ سزا اور عذاب کا منتظر ہوگا۔

اگر اس صحیح ترین تقسیم بندی سے ہٹ کر اشاعرہ کے طرز فکر کے مطابق ہم اس کی تفسیر کریں تو آیات کا تقابلی انداز ختم ہو جائے گا اور ان کے درمیان جو حسین مناسبت و اتصال پایا جاتا ہے وہ بھی رخصت ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلا گروہ خدا کو دیکھ رہا ہوگا اور دوسرا گروہ کمر شکن عذاب کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔

اس طرح کی تفسیر قرآنی بلاغت اور حسنِ تقابل کے خلاف ہے اور اس سے آیات میں پایا جانے والا معنوی ارتباط ختم ہو جاتا ہے۔

باالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات میں دو گروہوں کی جزا و سزا کا تقابل کیا گیا ہے اور یہ تقابل صرف اس صورت میں صحیح ہے کہ ہم یہ کہیں کہ پہلا گروہ رحمت کے انتظار میں اور دوسرا گروہ عذاب کے انتظار میں ہوگا۔ اور اگر اس کے برعکس ہم یہ کہیں کہ پہلا گروہ خدا کو دیکھ رہا ہوگا اور دوسرا گروہ کمر شکن عذاب کا انتظار کر رہا ہوگا، اس سے قرانی آیات کی مناسبت ضائع ہو جائے گی۔

ہمارے موقف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''نَظَرَ'' فعل کی نسبت ''وجوہ'' (چہروں) کی طرف ہے نہ کہ ''عیون'' (آنکھوں) کی طرف ہے اگر مقصود حسی رؤیت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ''وجوہ یومئذٍ ناضرۃ'' نہ کہتا۔ اس کی بجائے وہ یہ الفاظ کہتا ''عیون یومئذٍ ناضرۃ''

دوسری آیات کی گواہی

قیامت کے دن لوگ دو طرح کے گروہوں میں تقسیم ہوں گے ایک گروہ شاداب اور منتظرِ رحمت افراد پر مشتمل ہوگا جب کہ دوسرا گروہ افسردہ اور فکرِ عذاب میں مبتلا لوگوں کا ہوگا۔

اس حقیقت کی گواہی قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی ملتی ہے۔ سلسلہ آیات موجودہ میں اسی مضمون کی تکرار کی گئی ہے اور ایسی تمام جگہوں میں لفظ "عیون" (آنکھیں) کی بجائے لفظ "وجوہ" (چہرے) کو استعمال کیا گیا ہے۔

۱۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾

۲۔ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ (عبس/۳۸۔۴۱)

(اس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے۔ مسکراتے ہوئے کھلے ہوئے
اور کچھ چہرے غبار آلود ہوں گے۔ ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی)

مذکورہ بالا چار آیات سابقہ چار آیات کی مانند ہیں اور "وجوہ یومئذٍ مسفرۃ" کا جملہ "وجوہ یومئذٍ ناضرۃ" کا قائم مقام ہے اور "ضاحکۃ مستبشرۃ" کا جملہ "الی ربھا ناظرۃ" کا قائم مقام ہے۔

چنانچہ یہ آیت مورد بحث آیت کے ابہام کو دور کرتی ہے اور اس کے پیغام کو متعین کرتی ہے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے:

۱۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ (سورہ غاشیہ)

۲۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ (سورہ غاشیہ)

(اس دن بہت سے چہرے ذلیل و رسوا ہوں گے۔ محنت کرنے والے تھکے ہوئے دہکتی

ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔اس دن کچھ چہرے آسودہ ہوں گے اور وہ اپنی محنت سے خوش ہوں گے۔بلند ترین جنت میں ہوں گے۔)

"وجوہ یومئذٍ ناعمة" کی آیت "وجوہ یومئذٍ ناضرة" کی قائم مقام ہے اور "لسعیھا راضیة۔فی جنة عالیة" کی دو آیات "الی ربھا ناظرة" کی آیت مجیدہ کی قائم مقام ہیں۔

تینوں سورتوں میں موجود ان آیات میں کہیں بھی لفظ "عیون" موجود نہیں ہے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ لفظ "وجوہ" استعمال کیا ہے جس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ قرآن کا ہدف رؤیت خداوندی کا اثبات نہیں ہے۔مذکورہ تمام آیات کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگ یا تو شاداب و تروتازہ چہروں کے ساتھ آئیں گے یا غمگین اور افسردہ چہرے لیے ہوئے حاضر ہوں گے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے اچھے یا برے انجام کا منتظر ہوگا۔

اثبات رؤیت کے لئے حدیث سے استدلال

رؤیت خداوندی کا تعلق اعتقادی مسائل سے ہے اور اعتقادی مسائل کے لئے خبر واحد کی بجائے پیغمبرؐ سے احادیث متواترہ کی ضرورت ہوتی ہے۔احادیث متواترہ علم و یقین کے لئے مفید ہوتی ہیں۔خبر واحد پر اعتماد کر کے اسے عقائد کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔فروع میں خبر واحد پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔جب کہ اصول دین میں ظن و تخمین کی بجائے قطعیت و یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب ہم حدیث رؤیت کا جائزہ لیتے ہیں:

"قیس بن ابی حازم" نے جریر سے یہ روایت نقل کی ہے:

كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَنَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَتَهُ۔ يَعْنِي الْبَدْرَ۔ فَقَالَ: إِنَّكُمْ

تَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ (۱)

جریر کا بیان ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ چودھویں رات کے چاند کو دیکھ رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس طرح سے تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی شک نہیں ہے اس طرح سے تم اپنے خدا کو بھی دیکھو گے۔

مذکورہ بالا حدیث سے عقیدہ کا استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ

۱۔ ہم قرانی آیات سے ثابت کر چکے ہیں کہ خدا غیر مرئی ہے اور وہ ہر طرح کی جسم وجسمانیات سے پاک ہے اور دیکھا اس چیز کو جاتا ہے جس کا تعلق جسم وجسمانیات سے ہو۔ یہ روایت قرانی مطالب کے خلاف ہے لہذا ناقابل قبول ہے۔

۲۔ جس عقل سے ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہوئی ہے۔ اسی عقل کا تقاضا ہے کہ رؤیت الٰہی تب ممکن ہے جب وہ ایک مخصوص مقام پر بیٹھا ہوا ہو اور اگر خدا کے لئے مقام تسلیم کیا جائے تو اس سے جسمانیت لازم آتی ہے اور خدا جسمانیت سے منزہ ہے۔

۳۔ اس روایت کا راوی قیس بن ابی حازم ہے اس کا تعلق تابعین سے ہے اس نے ۹۷ھ یا ۹۸ھ میں وفات پائی تھی۔ مذہب اہل سنت کے علمائے رجال اس کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ ''منکر الحدیث'' تھا۔ یعنی نا قابل قبول احادیث بیان کرتا تھا اور اس کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ حضرت امیر المومنینؑ کو بُرا بھلا کہتا تھا۔ اس نے سو سال عمر پائی تھی اور آخری ایام میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔

یہاں یہ عرض کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ایک سال ترکی میں ''احکام سفر'' کے عنوان پر علماء کا سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار میں مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو ایک عربی زبان بولنے والے طالب علم کو میری ترجمانی اور رہنمائی کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس کا تعلق

۱۔ صحیح بخاری جلد اول/ ۱۱۱۔ ۱۱۵ باب ۲۶، ۳۵ من ابواب مواقیت الصلاۃ صحیح مسلم، شرح نووی جلد ۵ / ۱۳۶۔

''اسکندرون'' کے علاقے سے تھا۔

ایک دن رؤیت خداوندی کے موضوع پر میری اور اس کی گفتگو ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ حضرات آخرت میں رؤیت خداوندی کا جو عقیدہ رکھتے ہیں یہ عقیدہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

۱۔ یا تو خدا کا تمام وجود دکھائی دے گا۔

۲۔ یا پھر خدا کے وجود کا کچھ حصہ دکھائی دے گا

اور یہ دونوں مفروضے باطل ہیں۔ پہلی صورت میں انسان ''محیط'' اور اللہ ''محاط اور محدود'' قرار پاتا ہے اور یہ عقیدہ قرآن اور عقل سلیم کے منافی ہے۔ اور پہلے مفروضے کی طرح سے دوسرا مفروضہ بھی باطل ہے کیونکہ اس سے خدا کا مرکب ہونا لازم آتا ہے کہ اس کا ایک حصہ مرئی ہو اور دوسرا حصہ غیر مرئی ہو۔ اس سے ذات خداوندی کے لئے اجزاء کا عقیدہ لازم آتا ہے۔

میری گفتگو سن کر میرا مترجم حیران ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

ابوقرّہ محدث سے امام علی رضاؑ کا مباحثہ

ابوقرّہ عہد عباسی کا مشہور محدث تھا۔ اس نے امام علی رضاؑ سے عرض کیا:

''اللہ نے تکلم اور رؤیت کے شرف کو حضرت موسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ موسیٰ کو کلام کا شرف عطا کیا اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رؤیت (دیدار) کا شرف عطا کیا''۔

امام علی رضاؑ نے جواب میں فرمایا کہ یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ اللہ نے اپنے حبیب کو دیدار کا شرف عطا کیا تھا اور یہ کہ رسول خداؐ نے اس جہاں میں اللہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ جب کہ پیغمبر اسلام نے تو خدا کی طرف سے جن و انس کو یہ پیغام پہنچایا ہے۔ ''لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ'' (سورۂ انعام آیت ۱۰۳)

''وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا'' (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۰) اور ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ'' (سورۂ شوریٰ آیت ۱۱)

(آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرتیں جب کہ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے۔اس کا علمی احاطہ نہیں کر سکتے۔کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے)

کیا پیغمبر اسلام نے لوگوں تک یہ آیات نہیں پہنچائی تھیں؟

ابوقرہ نے کہا: بے شک آپ نے پہنچائی تھیں۔

اس وقت امامؑ نے فرمایا: یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو خدا اپنا رسول بنا کر بھیجے اور وہ لوگوں سے کہے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں، تمام لوگوں کو اللہ کی دعوت دے اور لوگوں کو یہ آیات بھی سنائے اور پھر اس کے بعد وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں نے خدا کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔میں نے اس کا علمی احاطہ کیا ہے اور وہ انسانی صورت رکھتا ہے۔

ابوقرہ! کیا تمہیں اور تم جیسے دوسرے محدثین کو اس طرح کی روایات بیان کرتے ہوئے شرم دامن گیر نہیں ہوتی؟ آج تک کسی زندیق نے بھی یہ کہنے کی جسارت نہیں کی کہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کا کلام کچھ اور پیش کرتے تھے بعد میں اپنی طرف سے کچھ اور کہتے تھے۔(۱)

جب ہم سردار اہل بیت امیر المومنینؑ کے خطبات وکلمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ آپ نے رؤیت الٰہی کے نظریہ کا ابطال کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے رؤیت الٰہی کے ناممکن ہونے کے متعلق فرمایا:

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا يَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُونَ وَلَا يُحْصِي نَعْمَائَهُ الْعَادُّونَ وَلَا يُؤَدِّي حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُونَ الَّذِي لَا يُدْرِكُهُ بُعْدُ الْهِمَمِ وَلَا يَنَالُهُ غَوْصُ الْفِطَنِ.. (۲)

(تمام حمد اس اللہ کے لئے ہے جس کی مدح تک بولنے والوں کی رسائی نہیں۔جس کی

۱۔توحید صدوق ص ۱۱۰۔

۲۔نہج البلاغہ خطبہ اول

نعمتوں کو گننے والے گن نہیں سکتے اور نہ کوشش کرنے والے اس کا حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ بلند پرواز ہمتیں اسے پا سکتی ہیں اور نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس کی تہ تک پہنچ سکتی ہیں۔)

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۲

رجعت

سوال: رجعت کا مفہوم ہے کہ قیامت سے پہلے ایک گروہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا اور وہ اس دنیا میں آئیں گے۔ آخر شیعہ عقائد میں رجعت کا عقیدہ کیوں شامل ہے؟ جب کہ مرنے کے بعد ہر شخص کے نامہ اعمال کا دفتر بند ہو جاتا ہے اور قیامت سے قبل کسی کا دوبارہ زندہ ہو کر اس جہان میں آنا ناممکن ہے۔ (آخر ایسے غیر منطقی عقیدہ کا کیا ثبوت ہے)؟

جواب: لغوی طور پر رجعت واپسی کے معانی مین ہے اور شیعی ادب میں اس سے مراد یہ ہے کہ امام مہدی (عج) کے ظہور کے بعد اور قیامت سے پہلے امت اسلامیہ کے کچھ افراد کو زندہ کر کے دنیا میں لایا جائے گا۔

رجعت کے ثبوت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کا ذکر قرآن حکیم میں کیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک گروہ کو دنیا میں مبعوث کیا جائے گا۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ (سورۂ النمل ۸۴)

جب ہم ہر امت میں سے ایک ایسے گروہ کو محشور کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے

تھے اور انہیں ایک دوسرے سے ملحق کیا جائیگا۔

یہ بات مسلم ہے کہ یہ قیامت سے پہلے ہوگا کیونکہ قیامت کے دن صرف ایک آدھ گروہ کو ہی نہیں اٹھایا جائے گا اس دن سب کو محشور کیا جائیگا۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ؕ﴿۹۳﴾ لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ؕ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾ (سورۃ المریم آیت ۹۳تا۹۵)

ترجمہ: اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی رہتے ہیں وہ سب کے سب مہربان خدا کے حضور حالتِ تسلیم میں حاضر ہوں گے۔ خدا نے سب کا شمار کیا ہوا ہے اور انکی تعداد گن رکھی ہے۔ سب تنہا ہو کر قیامت کے دن اس کے سامنے پیش ہوں گے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَّحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ۚ﴿۴۷﴾ (سورۂ کھف آیت ۴۷)

اور ہم سب کو حساب کے لئے جمع کریں گے اور کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

مذکورہ بالا آیات پر توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا کو دو دنوں کا انتظار ہے ان میں سے پہلا دن وہ ہے جب انسانوں میں سے کچھ لوگ محشور کیے جائیں گے اور دوسرا دن وہ ہے جب کسی استثناء کے بغیر تمام انسانوں کو زندہ کیا جائے گا۔

شیعی روایات بیان کرتی ہیں کہ پہلے دن کا تعلق قیامت سے پہلے ظہور امام مہدی (عج) سے ہے۔

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ آیت مجیدہ میں اس تباہ کار گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جو آیات الٰہی کی تکذیب کرتا ہے جب کہ رجعت کا دائرہ اس سے وسیع ہے۔

آخرت سے قبل کچھ صالحین اور کچھ بدکاروں کو زندہ کیا جاچکا ہے۔ یہ بات ہرگز قابل تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ امم سابقہ میں سے کئی گروہوں کو زندہ کیا گیا تھا اور پھر ایک عرصہ بعد ان

پر موت واقع ہوئی تھی۔(۱)

کسی گروہ کا موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا نہ تو عقل کے خلاف ہے اور نہ ہی قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ہم ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے سابقہ امتوں کے کئی گروہوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی داستان کو پیش کیا ہے اور یہ اس کے امکان پذیر ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

رجعت تناسخ نہیں ہے

حقائق سے نابلد کچھ افراد رجعت اور تناسخ (آواگون) کو ایک چیز قرار دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں کوئی مماثلت موجود نہیں ہے۔

عقیدہ تناسخ کے تحت یہ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کی جزا اور سزا کیلئے دنیا میں دوسرا جنم لیتا ہے اور اس کا آغاز نطفہ سے ہوتا ہے۔یا اس کی روح کو کسی دوسرے انسان کے جسم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔جب کہ رجعت میں ان میں سے ایک بھی چیز شامل نہیں ہے۔

رجعت کا انداز تناسخ سے مطابقت نہیں رکھتا البتہ جن گروہوں کو خدا نے دوبارہ زندگی دے کر اٹھایا تھا اس سے رجعت مطابقت رکھتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قیامت سے قبل رجعت قیامت کا ایک ہلکا نمونہ ہے۔رجعت میں چند افراد اٹھائے جائیں گے جب کہ قیامت میں سب انسان زندہ کیے جائیں گے۔اس سلسلہ میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے حضرت عمر نے ہی رجعت کے عقیدہ کا اعلان کیا تھا۔

ابن ہشام لکھتے ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو عمر بن خطاب اٹھے

۱۔قیامت سے قبل بنی اسرائیل کا ایک گروہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا گیا تھا۔اس کے لئے سورہ البقرہ کی آیات ۵۵۔۵۶ کی تلاوت کریں۔بنی اسرائیل کے ایک مقتول کے گائے کے ذریعے زندہ ہونے کے واقعہ کے لئے سورہ بقرہ کی ۷۲۔۷۳ کی تلاوت کریں۔ایک گروہ جو کہ ہزاروں کی تعداد میں تھا ان پر موت وارد ہوئی تھی پھر خدا نے انہیں زندہ کیا تھا۔اس کے لئے سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۳ کی تلاوت کریں۔حضرت عزیر پر سو سال کے لئے موت طاری ہوئی تھی۔سو سال بعد انہیں زندہ کیا گیا تھا۔اس کے لئے سورہ البقرہ کی آیت ۲۵۹ ملاحظہ فرمائیں۔حضرت مسیح باا عجاز مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔سورہ آل عمران کی آیت ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

اور انہوں نے کہا: منافقین کا ایک گروہ یہ خیال کر رہا ہے کہ رسول خدا مر چکے ہیں۔ نہیں وہ مرے نہیں ہیں۔ وہ اپنے خدا کی طرف گئے ہیں آپ دوبارہ دنیا میں آئیں گے خدا کی قسم وہ دوبارہ آئیں گے اور جو لوگ انہیں مردہ کہہ رہے ہیں آپ آ کر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔ (۱)

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ رجعت کا اجمالی مفہوم ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت امام مہدی (عج) کے ظہور کے بعد خدا کے کچھ برگزیدہ بندے اور کچھ ظالم وستمگار افراد دوبارہ دنیا میں لوٹائے جائیں گے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

عظیم شیعہ محدث علامہ مجلسی لکھتے ہیں: رجعت کے متعلق شیعی روایات حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔ تیس سے زیادہ محدثین نے پچاس سے زیادہ کتابوں میں اسے نقل کیا ہے۔ شائقین کو چاہیے کہ وہ بحار الانوار کی بحث رجعت کا مطالعہ کریں۔ (۲)

HASAN ALI

۱۔ سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۶۵۵۔ فصل بیماری پیغمبرؐ

۲۔ بحار الانوار جلد ۵۳ ص ۱۳۶ اور بعد کے صفحات

۳

قضا وقدر

سوال: کیا شیعہ قضا وقدر کا عقیدہ نہیں رکھتے ؟

جواب: قضا وقدر کا عقیدہ اسلام کے قطعی عقائد میں سے ہے۔ اس عقیدہ کو کتاب وسنت میں بیان کیا گیا ہے۔ عقلی دلائل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

''قدر'' کے متعلق یہی ایک آیت ہی کافی ہے:

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ (سورۂ قمر، آیت ۴۹)

(بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے۔)

بنابریں یہ جہانِ آفرینش جہانِ تقدیر ہے اور اس کا پورا پروگرام طے شدہ ہے ہر انسان جب شکمِ مادر سے پیدا ہوتا ہے تو اس کی حیات وزندگی کا پروگرام طے شدہ ہوتا ہے۔

قضا کے معنی قطعی ہونے اور ایک پروگرام کو عملی شکل میں لانے کے ہیں اور اس کے اثبات کے لئے یہ آیت کافی ہے۔:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ (سورۂ انعام/۲)

(وہ وہی ہے جس نے تمہیں خاک سے پیدا کیا ہے پھر اس نے مدتِ عمر مقرر کی ہے)

لہٰذا ان آیات اور اس موضوع کے متعلق وارد ہونے والی احادیث کی وجہ سے کوئی بھی مسلمان قضا وقدر کا انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اگرچہ جزئیات کی تفصیل جاننا ضروری نہیں ہے اور اسی

مسئلہ کے جزئیات میں قدم رکھنا بھی نامناسب ہے کیونکہ اس سے انسان گمراہی اور شکوک میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"طَرِيقٌ مُظْلِمٌ فَلَا تَسْلُكُوهُ وَبَحْرٌ عَمِيقٌ فَلَا تَلِجُوهُ وَسِرُّ اللهِ فَلَا تَتَكَلَّفُوهُ"(۱)

یہ تاریک راستہ ہے اس پر مت چلو اور یہ گہرا سمندر ہے اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو اور یہ راز الٰہی ہے اس سے پردہ اٹھانے کی زحمت نہ کرو۔

یہ جہان آفرینش ایک مکمل اندازے اور پروگرام کے تحت خلق ہوا ہے اور اسی کے مطابق چل رہا ہے۔ انسان اس جہان کی ایک جز ہے اور وہ بھی اس قاعدہ وقانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قضا و قدر کو عقیدہ جبر کے مساوی نہیں جاننا چاہیے۔

قضاوقدر کا عقیدہ جدا ہے اور عقیدہ جبر ایک الگ چیز ہے۔ شیعہ اور عدلیہ اس عقیدہ میں ہمنوا ہیں کہ تقدیر الٰہی اور اس کا حکم خداوندی سے مرحلہ عمل میں آنا انسان کو نیک و بد کے انتخاب و اختیار کے منافی نہیں ہے۔

آج کے بدکار افراد عصر رسالت کے مشرکین کی طرح سے اپنی ہر بدبختی اور گناہ گاری کو قضاوقدر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور سارا الزام قضاوقدر پر دھرنے کے بعد اپنے آپ کو بے گناہ قرار دیتے ہیں اور یہ لوگ اس طرح کے اشعار پڑھتے ہیں:

کوکب بخت مرا ہیچ منجّم نشناخت
یارب ازمادر گیتی بہ چہ طالع زادم؟

(آج تک میرے بخت کے ستارے کو کوئی منجم نہیں پہچان سکا۔ خدایا! مجھے بتا تو سہی میں کون سا طالع لے کر پیدا ہوا ہوں۔)

۱۔ نہج البلاغہ: کلمات قصار: ۲۸۷

یا پھراس طرح کے اشعار پڑھے جاتے ہیں

گلیم بخت کسی را که بافتند سیاه
به آب زمزم و کوثر سفید نتوان کرد

(جس کے مقدر کو بُنا ہی سیاہی سے گیا ہو۔وہ زمزم وکوثر کے پانی سے سفید نہیں ہوسکتا)(۱)

شعراء کا یہ فلسفہ خود فریبی اور جہان فریبی پر مبنی ہے کیونکہ قران کریم ہر شخص کو اس کے اعمال کا جوابدہ قرار دیتا ہے۔جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ ﴿۳۹﴾ (سورۃ النجم آیت ۳۹)
(ہر شخص کو اس کی کوشش کا ثمر ملتا ہے)

اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کو تقدیر کے کھاتے میں ڈالنے والوں کو یہ جواب دینا چاہیے۔

نکوہش مکن چرخ نیلوفری را
برون کن زسرباد خیرہ سری را
تو خود گر کنی اختر خویش رابد
مدار از فلک چشم نیک اختری را

(چرخ نیلگوں کا شکوہ مت کر۔اپنے سر سے حیرانی کی ہوا نکال دے۔تو اگر خود ہی اپنے ستارے کو بد بنانے لگ جائے تو پھر فلک سے کسی طالع نیک کی امید نہ رکھ۔)

۱۔ایک مرتبہ سلطان ہند نے طوائفوں پر پابندی لگانے کا خیال ظاہر کیا تو کسی شاعر نے انہیں یہ شعر بنا کر دیا تھا جس کی وجہ سے سلطانِ ہند کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا۔

در کوئے نیک نامی مارا گذرندارد
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

نیک نامی کے کوچے میں ہمارا گذر ممکن نہیں ہے۔اگر تجھے یہ بات پسند نہیں ہے تو پھر قضا وقدر کو تبدیل کردے۔(اضافۃ من المترجم)

شیعہ عالمِ آفرینش میں قضا و قدر کو مُسلَّم اصول کا درجہ دیتے ہیں لیکن تقدیر کے عقیدہ کو جبر کے مساوی قرار نہیں دیتے اور اسے انسانی آزادی کے منافی نہیں سمجھتے۔ اس مطلب کی وضاحت کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے افعال کی آزادی اور قضا و قدر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کے متعلق تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہے کہ انسان ایک فاعلِ مختار ہے اور انسان صاحبِ ارادہ ہے۔ کسی فعل کا کرنا یا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ انسان کے ارادہ و اختیار کے بعد قضائے الٰہی فعل میں قطعیت اور حتمیت پیدا کرتی ہے۔

اگر ہم لفظوں کو بدل دیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تخلیق اختیار و آزادی کے ساتھ مخلوط اور نپی تلی ہے۔ قضائے الٰہی بس یہی ہے کہ جب انسان اپنے اختیار سے اسباب فعل فراہم کرتا ہے تو قدرت کی طرف سے اس کا نفاذ عمل میں لایا جاتا ہے۔

کچھ بدکار انسان اپنی تمام تر بدکاریوں کو تقدیرِ الٰہی کے پلڑے میں ڈالتے ہیں اور ان کا یہ نظریہ ہے کہ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چلنا ان کے اختیار سے باہر ہے۔ حالانکہ عقل اور وحی دونوں ہی اس نظریہ کو غلط قرار دیتے ہیں۔ عقل کا فیصلہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے ہی اپنی سرنوشت کا انتخاب کرتا ہے۔ جب کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ انسان کو اختیار حاصل ہے چاہے تو وہ شاکر و نیکوکار رہے چاہے تو منکر اور بدکار بنے یہ سب کچھ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾ (سورۂ دھر آیت ۳)

(ہم نے انسان کو راستہ دکھایا ہے خواہ وہ شاکر بنے یا کافر۔)

عہدِ رسالت میں کچھ ایسے بت پرست موجود تھے جو اپنی گمراہی کی ذمہ داری مشیت الٰہی پر ڈالا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: اگر خدا نہ چاہتا تو ہم بت پرستی نہ کرتے۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے خیالات کو ان کلمات سے نقل کیا ہے:

سَيَقُولُ الَّذِينَ اَشْرَكُوا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ (سورۂ انعام/۱۴۸)

(مشرکین یہ کہیں گے کہ اگر خدا کی یہ مشیت ہوتی تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ قرار دیتے اور ہم کسی چیز کو از خود حرام نہ کرتے۔)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے جواب میں یہ فرمایا:

"كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوا بَأْسَنَا"

(ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح سے تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو چکھ لیا۔)

مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ چودھویں صدی کے محققین اہل سنت نے قضا وقدر کے مضبوط عقیدہ کے باوجود اسے انسانی حریت و اختیار کے خلاف قرار نہیں دیا۔ ان محققین میں سے کچھ کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ محمد عبدہ (۱۲۶۶۔ ۱۳۲۳) شیخ ازہر (۱)

۲۔ عبدالعظیم زرقانی۔ مؤلف کتاب "مناھل العرفان" (۲)

۳۔ شیخ محمود شلتوت (المتوفی ۱۳۸۳) شیخ ازہر (۳)

مذکورہ محققین نے اپنے روشن نظریات کے ساتھ صحیح مسلم (۴) کی ان تمام روایات کی تاویل کی ہے یا پھر ان کی تردید کی ہے جن میں قضا وقدر کا ایسا مفہوم بیان کیا گیا ہے جو عقیدہ جبر سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں ہے۔

۱۔ رسالۃ التوحید، ص ۵۹

۲۔ مناھل العرفان جلد اول ص ۵۰۶

۳۔ تفسیر قرآن کریم: ۲۴۰۔ ۲۴۲

۴۔ صحیح مسلم جلد ۸ ص ۴۴ و ۴۸۔ جامع الاصول جلد اول ص ۵۱۶

HASSAN ALI DHARSI

۴

بداء یا نیک و بد اعمال کی وجہ سے تقدیر کا بدل جانا

سوال: شیعہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کیا اس عقیدہ سے خدا کی ناواقفیت ثابت نہیں ہوتی ؟

جواب: ''بدا'' ایک اسلامی عقیدہ ہے، تمام دنیا کے مسلمان اس پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں البتہ اسکی شرط یہ ہے کہ اس کی صحیح تفسیر کی جائے۔ اگر چہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو لفظ ''بدا'' سے پرہیز کرتے ہیں۔ البتہ اس کے مفہوم کو مانتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ نام کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس کے مقصود و مطلوب کی اہمیت ہوتی ہے۔ بدا کی حقیقت دو بنیادوں پر استوار ہے:

الف۔ اللہ تعالیٰ جہان ہستی پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور اگر وہ ایک تقدیر کو بدل کر دوسری تقدیر نافذ کرنا چاہے تو وہ اس پر قدرت رکھتا ہے۔ دونوں تقدیریں پہلے سے ہی اس کے علم میں ہوتی ہیں اور اس کے علم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ پہلی تقدیر کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اب خدا کی قدرت محدود ہو چکی ہے اور اسے بدلنے کی قوت سے محروم ہو چکا ہے۔ یہودی یہ کہتے تھے "ید اللہ مغلولۃ" خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس مسلمان خدا کی قدرت واسعہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قرآن کے اپنے الفاظ میں ''بل یداہ مسبوطتان'' (سورۂ مائدہ/ ۶۴) بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔

ب۔ جب خدا ایک تقدیر کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری تقدیر کو نافذ کرتا ہے تو اس کی بنیاد حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے۔ اور اس حکمت و مصلحت کو خود انسان کے اعمال میں تلاش کیا جاسکتا ہے جسے وہ اپنے اختیار سے بجالاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے اختیار کردہ نیک و بد افعال اس کی تقدیر سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

فرض کریں کہ ایک شخص والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتا۔ طبعی طور پر یہ عمل قابل نفرت ہے اور اس کا یہ عمل اس کی تقدیر کی خرابی میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اور اب اگر وہ شخص اپنی آدھی زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے کردار پر نادم ہوجائے اور والدین اور رشتہ داروں کی خدمت کرنے لگ جائے تو اس کا یہ عمل اس کی بہتر تقدیر کے لئے انتہائی موثر ثابت ہوگا۔ اور یہ شخص "يَمْحُوا اللهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ" (سورۂ الرعد آیت ۳۹) (اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے) کا مصداق بن جائے گا۔

اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو بھی یہی اصول کارفرما رہے گا۔

اس سلسلہ کی بہت سی آیات و روایات ہیں جن سے مفہوم ثابت ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے چند آیات کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

۱۔ اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (سورۂ رعد آیت ۱۱)
(اللہ کسی بھی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرتا (یعنی آسائش کی بجائے سختی میں نہیں ڈالتا) جب تک وہ اپنی حالت کو خود تبدیل نہ کریں۔)

۲۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ (سورۂ اعراف آیت ۹۶)
(اگر آبادیوں کے رہنے والے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی ہے لہٰذا ہم

نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔)

۳۔سیوطی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قران مجید کی آیت" یمحوا اللہ مایشاء ویثبت" کی تفسیر دریافت کی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ میں اس آیت کی تفسیر سے تمہاری اور اپنی امت کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنا چاہتا ہوں۔اللہ کی راہ میں صدقہ دینا، والدین سے بھلائی کرنا اور نیک اعمال بجالانا بدبختی کو خوش بختی میں بدل دیتا ہے۔اس سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور بُری موت سے نجات ملتی ہے(۱)

۴۔امام محمد باقرؑ کا فرمان ہے کہ صلہ رحمی اعمال کو پاکیزہ اور اموال کو بابرکت بنا دیتی ہے اور بلاؤں کو رد کرتی ہے اور حساب کو آسان بناتی ہے اور (معلق) اجل کو مؤخر کر دیتی ہے۔(۲)

لہٰذا قرآن کریم کی ان آیات اور بیان کردہ روایات سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ بدا ایک مُسلَّم اسلامی عقیدہ ہے۔تعبیر واصطلاح سے قطع نظر اس کے مفہوم کو تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔

چنانچہ بدا کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کی کوئی بھی سرنوشت حتمی اور قطعی نہیں ہوتی بلکہ معلق ہوتی ہے۔انسان کے اعمال اس کی تقدیر سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اگر اعمال نیک ہوں گے تو اچھی تقدیر میں مؤثر ثابت ہوں گے اور اگر اعمال بُرے ہوں گے تو اچھی تقدیر بھی بگڑ جائے گی۔

اس وضاحت کے بعد ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس مسلمہ اسلامی عقیدہ کو لفظ ''بداللہ'' سے تعبیر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟اس اعتراض کے جواب میں ہم دو مطالب پیش کرتے ہیں:

۱۔اس لفظ کا تعلق باب ''مشاکلہ'' سے اور لوگوں کے محاورات سے ہے۔کیونکہ جب

۱۔درمنثور جلد ۳ ص ٦٦

۲۔الکافی جلد ۲ ص ۴۷۰

کوئی شخص اپنے سابقہ ارادہ کو تبدیل کرتا ہے تو عرب محاورہ کے تحت وہ یہ الفاظ کہتا ہے۔ "بَدَالِی" مجھے بدا لاحق ہوا۔ ائمہ ہدیٰ نے بھی مخاطب افراد کو دین کا یہ مفہوم سمجھانے کے لئے انہی کا محاورہ استعمال کیا ہے اور خدا کے لئے "بدا" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے "مکر، خدعہ اور نسیان" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ اللہ مکر، دھوکہ دہی اور نسیان (جو انسانوں کے درمیان جس مفہوم و شکل میں رائج ہیں) سے بلند و بالا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لئے مذکورہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

۱۔ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ (سورۂ طارق آیات ۱۵۔۱۶)

۲۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا ﴿۵۰﴾ (سورۂ نمل/۵۰)

۳۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (نساء/۱۴۲)

۴۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (سورۂ توبہ/۶۷)

(جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے لفظ کید، مکر، حذعہ اور نسیان استعمال کیا ہے حالانکہ وہ ان کے متداول معانی سے بلند و بالا ہے) اس طرح سے علم الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ ہونے کے باوجود ہادیانِ دین نے خدا کے لئے "بدا" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

محققین شیعہ نے "بدا" کی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس مختصر کتاب میں ان تمام مطالب کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ شائقین کو چاہیے کہ وہ مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ (۱)

۲۔ شیعہ علماء اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں آنحضرتؐ نے مبروص، گنجے اور اندھے کی داستان بیان کی اور اس میں آنحضرتؐ نے لفظ "بداللہ" استعمال کیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ مرقوم ہیں:

۱۔ کتاب توحید شیخ صدوق، ص ۲۳۲۔۲۳۶۔ تصحیح الاعتقاد شیخ مفید ص ۲۴۔ عدۃ الاصول جلد ۲ ص ۲۹۔ کتاب الغیبۃ ص ۲۶۲۔۲۶۴ طبع نجف

اَنَّهُ سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ اَنّ ثلاثةً فی بَنِی اِسرائِیل: اَبْرَصُ وَاَقْرَعُ وَاَعْمٰی بَدَااللّٰهِ اَنْ یَبْتَلِیَهُمْ... (۱)

راوی کہتا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ بنی اسرائیل میں تین شخص رہتے تھے۔ ان میں ایک مبروص تھا ایک گنجا تھا اور ایک اندھا تھا اللہ کو ان کے لئے بدا لاحق ہوا کہ وہ انہیں آزمائے۔

اس پوری روایت کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ نے ان تین اشخاص کے پاس اپنے ایک فرشتہ کو بھیجا اس نے ان کی دلجوئی کی اور ان سے ان کی خواہش دریافت کی۔ مبروص نے کہا کہ میرے جسم سے برص کے داغ دور ہو جائیں اور میری جلد خوبصورت ہو جائے۔ فرشتہ نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو وہ تندرست ہو گیا اور فرشتہ نے اسے دس اونٹنیاں دیں۔ پھر وہ گنجے کے پاس گیا اور اس سے اس کی خواہش دریافت کی۔ گنجے نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے سر پر خوبصورت بال آجائیں۔ فرشتہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے سر پر بال اُگ آئے پھر فرشتہ نے اسے ایک گائے دی۔

پھر فرشتہ اندھے کے پاس گیا اور اس سے اس کی خواہش دریافت کی۔ اندھے نے کہا کہ مجھے آنکھیں مل جائیں۔ فرشتہ نے ہاتھ پھیرا تو وہ سب کچھ دیکھنے لگا۔ فرشتے نے اسے کچھ حاملہ بھیڑیں دیں۔

خدا نے ان کے مویشیوں میں برکت ڈالی اور تینوں افراد مالدار بن گئے پھر ایک عرصہ بعد خدا نے فرشتہ کو مبروص کی طرف بھیجا۔ فرشتہ نے اس کے سامنے اپنے آپ کو غریب و مفلس ظاہر کیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ لیکن اس شخص نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ اس کے بعد فرشتہ گنجے کے پاس گیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے بھی کوئی مدد نہ کی۔ آخر میں وہ فرشتہ

۱۔ صحیح بخاری جلد ۴ ص ۱۷۲۔ کتاب انبیاء، حدیث ابرص واقرع واعمیٰ

اندھے کے پاس گیا اور اس نے اس نعمت کی خاطر جو خدا نے اسے عطا کی تھی اس کی مدد کی۔ اس وقت خدا کو بدا لاحق ہوا اور اس نے پہلے دو افراد کو ان کی سابقہ حالت پر لوٹا دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کو ان تین افراد کی ذہنیت وطبیعت کا پہلے سے علم تھا اور کوئی چیز اس سے مخفی نہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پہلے دو افراد کفرانِ نعمت کریں گے اور تیسرا شخص نعمات کا شکر ادا کرے گا۔ اس کے باوجود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ "بدا" استعمال کیا۔ اور آنحضرتؐ کی اِتباع میں علمائے شیعہ بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۵

مقاماتِ اولیا اور غیبی قوتیں

سوال: کیا انبیاء واولیاء عام طاقت سے ہٹ کر خارق العادت امور بھی انجام دے سکتے ہیں؟

جواب: یہ جہان آفرینش اسباب ومسبّبات اور علت ومعلول کا جہان ہے ہر شخص جو بھی کام کرتا ہے وہ خدا کی عطا کردہ قوت سے ہی کرتا ہے۔ اور اگر اس کا رابطہ خدا کی عطا کردہ قوت سے منقطع ہو جائے تو انسان عاجز اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اولیائے الٰہی خارق العادت امور سرانجام دیتے ہیں تو اس کے پیچھے بھی قدرت الٰہی کارفرما ہوتی ہے اور خدا کے اذن واجازت سے ہی انجام پاتے ہیں اور اگر قدرت الٰہی کے سرچشمہ سے ان کا رابطہ نہ رہے تو پھر عام اور خاص قسم کا کوئی بھی کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔

ایسے کام جو عام انسانوں کی رسائی سے بلند ہوتے ہیں یہ کام "ولی" خدا کے روحانی تکامل کا نتیجہ ہوتے ہیں جسے وہ طریق عبودیت اور تعلیمات اسلام پر عمل اور صراط مستقیم پر چلنے کی وجہ سے حاصل کرتا ہے۔(۱)

۱۔ خارق عادت امور کو سرانجام دینے کا ایک طریقہ اور بھی ہے جسے "ریاضت" کہا جاتا ہے لیکن اس کا حاصل کرنا حرام اور ممنوع ہے۔ بعض اوقات غیبی مصلحتوں کے تقاضے کے تحت کسی کو بچپنے میں بھی ایسا کمال دیا جاتا ہے جو کہ دوسروں میں موجود نہیں ہوتا لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ آئینِ اسلام کی نگاہ سے انسان دو طرح کی زندگی بسر کرتا ہے:

۱۔حیات ظاہری　　　۲۔حیات معنوی وانسانی

''حیات ظاہری'' وہی حیاتِ حیوانی ہے جسے تمام انسان بسر کرتے ہیں اور اسلام نے ہر طرح کی افراط وتفریط سے انسان کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک ضابطہ حیات مقرر کیا ہے۔ اسلامی ضوابط جہاں انسان کو مادی دنیا میں آسائش فراہم کرتے ہیں وہاں حیاتِ معنوی کا راستہ بھی ہموار کرتے ہیں۔

انسان کی حیاتِ معنوی اس کے اعمال ونیت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی سعادت وخوش بختی یا اس کی شقاوت وبدبختی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔

اسلامی احکام اور دینی قواعد اگرچہ ظاہری طور پر انفرادی یا اجتماعی اعمال دکھائی دیتے ہیں لیکن واجبات پر عمل اور محرمات کے ترک کرنے سے انسانی روح میں کمالات پیدا ہوتے ہیں جو حواس کے پس پردہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔

ظاہری زندگی (بشرطیکہ اسلامی احکام کے تحت بسر ہوئی ہو) کے بعد ایک زندہ حقیقت موجود ہے اور وہ ایسی معنوی زندگی ہے جو ہر طرح کی خوش بختی کا منبع ہے اور اسی حقیقت کو لفظ ''ولایت'' یا ''قرب الٰہی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جو لوگوں میں مختلف انداز سے پائی جاتی ہے (یعنی کسی میں کم کسی میں زیادہ قرب الٰہی کی منزلیں پائی جاتی ہیں)۔ اور یہی ولایت وقرب الٰہی عجیب وغریب آثار کے سلسلہ کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسلامی احکام صرف دنیاوی زندگی کے لئے مفید ہیں۔ اس طرز تفکر کے حامل افراد اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ ان احکام کی پابندی کا ایک اور نتیجہ بھی ہوتا ہے اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے عملی واجتماعی احکامات کی پابندی سے انسانی روح کو بری عادات وخصائل سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اس سے قربِ معنوی اور کمالِ وجودی پیدا ہوتا ہے۔

عبودیت، خدا کی بندگی اور اخلاصِ عبادت کے سائے میں انسان تکاملِ باطنی کا سفر طے کرتا ہے جس کا اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ سفرِ تکامل جسم و مادہ کی حدود سے باہر ہے اور سیرِ معنوی کرنے والا ہر شخص اپنی حالت کے مطابق کچھ باطنی مقامات حاصل کرتا ہے جن کا مشاہدہ کبھی اس دنیا میں کرتا ہے یا مرنے کے بعد ان مقامات کا اسے مشاہدہ نصیب ہوتا ہے۔

کمال سے کیا مراد ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کمال مطلق اور نامتناہی ہے تو اس سے اس کے علم، قدرت، حیات اور ارادہ جیسی صفاتِ جمال مراد ہوتی ہیں اور جب بندہ راہ اطاعت کا سفر کرنے لگتا ہے تو وہ درجاتِ کمال میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے اور وہ کمال کی سیڑھی سے بلند ہو رہا ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کرنے لگتا ہے اور اس سے اس کے علم، قدرت اور نافذ ہونے والے ارادہ اور حیاتِ جاودانی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس سفر کے تسلسل سے انسان فرشتہ سے بھی بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اور زیادہ کمالات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ دنیا پر تسلط حاصل کرے اور جن کاموں کی انجام دہی سے عام افراد عاجز ہیں وہ ان کاموں کو کر سکے۔ اس خواہش کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ریاضت کرنے والے افراد حرام اور تھکا دینے والی ریاضتوں سے اپنے نفس اور روح کو تقویت فراہم کرتے ہیں اور اس قوت سے عجیب و غریب کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

اس کے برعکس دونوں جہانوں میں سعادت حاصل کرنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے حضور خضوع و خشوع سے بندگی کی جائے اور بندگی کی راہوں کا سفر طے کر کے خدا سے ایسے مقامات حاصل کیے جائیں جن سے تکوین میں تصرف کی قدرت حاصل ہو سکے۔

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں راہ عبودیت پر چلنے والوں اور راہ حق کے سالکوں کے بلند مقامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدٌ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَاِنَّهُ لَیَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّافِلَةِ حَتّٰی اُحِبَّهُ فَاِذَا اَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِی یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِی یُبْصِرُ بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِی یَنْطِقُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِی یَبْطِشُ بِهَا، اِنْ دَعَانِی اَجَبْتُهُ وَاِنْ سَأَلَنِی اَعْطَیْتُهُ۔ (۱)

(کسی بھی بندہ نے کسی کام سے میرا تقرب تلاش نہیں کیا جو مجھے فرائض کی انجام دہی سے زیادہ محبوب ہو۔) میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میری قربت کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ وقت آجاتا ہے جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کی وہ زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتا ہے اور میں اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ حملہ کرتا ہے اور جب وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں اور جب مجھ سے کچھ طلب کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں)''

جب ہم اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو فرائض و نوافل کی ادائیگی سے انسان میں جو کمال پیدا ہوتا ہے وہ کمال ہمیں بخوبی دکھائی دینے لگتا ہے اور اس حالت میں انسان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہوتی ہے کہ انسان قدرتِ الٰہی سے وہ صدائیں سننے لگتا ہے جسے عام آدمی سننے سے قاصر ہوتے ہیں۔ وہ ایسی صورتوں اور اجسام کو دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے جو عام آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر خواہش پوری ہونے لگتی ہے، اس کو ہر حاجت اور ہر مراد حاصل ہونے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اس کا عمل خدا کا عمل قرار پاتا ہے۔

(گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود)

۱۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۳۵۲ طبع دار الکتب الاسلامیہ

اس میں شک نہیں ہے کہ خدا بندے کی آنکھ اور کان بن جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ قدرتِ الٰہی کے زیر سایہ اس کی آنکھیں بہت کچھ دیکھنے لگتی ہیں اور اس کے کان عالمِ غیب کی صدائیں سنتے ہیں اور اس کی قوت وقدرت وسیع تر ہو جاتی ہے۔

آثارِ بندگی اور کمالِ نفسانی

کمالِ نفس کے آثار میں سے ایک اثر یہ ہے کہ حکمِ الٰہی سے اس جہانِ مادی میں تصرف کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ عبادتِ الٰہی کے سائے میں صرف انسان کا اپنا بدن ہی اس کے ارادہ کا فرمانبردار نہیں ہوتا بلکہ یہ جہانِ مادی بھی انسان کا مطیع ہو جاتا ہے اور انسان رب العالمین کے اذن سے تقربِ الٰہی سے حاصل ہونے والی قوت سے جہانِ مادی پر تصرف کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ انسان معجزات وکرامات کے سلسلہ کا مبدا بن جاتا ہے۔ درحقیقت ایسا انسان جہانِ تکوین پر تسلط وتصرف کی قوت پیدا کر لیتا ہے۔

قرآن اور کراماتِ اولیاء

قرآن کریم میں انبیائے کرام کی کچھ کرامات بیان کی گئی ہیں۔ انبیاء نے اذنِ خداوندی کے تحت کمال نفسانی کے ذریعے عالمِ تکوین میں تصرف کیا تھا۔ ذیل میں ہم اس تصرف کے چند نمونے بطور مثال پیش کرتے ہیں:

ا۔ والد کی بینائی کے لئے حضرت یوسفؑ کا تصرف

حضرت یعقوبؑ اپنے فرزند یوسفؑ کی جدائی پر برسہا برس روتے رہے اور آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہو گئی۔ حضرت یوسفؑ نے ایک شخص کے ہاتھ اپنا پیراہن روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ یہ پیراہن انکے والد کے چہرے پر پھیرے اس سے ان کی بینائی لوٹ آئے گی۔

چنانچہ خوش خبری دینے والا آیا اور اس نے حضرت یوسفؑ کے فرمان پر عمل کیا جیسے ہی حضرت یعقوبؑ کے چہرے سے پیراہن لگا تو وہ بینا ہو گئے۔

الفاظ قرآن ملاحظہ فرمائیں:

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ ﴿۹۶﴾ (سورۂ یوسف)

(جب خوش خبری دینے والا آیا تو اس نے یوسف کا پیراہن ان کے چہرے پر ڈالا۔ وہ دوبارہ دیکھنے لگے۔)

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے کہ حقیقی مؤثر ذات خداوندی ہے لیکن اللہ نے یوسفؑ کی خواہش سے ایک ایسا سبب بنایا جس سے یعقوبؑ کی بینائی لوٹ آئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یوسف کو ایک ایسی قوت عطا کی تھی اگر وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تو وہ پوری ہو جاتی تھی۔ حضرت یوسفؑ نے بینائی لوٹانے جیسا مشکل کام انتہائی سادہ طریقہ (باپ کے چہرے پر قمیض پھیرنے) سے انجام دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام خارق العادت امور کو سادہ اور آسان طریقہ سے سرانجام دیتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ انہوں نے یہ معجزہ سائنس اور صنعت کے زور پر دکھایا تھا۔

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے دوستوں کی قدرت نمائی

ہم جانتے ہیں کہ جب ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے پاس آرہی تھی تو آپ نے اس کے آنے سے پہلے اپنے دربار میں موجود لوگوں سے فرمایا:

"... يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ (سورۂ نمل)

(اے درباری سردارو! تم میں سے کون ہے جو اس کے اطاعت گزار بن کر میرے پاس آنے سے پہلے اس کا تخت یہاں میرے پاس لا کر پیش کرے۔)

قوم جنات میں سے ایک فرد نے کہا:

اَنَا اٰتِیۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُوۡمَ مِنۡ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّیۡ عَلَیۡهِ لَقَوِیٌّ اَمِیۡنٌ ﴿۳۹﴾ (سورۂ نمل/۳۹)
میں آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے تخت آپ کے پاس لے آؤں گا۔ میں اس کام کی قوت رکھتا ہوں اور امین ہوں۔

اتنے میں ایک شخص اٹھا، مفسرین جس کا نام ''آصف بن برخیا'' بیان کرتے ہیں جو حضرت سلیمانؑ کا وزیر اور بھانجا تھا۔ اس نے جو گفتگو کی اسے قران کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡكَ طَرۡفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ...(سورۂ نمل/۴۰)
(اس نے کہا جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا (اس کتاب کی حقیقت کیا تھی اس کے متعلق اور مقام پر ہم اپنی معروضات پیش کریں گے) کہ میں اسے آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔ پھر جب اس نے اپنے سامنے تخت کو حاضر دیکھا تو کہا کہ یہ مجھ پر اللہ کی نعمت ہے۔)

ہمیں ان آیات پر غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اتنے طویل فاصلہ سے بلقیس کا تخت سلیمانؑ کے دربار میں لانے جیسے خارق عادت فعل کا سبب اور عامل کیا ہے؟

کیا اس خارق العادت فعل کا عامل براہ راست خدا ہے؟ اور اس نے یہ کام کیا تھا اور آصف بن برخیا کیا صرف نمائشی کردار تھا اور اس کا اس میں کوئی عمل دخل نہ تھا؟

یا پھر یہ کہ باقی ہزاروں کاموں کی طرح سے جنہیں عام لوگ قدرتِ الٰہی سے سرانجام دیتے ہیں یہ کام بھی قدرتِ الٰہی سے آصف بن برخیا نے انجام دیا تھا؟

اس سارے واقعہ کا اہم نکتہ یہ ہے کہ آصف کو یہ قوت قربِ الٰہی کی بدولت نصیب ہوئی تھی اور اس نے اس قوت سے یہ خارق العادت کارنامہ کر دکھایا تھا۔ اس واقعہ کی مذکورہ تینوں آیات اسی دوسرے نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ:

ا۔حضرت سلیمانؑ اہل دربار سے کہہ رہے ہیں کہ تم میں سے کوئی ملکہ سبا کا تخت یہاں حاضر کر سکتا ہے؟ حضرت سلیمان کی اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جانتے تھے کہ میرے دربار میں ایسے افراد موجود ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔

۲۔قومِ جنات کے ایک فرد نے کہا تھا کہ میں بلقیس کا تخت آپ کی مجلس برخاست ہونے سے قبل آپ کے پاس لاسکتا ہوں۔مگر حضرت سلیمانؑ نے اس کو زحمت دینا گوارانہ کیا حالانکہ اس نے یہ الفاظ بھی کہے تھے "وانی علیه لقوی امین"میں اس کام پر پوری قدرت رکھتا ہوں اور امین ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ شخص اور اس کا ارادہ دونوں غیر مؤثر ہوتے تو اس نے اپنے آپ کو "قوی وامین" کے الفاظ سے کیوں تعبیر کیا تھا؟

۳۔دربار میں موجود دوسرے شخص نے کہا کہ میں اسے آپ کی پلک جھپکنے سے بھی پہلے آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ واضح رہے کہ اس مردِ خدا نے اس خارقِ عادت فعل کی نسبت اپنی طرف کر کے کہا تھا"انا اتیك" میں اسے آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

ثابت ہوا کہ اللہ نے اپنے اولیاء کے تصرفاتِ تکوینی کے واقعات بیان کیے ہیں بھلا اس سے زیادہ وہ لوگوں کو کن الفاظ میں سمجھائے کہ معجزات وکرامات کے لئے اولیائے الٰہی کا ارادہ مؤثر ہوتا ہے؟

۴۔اللہ تعالیٰ نے فردِ دوم (آصف بن برخیا) کے محیر العقول فعل کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس کے پاس کتاب کا علم تھا۔اس کے پاس وہ علم تھا جو دوسرے لوگوں کے پاس موجود نہ تھا اور یہ وہ علم ہے جو خدا کے خاص بندوں کے پاس ہوتا ہے اور یہ علم قربِ الٰہی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:"قال الذی عنده علم من الکتاب"جس کے پاس کتاب کا علم تھا،اس نے کہا۔

۳۔ حضرت سلیمان کی قدرت نمائی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سلیمانؑ کے لئے ہوا کو مسخر کیا گیا تھا وہ جدھر چاہتے تھے ہوا انہیں ادھر لے جاتی تھی۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ ہوا کا چلنا نظام تکوین و آفرینش کا حصہ ہے اور اس پر حضرت سلیمانؑ کا حکم چلتا تھا جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے:

"وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ؀" (سورۂ انبیاء/۸۱)

(ہم نے تیز و تند ہوا کو سلیمانؑ کے لئے مسخر کر دیا وہ اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جہاں ہم نے برکت دی ہے اور ہم ہر چیز کے جاننے والے ہیں۔)

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس میں پوری وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہوا کا چلنا اور سمت کا تعین سلیمانؑ کے فرمان سے ہوتا تھا اور ہوا کے چلنے میں سلیمانؑ کا ارادہ کارفرما ہوتا تھا۔ کیونکہ آیت مجیدہ میں "تجری بامرہ" کے الفاظ موجود ہیں۔ یعنی ہوا اس کے حکم سے چلتی تھی۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت (سورۂ سبا/ ۱۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہوا سے سواری کا کام لیا کرتے تھے اور صبح سے ظہر تک ہوا کے ذریعے سے آپ اتنا سفر کرتے تھے جتنا ایک عام انسان ایک مہینہ کے مسلسل سفر سے طے کرتا ہے پھر ظہر سے لے کر رات تک آپ ایک مہینے کی مسافت طے کرتے تھے۔ عام سواریاں جس سفر کو دو ماہ میں طے کرتی تھیں آپ اس مسافت کو صرف ایک دن میں طے کر لیتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ہوا کو خدا نے ہی سلیمانؑ کے لئے مسخر کیا تھا۔ اور "تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ" کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانؑ کے حکم پر چلتی تھی اور آپ کے حکم پر ٹھہرتی تھی اس کی حرکت اور

رُخ کا تعین آپ ہی کیا کرتے تھے، اس میں آپ کا ارادہ نافذ ہوتا تھا۔

حضرت سلیمانؑ سے مربوط آیات کے مطالعہ سے ایک اور نکتہ بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے ہوا کے علاوہ کچھ فطری مظاہر کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا اور آپ بڑی آسانی سے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ مثلاً تانبے کی کان اپنی تمام تر صلابت و سختی کے باوجود فرمان خداوندی سے آپ کے لئے چشمہ کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی اور آپ جیسا چاہتے اس سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

"...وَاَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ..." (سورۂ سبا/۱۲)

(ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ (مائع شکل میں) رواں کر دیا۔)

جِنّات خداوند عالم کی ایک مخلوق ہیں۔ یہ مخلوق عام نگاہوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ خدا نے حضرت سلیمانؑ کے لئے جنات کو بھی تابع کر دیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ ان سے مختلف قسم کے کام لیتے تھے، جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے:

" وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ؕ............ ⑫ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ..." (سورۂ سبا/ ۱۲۔ ۱۳)

(جنوں کا ایک گروہ ان کے سامنے حکم خدا سے کام کرتا تھا.... جو کچھ وہ چاہتے تھے جن انجام دیتے تھے)۔

ان تمام آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنی تسخیر شدہ تمام چیزوں سے یکساں استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ان کے لئے مسخر کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کا ارادہ بے اثر نہیں تھا۔ جب تک سلیمانؑ کا ارادہ نہ ہوتا تو تانبے کی کان مائع شکل اختیار کر کے نہ بہتی اور جنات کام نہ کرتے۔

الغرض یہ تمام کام ولایت تکوینی کی ایک قسم ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر کو اپنے

مقامِ قرب کی وجہ سے وہ مقام ملتا ہے جب طبیعت اور جنات جیسی غیر مرئی موجودات خدا کے حکم کے تحت اس کی تابع ہو جاتی ہیں اور اس کے احاطۂ تصرف سے خارج نہیں ہوتیں۔

۴۔ حضرت مسیحؑ کے تصرفات

قران مجید نے کچھ خارق العادت امور کی حضرت مسیحؑ کی طرف نسبت دی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے یہ کام اپنی باطنی قوت اور اللہ کے اذن سے انجام دیئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تقریر کو نقل کرتے ہوئے فرمایا:

... اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ ... (سورۂ آل عمران/۴۹)

(میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی شکل وصورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں پیدائشی اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرتا ہوں اور میں اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔)

مذکورہ آیت میں حضرت مسیحؑ نے حسب ذیل پانچ امور کی اپنی طرف اضافت کی ہے:

۱۔ مٹی سے پرندہ کا ڈھانچہ بنانا۔

۲۔ پرندہ کے ڈھانچے میں پھونک مارنا اور اس کا زندہ کرنا۔

۳۔ پیدائشی اندھوں کو صحت یاب کرنا۔

۴۔ مبروص افراد کو شفا دینا۔

۵۔ مُردوں کو زندہ کرنا

حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو ان افعال کا فاعل بتایا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے درخواست کی ہو کہ خدا ان امور کو انجام دے۔ اس کی بجائے انہوں نے یہ کہا ہے ''میں یہ کام اذن خداوندی سے انجام دیتا ہوں''۔

ان موارد میں خدا کا اذن کیا ہے؟ کیا ان موارد میں اذن سے مراد لفظی اجازت ہے؟

بطور مسلم ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے باطنی اذن مراد ہے۔ اذن سے یہ مراد ہے کہ خدا نے اپنے بندہ کو اتنا کمال و قدرت اور طاقت دی ہے کہ وہ ان امور کو انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

اس مدّعا پر یہ گواہ ہے بشر صرف غیر عادی امور میں ہی اذنِ خداوندی کا ضرورت مند نہیں ہے بلکہ وہ تمام امور میں اذن خداوندی کا محتاج ہے۔ انسان کا کوئی بھی کام خدا کے اذن کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ تمام موارد میں اذنِ الٰہی فاعل کا قدرت و رحمت خداوندی سے تعلق پیدا کرنے کا نام ہے زیر بحث آیت میں حضرت مسیحؑ نے مذکورہ پانچوں افعال کی نسبت اپنی طرف دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک اور آیت میں معجزات مسیحؑ کی نسبت خود مسیح کی طرف دی ہے جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے۔

...وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي..." (المائدہ/۱۱۰)

(جب تو میرے اذن سے پرندے کی شکل و صورت بناتا تھا اس کے بعد اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ میرے اذن سے پرندہ بن جاتا تھا۔ اور تو پیدائشی اندھوں اور مبروص افراد کو میرے اذن سے شفایاب کرتا تھا اور جب تو میرے اذن سے مُردوں کو زندہ کرتا تھا۔)

خدارا اس آیت مجیدہ کے الفاظ پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ قرآن نے ان امور کا فاعل اور انجام دہندہ کسے قرار دیا ہے؟

اس آیت میں یہ الفاظ ہرگز نہیں ہیں کہ خدا نے فرمایا ہو کہ "میں نے پرندہ پیدا کیا" اور "میں نے شفادی" اور میں نے زندہ کیا" آیت مجیدہ کے الفاظ پر دوبارہ توجہ فرمائیں الفاظ یہ ہیں: اِذْ تَخلُقُ (تو نے پیدا کیا ہے) "وَتُبرِئُ" (تو نے شفا بخشی ہے) "اِذْ تُخرِجُ المَوتیٰ" (تو نے مردوں کو زندہ کیا ہے)۔

بھلا ان الفاظ سے بڑھ کر بھی کسی وضاحت کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

لیکن قرآن کریم اپنے اس ارشاد سے، کہ کوئی شخص کسی نئی چیز کی ایجاد میں آزاد نہیں ہے اور معتزلہ اور دوئی پرستوں کے غلط افکار کورد کرنے کے لئے کہ جو خیال کرتے ہیں کہ بشر صرف اپنی پیدائش کے لئے خدا کا محتاج ہے لیکن اپنے افعال میں کاملاً آزاد اور خدا سے بے نیاز ہے، ان تمام موارد میں حضرت مسیحؑ کو اذنِ الٰہی کا پابند قرار دیتا ہے اور توحید در افعال کے موضوع کو توحید کے مراتب میں شمار کرتا اور اس کی رعایت کرتا ہے۔

ولایت تکوینی اور مسئلہ غلو

جب ولایت کے اختیار اور تصرف کی بات کی جاتی ہے تو کچھ کج فکر افراد یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ باتیں ہادیانِ دین کے متعلق ''غلو'' پر مبنی ہیں حالانکہ اس عقیدہ کا غلو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

''غالی'' وہ ہے جو بندگانِ خدا کو مقامِ عبودیت سے بلند تر خیال کرے اور خدا کے افعال وصفات کا ان کے لئے اِثبات کرے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ نظامِ آفرینش کی تدبیر معصوم ہادیوں کے سپرد ہے اور یہ کہ یہ بزرگوار ''خالق'' وہ رازق ''محیی'' و ''ممیت'' ہیں تو یقیناً یہ غلو ہے۔

غلو کی حقیقت یہ ہے کہ ہم انہیں خدا مانیں یا انہیں خدائی افعال کا مبدا(۱) مانیں جب کہ ولایت تکوینی کے عقیدہ میں غلو کے دونوں اجزا موجود نہیں ہیں۔

کیونکہ انہیں نہ تو کوئی خدا مانتا ہے اور نہ کوئی ان کے لئے الٰہی اعمال وافعال کا اِثبات کرتا ہے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ وہ بزرگوار قربِ الٰہی کے زیر سایہ اذنِ الٰہی سے سرشار ہو کر، جہاں

۱۔ ''خدائی افعال'' سے یہ مراد ہے کہ ہم فاعل کو فعل میں صاحب اختیار و آزاد تصور کریں اور یہ نظریہ رکھیں کہ وہ افعال کی انجام دہی میں کسی کی طاقت کا محتاج نہیں ہے اور اس میں فرق نہیں ہے کہ وہ فعل طبیعی فعل کی صورت میں انجام پائے یا خارق عادت کے طور پر انجام پائے۔

رشد و ہدایت کا موقع ہوتا ہے تو جہانِ آفرینش میں تصرف کرتے ہیں۔

ولایت تکوینی کے عقیدہ اور غلو کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اور ان میں کسی طرح کی کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ جب خدا نے اپنے محبوب بندوں کو ہدایت وارشاد کی مسند پر فائز کیا ہے تو اس کی قدرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی صاحب ولایت عبودیت کی سرحد سے باہر قدم رکھ سکتا ہے۔

فرض کریں ایک شخص اپنے کاروبار میں اپنے فرزند کو اجازت دے کہ وہ اس کے سرمایہ سے تجارت کرے یا ایک شخص کسی کو اپنا وکیل مقرر کر کے اپنا کام کرائے تو اس سے نہ تو باپ کے مقام میں فرق آتا ہے اور نہ ہی موکل کے اختیارات میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

فرزند اور وکیل کا اس معاملہ میں تسلط اور قدرت، باپ اور موکل کے ارادہ اور خواہش پر مبنی ہے اس لئے اس قسم کی قدرت وتسلط ہرگز شرک نہیں ہے بلکہ اس میں شرک کا شائبہ بھی نہیں ہے کبھی خدا نے ایک یا ایک سے زیادہ فرشتوں کو قوت دی کہ وہ قومِ لوط پر سنگباری کریں اور ان کی زمین کو زیروزبر کریں، تو فرشتوں کی اس قدرت پر اعتقاد رکھنے کی وجہ سے نہ تو شرک لازم آتا ہے اور نہ ہی فرشتے خدا کے مثیل قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح اگر خدا اپنے ایک بندے یا بہت سے بندوں کو ایسی قدرت عطا کر دے تو اس کی وجہ سے بھی دامن کبریائی داغدار نہیں ہوتا۔

۵۔ حضرت یوسفؑ اور غیب کی خبریں

حضرت یوسفؑ کا تعلق بلند مرتبہ انبیاء کی جماعت سے ہے۔ قرآن کریم میں ان کے واقعہ کے متعلق پوری سورت موجود ہے۔ آپ نے ایک خواب دیکھا تھا جسے آپ نے خواب اپنے والد ماجد کو سنایا تو جواباً حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

"وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ" (سورۂ یوسف/۶)

اس طرح سے تیرا رب تجھے چن لے گا اور تجھے خوابوں کی تاویل وحقیقت کی تعلیم دے گا

جب اللہ نے حضرت یوسفؑ کو تعلیم دی اور ان پر علم کا دروازہ کھولا تو اس کی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے بہت سے اسرار اور لوگوں کی سرنوشت سے آگاہی حاصل کر لی انہوں نے مصر کی فرماں روائی کے دوران اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا تھا:

" رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ " (سورۂ یوسف/۱۰۱)

پروردگار! تو نے مجھے فرماں روائی عطا کی اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی۔

یوسفؑ نے اس غیبی تعلیم سے سرفراز ہو کر دو ساتھی قیدیوں کے خواب سنے اور انہیں ان کے انجام سے آگاہ کر دیا۔ آپ نے ایک قیدی کو رہائی کی خبر دی اور دوسرے کو سزائے موت کی خبر دی۔ آپ نے جو کچھ کہا تھا وہی کچھ ظہور پذیر ہوا تھا۔

یہ دو قیدی جو حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید گزار رہے تھے انہوں نے آپؑ کو اپنے اپنے خواب سنائے۔ ان میں سے ایک قیدی نے کہا کہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ شراب سازی کے لئے انگوروں کا رس نچوڑ رہا ہوں۔

دوسرے قیدی نے کہا کہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں نے سر پر روٹیاں اٹھا رکھی ہیں اور پرندے آ کر انہیں نوچ رہے ہیں۔

خواب سننے کے بعد حضرت یوسفؑ نے سب سے پہلے انہیں دعوت توحید دی پھر آپ نے خوابوں کی تعبیر یوں بیان فرمائی:

اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ (سورۂ یوسف/۴۱)

تم میں سے ایک بادشاہ کا ساقی بنے گا جب کہ دوسرے کو صلیب پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا مغز نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

یقیناً یہ غیب کی خبر ہے جو یوسفؑ نے دی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہیں رکھا جاسکتا۔ اگرچہ انہوں نے اس آگاہی کے لئے خواب سے استفادہ کیا تھا۔ لیکن خواب سن کر اتنی بڑی خبر دینا ہر خاص وعام کے بس میں نہیں ہے۔ اس طرح کی خبر صرف وہی دے سکتا ہے جس پر خدا کا خصوصی لطف وکرم ہو۔ افراد کی سرنوشت سے آگاہی ایک طرح کی اکتسابی ہے، ذاتی نہیں ہے اور اس آگاہی کے لئے کسی نہ کسی وسیلہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ وسیلہ دل میں الہام بھی ہوسکتا ہے اور فرشتے کی اطلاع بھی ہوسکتی ہے یا خواب اور دوسرے وسائل بھی اس کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ نے صرف قیدیوں کو ہی ان کے مستقبل کی خبر نہیں دی تھی اس کے علاوہ آپ نے مصر میں قحط سالی پیدا ہونے کی پیشین گوئی بھی کی تھی اور اس سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ آپ نے اپنے علم کی وجہ سے مصر کو خوفناک قحط سے بچالیا تھا۔

حاکم مصر نے خواب میں دیکھا کہ سات دبلی پتلی گائیں سات موٹی تازی گایوں کو کھا رہی ہیں۔ اس نے مزید دیکھا کہ سات تر وتازہ خوشے ہیں اور ان کے پہلو میں سات کمزور اور مرجھائے ہوئے خوشے رکھے ہیں۔ شاہِ مصر نے اہل دربار سے اپنے خواب کی تعبیر دریافت کی لیکن جب کوئی بھی شخص اس کی تعبیر بیان نہ کرسکا تو اس نے حضرت یوسفؑ کے وسیع علم سے مدد طلب کی۔ آپ نے شاہ مصر کے خواب کی یہ تعبیر بیان فرمائی۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٧﴾

(تم سات سال تک مسلسل کاشت کاری کروگے پس اپنی ضرورت کے دانے نکالنے کے بعد باقی دانے خوشوں میں رہنے دو۔)

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾

(پھر سات سال سخت آئیں گے وہ اس تمام بچت کو کھا جائیں گے جو تم نے بچا کر رکھی

ہوگی۔ مگر تم تھوڑا سا غلہ بچاؤ گے جسے خرچ کرو گے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿۴۹﴾ (سورۃ یوسف ۴۷۔۴۹)

(پھر ان سات سالوں کے بعد ایک سال آئے گا جس میں بارش کی فراوانی ہوگی اور لوگ قحط سے نجات پائیں گے اور پھلوں کا رس نچوڑیں گے۔)

حضرت یوسفؑ نے شاہِ مصر کے خواب کو اساس بنا کر تین باتوں کی پیشین گوئی کی تھی:

۱۔ سات سال تک خوب بارشیں ہوں گی اور تم خوب غلہ اُگاؤ گے۔

۲۔ بعد ازاں سات سال تک خشک سالی کا راج ہوگا۔

۳۔ پھر پندرہویں برس خوب بارشیں ہوگی اور باغات میں پھل لگیں گے لوگ ان کا رس نچوڑیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے پہلی دو پیشین گوئیوں کے لئے شاہِ مصر کے خواب سے مدد لی تھی لیکن انہوں نے جو تیسری پیشین گوئی کی تھی اس کا نام ونشان شاہِ مصر کے خواب میں نہیں تھا اس کا سرچشمہ الہام الٰہی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

کیا اس روشن آگاہی کے بعد بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ انبیاء کو غیب سے آگاہی نہیں ہوتی؟

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبی خبریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء بنایا اور آپ کو تمام مخلوقات سے اشرف وافضل بنایا۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں بہت سے معجزات دکھائے اور آپ نے بہت سے ایسے واقعات کی پیشین گوئی کی جو پردۂ غیب میں تھے۔ ذیل میں ہم آپ کی چند پیشین گوئیوں کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

۱۔ ایک خارجی کے نصیب کی خبر

آنحضرتؐ ایک مرتبہ غنائم جنگ تقسیم کر رہے تھے۔ ایک شخص نے برہم چہرے کے ساتھ آپؐ کی تقسیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ عدالت کی راہ سے تجاوز نہ کریں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: اگر میں عدالت نہ کروں گا تو پھر کون عدالت کرے گا؟ اگر میں نے عدالت سے کام نہ لیا تو پھر نقصان اٹھانے والا قرار پاؤں گا۔ اس محفل میں حضرت عمر بھی موجود تھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے سزا دوں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اسے جانے دو۔ یہ شخص ایک ایسے گروہ کا سربراہ بنے گا جن کی نمازوں اور روزوں کو دیکھ کر تم اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھنے لگو گے۔ وہ لوگ قران پڑھیں گے لیکن قران ان کے حلق سے اوپر نہیں جائیگا (یعنی ان کے مغز تک قران کا مفہوم نہیں جائے گا۔) وہ لوگ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسا کہ تیر کمان سے نکل جاتا ہے (۱)۔

پھر آنحضرتؐ نے اس کی جماعت کی نشانیاں بیان کیں۔ آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ یہ شخص ''ذوالخویصرہ'' تھا اور یہ خوارج کا سربراہ تھا جن سے حضرت علی نے ''نہروان'' کے مقام پر جنگ کی تھی۔

۲۔ یا علیؑ! بد بخت ترین شخص تم کو شہید کرے گا۔

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اشک بہاتے ہوئے حضرت علیؑ کی طرف رُخ کیا اور فرمایا ''اس مہینہ (ماہ رمضان) میں تیرا خون بہانا حلال سمجھا جائے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو حالتِ نماز میں ہے اور اولین و آخرین کا بد بخت ترین شخص جو کہ سنگدلی میں ناقۂ صالح کے قاتل کے

۱۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ دَعْهُ فَإِنَّ لَهُ أَصْحَاباً يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِمْ وَصِيَامَهُ مَعَ صِيَامِهِمْ، يَقْرَؤُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُونَ مِنَ الْإِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ۔ کتاب ''التاج'' جلد ۵ ص ۲۸۶، کتاب الفتن واضح رہے کہ اس کتاب میں اہل سنت کی صحاح خمسہ کی احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔

مشابہ ہے، تیرے سر پر وار کر رہا ہے اور تیری داڑھی کو تیرے سر کے خون سے رنگین کر رہا ہے (۱)

رسول اکرمؐ نے اس حدیث میں جو مطالب بیان کیے ہیں ان میں سے ہر مطلب کو مستقل غیبی الہام کا نام دیا جاسکتا ہے۔ آپ کی اس حدیث میں حسب ذیل نکات پائے جاتے ہیں:

۱۔ علیؑ کو قتل کیا جائے گا۔

۲۔ آپ کو ماہ رمضان میں حالتِ نماز میں قتل کیا جائے گا۔

۳۔ آپ کو تلوار سے شہید کیا جائے گا اور قاتل آپ کے سر پر وار کرے گا۔

۴۔ آپ کی ریش مبارک سر کے خون سے رنگین ہو جائے گی۔

۵۔ آپ کا قاتل ناقہ صالح کو پے کرنے والے شخص کی طرح سے بدبخت ترین شخص ہوگا۔

۳۔ ابوذرؓ عالمِ تنہائی میں مریں گے۔

غزوہ تبوک کے موقع پر ابوذرؓ لشکر اسلام سے پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے اونٹ کو اٹھانے کی بڑی کوشش کی لیکن اونٹ نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ چنانچہ انہوں نے اونٹ کو چھوڑ دیا اور اپنا سامان اپنی پشت پر لادا اور چل پڑے تاکہ جتنا جلد ممکن ہو لشکر اسلام سے مل جائیں۔

اسلامی لشکر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور لوگ آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے دُور سے دیکھا کہ ایک شخص بھاری سامان اٹھائے آرہا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے انہیں پہچان لیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ دیکھیں کہ یہ شخص جو تنہا آرہا ہے ابوذرؓ ہے۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"رَحِمَ اللهُ اَبَاذَرَ یَمْشِی وَحْدَهُ وَیَمُوتُ وَحْدَهُ وَیُبْعَثُ وَحْدَهُ"

اللہ ابوذرؓ پر رحم کرے اکیلا سفر طے کر رہا ہے۔ وہ عالمِ تنہائی میں مرے گا اور تنہا مبعوث ہوگا۔

۱۔ تاریخ بغداد جلد اول ص ۱۳۵۔ کامل مبرد۔ جلد ۲ ص ۱۳۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۱۔

آنحضرتؐ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ کیونکہ انہوں ''ربذہ'' کے بیابان میں انتہائی مظلومیت کی حالت میں وفات پائی تھی اور آپ کی وفات کے وقت آپ کی بیٹی کے علاوہ اور کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔(۱)

جس وقت عثمانؓ نے ابوذرؓ کو ربذہ بدر کردیا تو وہ اس جبریہ اقامت پر بے آب و گیاہ بیابان میں سخت بیمار ہو گئے اور آخر کار اس وحشتناک مقام پر اس حالت میں کہ ان کے پاس بیوی اور بیٹی کے سوا کوئی نہیں تھا انتقال کر گئے۔

حضرت ابوذرؓ نے حالت احتضار میں اپنی بیوی یا بیٹی سے کہا۔ جب میری تجہیز سے فراغت حاصل کرو تو میرے جنازہ کو راستے پر رکھ دینا اور جب پہلا کاروان گزرے تو ان سے کہنا کہ یہ صحابی رسولؐ ابوذرؓ کا جنازہ ہے، ان کے دفن کرنے میں ہماری مدد کرو۔

چنانچہ بیٹی نے باپ کی وصیت پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر گزری کہ اہل عراق کے ایک قافلہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس قافلہ میں عبداللہ بن مسعود صحابی رسولؐ بھی شامل تھے۔ جب انہوں نے ابوذر کی موت کی خبر سنی تو رونے لگے اور کہا:

"صَدَقَ رَسُولُ اللهِ، تَمْشِي وَحْدَكَ وَتَمُوتُ وَحْدَكَ وَتُحْشَرُ وَحْدَكَ" (۲)

رسول خداؐ نے سچ فرمایا تھا کہ اے ابوذر تو تنہا چل رہا ہے اور عالم تنہائی میں تیری موت واقع ہوگی اور تو تنہا محشور ہوگا۔

۴۔ عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔

حضرت عمار یاسرؓ اسلام کے ایک طاقت ور جوان تھے۔ مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو باقی صحابہ ایک ایک پتھر اٹھا رہے تھے جب کہ عمار کئی پتھر جمع کر کے اٹھا رہے تھے۔ کچھ لوگوں

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۵۲۳

۲۔ طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۲۳۴۔۲۳۲

نے عمار کی سادگی اور اخلاص سے استفادہ کیا اور ان پر زیادہ سے زیادہ بوجھ لادنے لگے۔

عمار دو پتھر اٹھاتے تو کہتے کہ ایک پتھر اپنی طرف سے اٹھا رہا ہوں اور دوسرا پتھر رسول خدا ﷺ کی طرف سے اٹھا رہا ہوں۔

ایک دن رسول خدا ﷺ نے دیکھا کہ عمار پر تین بھاری پتھر لدے ہوئے تھے۔ عمار نے آنحضرت سے لوگوں کا شکوہ کیا اور کہا: یا رسول اللہ: یہ لوگ خود ایک ایک پتھر اٹھاتے ہیں اور مجھ پر تین پتھر لادتے ہیں۔ انہوں نے مجھے وزنی بوجھ سے مار ڈالا ہے۔

رسول خدا ﷺ نے عمار کے ہاتھ کو پکڑا اور ان کی پشت سے غبار صاف کیا اور یہ تاریخی جملہ فرمایا۔ ''یہ لوگ تیرے قاتل نہیں۔ تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا اس وقت تو انہیں حق اور حقیقت کی دعوت دے رہا ہوگا''(۱)

آنحضرتؐ کی یہ غیبی خبر آپ کی نبوت وصداقت کی دلیل ہے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ حضرت عمارؓ نوے برس کی عمر میں جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ہم رکاب تھے۔ معاویہ کے خیر خواہوں نے انہیں شہید کیا تھا۔

آنحضرتؐ کی اس حدیث نے عمار کی زندگی پر ایک عجیب اثر ڈالا تھا اس فرمان کے بعد مسلمان حضرت عمارؓ کو حق کا محور سمجھنے لگے اور جس گروہ کے ساتھ عمار ہوتے تو اس گروہ کو برحق تصور کرتے تھے۔

جب عمارؓ میدان جنگ میں شہید ہوئے تو شامی فوج میں ایک تلاطم سا پیدا ہوا کیونکہ لوگ آنحضرتؐ کا یہ فرمان سن چکے تھے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ وہ انہیں جنت اور اللہ کی دعوت دے رہا ہوگا اور باغی گروہ اسے دوزخ کی دعوت دے رہا ہوگا۔

معاویہ اور عمرو بن عاص کی زہریلی تبلیغات سے جن لوگوں کو حضرت علیؑ کی حقانیت

۱۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ ''لَیْسُوا بِالَّذِیْنَ یَقْتُلُوكَ اِنَّمَا تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِیَةُ'' سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۴۹۷

میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ عمار کی شہادت سے ان کے شکوک دور ہو گئے اور انہیں حضرت علیؑ کی حقانیت کا یقین ہو گیا۔

اس جنگ میں خزیمہ بن ثابت امیر المومنین کے ساتھ تھے لیکن وہ ابھی تک دودلی میں مبتلا تھے جب عمار شہید ہوئے تو وہ اٹھے اور تلوار کھینچ کر شامیوں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔

۵۔ تو اونٹ پر سوار ہو گی اور علی سے جنگ کرے گی

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زوجہ بی بی عائشہ کی طرف رخ کیا اور فرمایا:

حمیرا! مجھے دکھائی دیتا ہے کہ تجھ پر "حَوأب" کے کتے بھونک رہے ہیں اور تو علیؑ سے جنگ کر رہی ہے اور تو اس جنگ میں ظالم ہو گی۔ عائشہ! خبردار ایسا نہ کرنا۔(۱)

۶۔ علی! تو تین گروہوں سے جنگ کرے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت کے تاریک مستقبل سے آگاہ تھے اور آپ کو عہد شکن، ستم گر اور مرتد فرقوں کا علم تھا اور آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا کہ تمہیں ان تین گروہوں سے جنگ کرنا پڑے گی۔ آنحضرتؐ فرماتے تھے:

یا علی علیہ السلام! تقاتل الناکثین والقاسطین والمارقین۔(۲)

علی! تو عہد شکن، ستم گر اور مرتد گروہوں سے جنگ کرے گا۔

انبیاء و اولیاء کے غیبی الہامات پر اس قسم کی مثالیں بہت ہی زیادہ ہیں جن کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔

۱۔ عقد الفرید جلد ۲ ص ۲۸۳۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۹۴۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: یا حُمَیرا کَأنّی بِکِ تَنبَحُکِ کلابُ الحَوأبِ تُقاتِلینَ عَلیاً وَ أنتِ ظالِمَۃٌ۔ یا حُمَیرا إیّاکِ أن تَکُونی أنتِ۔

۲۔ تاریخ بغداد جلد ۸ ص ۳۴۰

فصل سوم

اولیائے الٰہی سے توسل

۱۔اولیائے الٰہی سے ارتباط

۲۔اولیائے الٰہی سے توسل

۳۔غیر اللہ سے مدد مانگنا

۴۔اولیائے الٰہی سے شفاعت کی درخواست کرنا

۵۔کیا خدا کو مقامات اولیاء کی قسم دینا شرک ہے؟

۶۔غیر اللہ کے لیے نذر

۷۔کیا غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے؟

۸۔اولیائے خداوندی کے ایام ولادت وشہادت منانا

۹۔پاکیزہ افراد کی قبور کی زیارت

۱۰۔عورتیں اور زیارت قبور

۱۱۔زیارت قبور کے لئے سفر

۱۲۔قبور پر عمارت کھڑی کرنا

۱۳۔قبور کے قریب عبادت کرنا

۱۴۔عزیزوں کے فراق میں سوگوار ہونا

۱۵۔شہیدوں کے لئے سوگوار ہونا

۱۶۔متبرک مقام کی طرف جنازہ کو منتقل کرنا

مقدمہ

اللہ تعالٰی نے ہر انسان میں ''حسِ تحقیق'' رکھی ہے جو انسان کو کائنات کے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کی ترغیب دیتی ہے۔ اسی طرح سے خدا نے انسان میں ''نیکوکاری کی حس'' ودیعت فرمائی ہے جو اخلاقی اقدار کی ممد و معاون ہوتی ہے۔

خدا نے انسان میں ''حس زیبائی'' رکھی ہے جس سے مختلف ہنر پیدا ہوتے ہیں۔

مذکورہ تین حسوں کے علاوہ خدا نے انسان میں ''حِس مذہبی'' بھی رکھی ہے جو انسان کو غیر محسوس طور پر جہانِ محسوسات سے ماوراء اشیاء کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دشواریوں اور مشکلات کے وقت اس کی پناہ تلاش کرتا ہے۔

چنانچہ حسی اور تجرباتی علوم اور تمام عقلی و استدلالی معرفت کا سرچشمہ پہلی حس یعنی حسِ تحقیق ہے۔ جب کہ اندرونی کشش اور ماورائے احساس چیزوں کے ایسے عرفانی جذبات جو کہ ہر طرح کی دلیل و برہان کے احاطہ سے خارج ہوتے ہیں، ان کا سرچشمہ چوتھی حس یعنی حسِ مذہبی ہے۔

یہ حس مذہبی اس وقت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے جب انسان طبیعی اسباب سے مایوس ہو جاتا ہے اور مادی اسباب و وسائل ناکارہ ہو جاتے ہیں اور علم و تجربہ جواب دے جاتا ہے تو اس وقت انسان اپنے اندر ایک غیبی ندا کا احساس کرتا ہے اور اسے اپنے اندر عالمِ محسوسات کے باہر سے آواز سنائی دیتی ہے اور اسے اپنی طرف جذب کرتی ہے۔

اندر درون من خسته دل، ندانم چیست
که من خموشم و او در فغان و در غوغاست

(مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے خستہ حال دل میں کیا ہے؟ میں خاموش ہوں اور وہ فغان وغوغا میں مصروف ہے۔)

چنانچہ عرفانی جذبات اور نا قابل توصیف روحانی کشش جو کمالِ مطلق کے عشاق کو حاصل ہوتی ہے وہ اسی حِس کی بیداری کا نتیجہ اور اس کی ہدایت کا موقع ہے۔ جب عام افراد کی نگاہیں مادی دنیا کے دیکھنے میں مصروف ہوتی ہیں تو اس وقت عارفین کی نگاہیں دنیائے معنویت کے دیدار میں مصروف ہوتی ہیں۔

اولیائے الٰہی اور عارفین دراصل جمال مطلق اور کمال مطلق کا آئینہ ہوتے ہیں ان سے توسل دراصل خدا کی قدرتِ مطلقہ سے توسل ہے۔ یہ آئینہ قدرتِ مطلقہ کا مظہر ہے۔ آئینہ وسیلہ ہوتا ہے مقصود نہیں ہوتا۔

وہابی توسل اولیاء کے قائل نہیں ہیں چنانچہ ان کے طرز تفکر اور باقی موحدین جہان کے طرز تفکر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہابی اس عمل کو نگاہِ مقصود سے دیکھتا ہے اور اسے اصلِ دین کا درجہ دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ شرک کے دام میں پھنس جاتا ہے (اور موحدین کو مشرک کہنے لگتا ہے)۔ اس کے برعکس موحدینِ جہان توسل کو ایک راستے کا درجہ دیتے ہیں اور اس راستے سے متمسک ہو کر وہ خدا سے طلب کر رہے ہوتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نے دنیا طلبی کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک قسم کو قابلِ تعریف بتایا اور دوسری قسم کو لائقِ مذمت قرار دیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے ایک جامع اور پُر مغز جملہ میں اس نکتہ کو یوں بیان کیا:

"مَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَا اَعْمَتْهُ"۔(۱)

جو شخص دنیا کو آئینہ سمجھ کر دیکھتا ہے تو وہ اس کی آنکھوں کو روشن و بینا کر دیتی ہے اور جو

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۸۲

صرف دنیا ہی پر نظر رکھتا ہے تو وہ اسے نابینا بنا دیتی ہے۔ چنانچہ وہابیوں اور باقی موحدین میں بھی "بِھا" اور "اِلَیھا" کا فرق ہے۔ عام موحدین اسے وسیلہ سمجھتے ہیں جب کہ وہابی اسے مقصود قرار دیتے ہیں۔

دنیا عبرت کے حصول کے لئے انتہائی ممدوح ہے کیونکہ وہ حیاتِ اُخروی کا مقدمہ ہے اور اگر کوئی دنیا کو مقصود حیات سمجھ کر اس پر دل لٹادے تو یہ دل کو اندھا کر دیتی ہے۔ (یہی معاملہ اولیائے الٰہی سے توسل کا ہے جو انہیں وسیلہ سمجھ کر خدا کو مقصود قرار دے تو وہ کامیاب ہے اور جو خدا کو چھوڑ کر انہیں مقصود بالذات بنا لے وہ خسارے میں ہے)

عمر بن خطاب کے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور بارشیں رک گئیں تو حضرت عمر نے ہزاروں صحابہ میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس کو ہی بارش کے لئے وسیلہ قرار دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عباس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھتے تھے جب کہ آنحضرتؐ اللہ کے مقرب ترین فرد تھے۔ چنانچہ رسول خدا کے چچا سے توسل ہی خدا سے دعا کی قبولیت کا راستہ تھا اور یہ دامن الٰہی سے توسل کے مساوی تھا۔

HASSAN ALI

۱

اولیائے الٰہی سے ارتباط

سوال: مسلمانوں میں اولیائے الٰہی سے توسل اور طلب شفاعت اور ان سے مدد طلب کرنا جیسے افعال رائج ہیں اور اس کی بنیاد اس بات کو قرار دیا جاتا ہے کہ ہم جو کہ جہان فانی میں زندہ ہیں اور اولیائے الٰہی جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ہمارے اور ان کے درمیان ایک طرح کا رابطہ موجود ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس کی دلیل بیان فرمائیں۔

جواب: ہمارے اور اولیاء الٰہی میں ارتباط کا امکان بلکہ اس کے تحقیق کو جن دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ان دلائل کو سمجھنے کے لئے چند مقدمات کی ضرورت ہے جن کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

HASSAN BOOKS

۱۔ جہانِ آفرینش اور علل و معلومات

جہانِ مادی اسباب و مسبّبات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس پر ''علت و معلول'' کا نظام حکم فرما ہے۔ دنیا میں پایا جانا والا ہر موجود کسی نہ کسی مخصوص سبب کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور پھر وہ موجود کچھ اور موجودات کے وجود کا سبب بنتا ہے۔ اور مسببات میں سبب کی اثر انگیزی خدا کے امر اور اس کی مشیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظام کو پیدا کیا ہے اور موجودات

کے درمیان علت و معلول کا رشتہ قائم کیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ سورج (روشنی دیتا ہے اور) انرجی خارج کرتا ہے۔ چاند نور برساتا ہے اور آگ حرارت پیدا کرتی ہے...... ان مادی علل میں سے ہر ایک جس اثر کو ظاہر کرتا ہے وہ اس میں مؤثر ہے اور ان میں اور ان کے اثرات میں ایک طرح کا ارتباط پایا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر اثر اور مؤثر دونوں خدا کے پیدا کردہ ہیں خدا نے ہی ان موجودات میں مذکورہ اثرات کو پیدا کیا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اللہ اس سبب سے اس کی تاثیر کو سلب کر لیتا ہے۔ مثلاً آگ کا کام جلانا ہے لیکن جب ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو آگ بجھ گئی اور ابراہیم جلنے سے محفوظ رہے۔ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مؤثرِ حقیقی اللہ کا ارادہ ہے۔

اس بیان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہان میں دکھائی دینے والا ہر موجود اگرچہ کسی دوسرے مادی موجود کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کا فعل شمار ہوتا ہے، دراصل وہ اس کا انفرادی فعل نہیں ہوتا وہ خدا کا فعل بھی ہوتا ہے اور ان دو امور میں ہلکا سا تضاد بھی نہیں پایا جاتا اور اس کی وجہ یہ ہے اللہ تعالیٰ ''خودمختار'' مؤثر اور فاعل ''حقیقی'' اور ''خود بنیاد'' ہے جب کہ جہان مادی میں مؤثر دکھائی دینے والا موجود ''غیر مستقل'' ہے اور وہ اپنے وجود و تاثیر کے لئے خدا کا محتاج ہے۔

۲۔ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

قرآن کریم کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ ایک نئی زندگی کا دریچہ ہے اور انسان اس رہگزر کو عبور کرنے کے بعد ایک نئی زندگی اور ایک کامل ترین دنیا میں قدم رکھتا ہے ایک ایسی دنیا جو جہانِ مادہ و طبیعت سے کہیں وسیع تر ہے۔

وہ لوگ جو موت کو انسان کی فنا سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ موت سے ہر چیز ختم ہو جاتی ہے صرف بے جان جسم باقی رہ جاتا ہے اور وہ بھی چند دنوں بعد مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ یقیناً اس طرزِ فکر کے حامل افراد دراصل مادہ پرستی کے فلسفہ کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں۔

الٰہی دانش مند یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان صرف بدن اور چند اعصاب کا مجموعہ نہیں ہے۔اس میں اصل چیز روح اور جان ہے جو کچھ عرصہ تک اس بدن کے ہمراہ رہتی ہے پھر موت کی وجہ سے وہ اس بدنِ مادی سے چلی جاتی ہے اس کے بعد وہ بدنِ لطیف سے تعلق پیدا کرتی ہے۔ موت کے بعد روح کی بقا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ ہم اس کے اثبات کے لئے دلائل پیش کریں۔ کیونکہ قرانی آیات، دقیق فلسفی دلائل اور دور حاضر کے ماہرینِ ارواح کے یقینی تجربات سے انسانی روح و نفس کی بقا ثابت ہوتی ہے۔

ہم یہاں موت کے بعد بقائے روح کے لئے قران کریم کی چند آیات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

۳۔قران اور بقائے ارواح

قرانی آیات وضاحت سے بیان کرتی ہیں کہ موت کے بعد ارواح باقی رہتی ہیں ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے چند آیات کا متن پیش کرتے ہیں اور ان کی بحث کسی اور وقت پر چھوڑتے ہیں:

شہید زندہ ہیں:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝۱۵۴ (سورۃ البقرہ/ ۱۵۴)

(اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے)۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝۱۶۹ (سورۂ آل عمران/ ۱۶۹)

(وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انہیں مردہ تصور نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور

رب کی طرف سے انہیں رزق دیا جاتا ہے۔)

"فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ

...(سورۂ آل عمران/۱۷۰)

ابھی پیوستہ نہیں ہوئے ہیں، وہ ان کے لئے بشارت طلب ہیں۔

"يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ" (سورۂ آل عمران/۱۷۱)

(وہ خدا کی نعمت و فضل پا کر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔)

حضرت مسیحؑ کے نمائندوں کا مددگار زندہ ہے

"اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝۲۵ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷" (سورۂ یسین ۲۵۔۲۷)

شہر کے پرے کنارے سے آنے والے مردِ خدا نے حضرت مسیح کے رسولوں کی تائید ونصرت کی تھی۔ دشمنانِ دین نے اس قتل کر دیا۔ مرنے کے وقت اس نے یہ کہا تھا کہ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں تم لوگ میری بات سنو۔

(چنانچہ اسے شہید کر دیا تو) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا۔ اس نے کہا کہ ہائے کاش میری قوم کو اس بات کا علم ہو جاتا جس کی وجہ سے میرے رب نے میری بخشش کی ہے اور مجھے باعزت لوگوں میں سے قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ جس بہشت میں اسے داخل ہونے کا حکم ملا تھا وہ برزخی بہشت تھی، اُخروی بہشت نہیں تھی۔ کیونکہ خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب تک قیامت قائم نہ ہو جائے اور پلِ صراط سے انسان نہ گزرے اس وقت تک وہ اخروی جنت یا دوزخ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہمارا معروضہ نہیں ہے قرآنی آیات اس مطلب پر گواہی دیتی ہیں۔

قیامت سے قبل آلِ فرعون کو آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

"اَلنَّارُ یُعۡرَضُونَ عَلَیۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَّیَوۡمَ تَقُومُ السَّاعَةُ اَدۡخِلُوۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ" (سورۂ مومن/۴۶)

(آل فرعون کو صبح شام آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔)

یہ آیت مجیدہ گواہی دے رہی ہے کہ قیامت سے قبل آل فرعون کو صبح شام دوزخ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس کے بعد انہیں دوزخ کے سخت ترین عذاب میں داخل کیا جائے گا۔

اگر "یوم تقوم الساعة" کی لفظیں موجود نہ ہوتیں تو مفہوم کھل کر واضح نہ ہوتا۔ آیت مذکورہ بالا پر توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے برزخ کا دورانیہ مراد ہے اور اگر اس سے برزخ کو مراد نہ لیا جائے تو پھر آیت کے جملوں کا تقابل صحیح نہیں رہے گا۔

۴۔ دنیا اور برزخ کا ایک دوسرے سے تعلق۔

انسانوں کی حیات برزخی کے اثبات کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا جہانِ مادی اور جہان برزخ کا آپس میں کوئی رابطہ ہے؟ اور کیا اہل برزخ ہماری باتوں کو سنتے ہیں؟ اور کیا ہمارے اور ان کے درمیان کوئی ارتباط ہے؟

جہانِ موجود اور جہانِ برزخ کے رابطہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ ان دو طرح کی زندگیوں میں بڑا فاصلہ ہے اور ان میں کئی رکاوٹیں ہیں اور ان حائل رکاوٹوں کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی باتیں سننے سے قاصر ہیں۔

قرآنی آیات جہانِ موجود اور جہانِ برزخ کے رابطوں کا انکشاف کرتی ہیں۔ ہم یہاں اس مفہوم کی وضاحت کے لئے چند آیات پیش کرتے ہیں۔ ارواح کے متعلق ہم اہل مغرب کے تجربات سے اس لئے صرفِ نظر کر رہے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ ان کے تجربات قابل اعتماد نہ ہوں۔

چنانچہ ہم اس مسئلہ کو وحی اور روایات پیغمبرؐ سے حل کرنا چاہتے ہیں اور ان آیات کی مدد سے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان دو طرح کی زندگیوں میں ارتباط کی کیا کیفیت ہے؟ قرآنی آیات یہ واضح کرتی ہیں کہ جو لوگ موت کا پل عبور کر کے دوسرے جہان میں پہنچ چکے ہیں ان کا اس جہان سے ابھی تک رابطہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ (اگر بالفرض یہ کلی قاعدہ نہ ہو پھر بھی چند گروہوں کیلئے قطعی طور پر ثابت ہے)۔

ا۔ حضرت صالحؑ اپنی قوم کی ارواح سے گفتگو کرتے ہیں۔

وہ آیات جو یہ گواہی دیتی ہیں کہ انسان کا رابطہ مرنے والوں سے باقی اور برقرار ہے ان میں سورۂ اعراف کی حسب ذیل آیات بھی شامل ہیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت صالح نے اپنی قوم کی اجتماعی بربادی وتباہی کے بعد ان سے گفتگو کی تھی۔ چنانچہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

(انہوں نے ناقہ صالح کو پے کر دیا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ اے صالح! تو ہم سے جس عذاب کا وعدہ کرتا ہے اگر واقعی تو رسول ہے تو ہم پر اس عذاب کو نازل کر دے۔)

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

[(آسمانی چنگھاڑ کے بعد) زلزلہ نے انہیں آلیا وہ اپنے گھروں میں بے جان ہو کر رہ گئے]۔(۱)

"فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ

۱۔ قوم ثمود کی تباہی کے لئے سورہ ہود/ ۶ میں صیحہ آسمانی کا تذکرہ کیا گیا اور سورۂ فصلت/ ۱۷ میں اسے صاعقہ کا نام دیا گیا اور ان آیات میں اسے زلزلہ کے عنوان سے یاد کیا گیا۔

ان آیات میں دراصل کوئی تضاد نہیں ہے اور جمع آیات کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم پر تینوں عذاب بیک وقت نازل ہوئے تھے۔

لَا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ "

(صالح نے ان سے دوری اختیار کر لی اور کہا۔ اے میری قوم! میں نے تو پیغام خدا تم تک پہنچایا تھا اور تمہاری خیر خواہی کی تھی لیکن تم لوگ نصیحت کرنے والوں سے محبت ہی نہیں رکھتے)۔

مذکورہ بالا آیات پر خصوصی توجہ فرمائیں۔

پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے عذاب کا مطالبہ کیا۔

دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور وہ لوگ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

تیسری آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ ان کی ہلاکت و تباہی کے بعد حضرت صالحؑ نے اس قوم سے "یاقَوْمِ" (اے میری قوم) کہہ کر خطاب کیا اور فرمایا کہ میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا لیکن تم نصیحت کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے۔

حضرت صالح نے یہ کلمات ان لوگوں کی تباہی کے بعد میں کہے تھے اور اس کا ثبوت حسب ذیل تین شواہد سے ملتا ہے:

۱۔ قرآنی آیات کی ترتیب اس امر کی گواہی دیتی ہے۔

۲۔ اس سلسلہ کی تیسری آیت لفظ "فَتَوَلّٰی" سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حرف "فا" ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی ان کی نابودی کے بعد حضرت نے ان سے منہ پھیرا اور یہ کہا کہ میں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا......

۳۔ تیسری آیت کا اختتام ان الفاظ پر کیا گیا ہے۔ "ولکن لا تحبون الناصحین" اس میں "لا تحبون" کا لفظ فعل مضارع ہے جو کہ زمانہ حال و مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔ آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ تم نے نصیحت کرنے والوں سے محبت نہیں کی تھی بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ تم نصیحت

کرنے والوں سے محبت نہیں کرتے۔ یعنی مرنے کے بعد بھی تمہاری شقاوت کی انتہاء یہ ہے کہ تم اب بھی نصیحت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتے۔ تمہارا عناد مرنے کے بعد بھی باقی ہے۔

۲۔ حضرت شعیب اپنی قوم کی ارواح سے کلام کرتے ہیں۔

"فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۱" (سورۂ اعراف/۹۱)

(انہیں زلزلہ نے آ پکڑا وہ اپنے گھروں میں ہلاک ہو گئے)

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۲ (سورۂ اعراف/۹۲)

(جس گروہ نے شعیبؑ کی تکذیب کی تھی گویا وہ ان شہروں میں رہے ہی نہ تھے۔ جس گروہ نے اُن کی تکذیب کی، وہ زیاں کار تھے)۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝۹۳ (سورۂ اعراف/۹۳)

(شعیب نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا کہ اے میری قوم! میں نے خدا کے پیغامات تم تک پہنچا دیئے تھے اور میں نے تمہیں نصیحت کی تھی۔ اب میں کافر لوگوں کا غم کیسے کروں)؟

یہاں بھی طریق استدلال وہی ہے جو سابقہ آیات میں کارفرما ہے۔

۳۔ حضرت رسول اکرمؐ ارواحِ انبیاء سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

"وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝۴۵" (سورۂ زخرف/۴۵)

(آپ سابقہ رسولوں سے سوال کریں کہ کیا رحمان کے علاوہ ہم نے کوئی اور معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہو؟)

آیت مجیدہ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ سابقہ انبیاء سے جو کہ دوسرے جہان میں پہنچ چکے تھے رابطہ کر سکتے ہیں اور ان سے یہ مسئلہ پوچھ سکتے ہیں۔لہٰذا جب تک کوئی مضبوط عقلی دلیل اس سوال کے ناممکن ہونے کی گواہی نہ دے اس وقت تک ہمیں آیت کے ظاہری الفاظ سے انحراف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

یہاں تک ہم نے قرانی آیات پیش کیں اب وقت آچکا ہے کہ اس موضوع کو روایات کے دریچہ سے دیکھیں اور اس کے لئے ہم ایک معتبر اور صحیح روایت پر اکتفا کرتے ہیں:

۴۔رسول اکرمؐ مقتولین بدر سے کلام کرتے ہیں۔

جنگ بدر ختم ہوئی تو اس کے نتیجہ میں ستر کفار قریش قتل ہوئے، ستر افراد کو قیدی بنایا گیا اور باقی لوگ بھاگ گئے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ مشرک مقتولین کو وہاں پر موجود ایک کنوئیں میں ڈالا جائے۔آپؐ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔جب مشرکین کے ناپاک لاشے کنوئیں میں ڈال دیئے گئے تو آپ کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے ہوئے اور ایک ایک مقتول کا نام لے کر آپ نے انہیں مخاطب کیا اور فرمایا: اے عتبہ، اے شیبہ، اے امیہ، اے ابوجہل اور کیا تم نے میرے رب کے اس وعدہ کو حق پایا جو تم سے کیا گیا تھا؟ جب کہ میں نے اپنے پروردگار کے وعدہ کو برحق پایا ہے۔اس وقت کچھ مسلمانوں نے آپؐ سے عرض کیا۔یارسول اللہؐ! کیا آپؐ مردوں کو صدائیں دے رہے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو البتہ انہیں جواب دینے کی قدرت نہیں ہے۔ابن ہشام لکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے مقتولین بدر سے فرمایا: تم میرے بہت ہی بُرے رشتہ دار تھے۔تم نے مجھے جھٹلایا جب کہ دوسروں نے میری تصدیق کی۔تم نے مجھے میری جائے پیدائش سے جلاوطن کیا جب کہ دوسروں نے مجھے پناہ دی۔تم نے مجھ سے جنگ کی جب کہ دوسروں نے میری مدد کی۔اب بتاؤ کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچا پایا ہے؟

اس سے بڑھ کر واضح جملہ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول خداؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو البتہ انہیں جواب دینے کی قدرت حاصل نہیں ہے۔

الغرض آنحضرتؐ نے ان کے نام لے لے کر انہیں یوں مخاطب کیا جیسا کہ ایک زندہ انسان دوسرے زندہ انسان کو مخاطب کرتا ہے۔

کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تاریخِ اسلام کے اس مسلّم واقعہ کا یہ کہہ کر انکار کرے کہ یہ بات میری عقل تسلیم نہیں کرتی۔

ہم یہاں اس مکالمہ کا عربی متن نقل کرتے ہیں تا کہ عربی جاننے والے حضرات کو مزید تسلی ہو سکے کہ رسول اکرمؐ کی گفتگو کس قدر واضح اور شفاف ہے۔

فَلَمَّا اَلْقَاهُمْ فِی الْقَلِیْبِ وَقَفَ عَلَیْهِمْ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَقَالَ: یَا اَهْلَ قَلِیبٍ هَلْ وَجَدْتُمْ مَاوَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا فَاِنِّی قَدْ وَجَدْتُ مَاوَعَدَنِی رَبِّی حَقًّا. فَقَالَ لَهُ اَصْحَابُهُ یَارَسُوْلَ اللهِ اَتُكَلِّمُ قَوْمًا مَوتیٰ؟ فَقَالَ لَهُمْ: لَقَدْ عَلِمُوا اَنَّ مَاوَعَدَهُمْ رَبُّهُمْ حَقًّا... (۱)

مذکورہ اصول پر توجہ دینے سے حسب ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ جہان آفرینش علت و معلول کی اساس پر قائم ہے۔

۱۔ پیغمبر اکرم کا کنوئیں میں پڑے ہوئے مشرکین سے کلام کرنا تاریخ و حدیث کا مسلمہ واقعہ ہے۔ اسے بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے۔

چند کتابوں کے حوالے پیش خدمت ہیں:

صحیح بخاری جلد ۵ در واقعہ بدر ص ۹۷۔ ۹۸، ۱۱۰۔،

صحیح مسلم جلد ۴ کتاب جنت ص ۷۷۔

سنن نسائی جلد ۴ ص ۸۹۔ ۹۰۔

مسند امام احمد جلد ۲ ص ۱۳۱۔

سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۶۳۹۔

مغازی واقدی جلد اول غزوہ بدر۔ بحار الانوار جلد ۱۹ ص ۳۴۶۔

۲۔موت سے انسانی زندگی کا اختتام نہیں ہو جاتا۔

۳۔قرآن بقائے ارواح کی گواہی دیتا ہے۔

۴۔ہم زندہ انسانوں اور حیات برزخی بسر کرنے والے اولیائے الٰہی میں ارتباط برقرار ہے۔

جب دوسرے جہان میں موجود اولیائے الٰہی سے رابطہ کا امکان ثابت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد توسل، طلبِ شفاعت اور اولیائے الٰہی سے مدد طلب کرنا جیسے مسائل جو کہ اس اصل کی فرع ہیں خود، بخود ثابت ہو جاتے ہیں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۲

اولیائے الٰہی سے توسل

سوال: کیا اولیائے الٰہی سے توسل صحیح اور شریعت کے مطابق ہے اور کیا قرآن وسنت میں بھی اس کا کہیں جواز موجود ہے؟

جواب: اولیائے الٰہی سے توسل دراصل "وسیلہ" سے تمسک کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ نے اہل ایمان کو وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾" (سورۂ المائدہ/۳۵)

(اے ایمان دارو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)۔

دیکھنا یہ ہے کہ وسیلہ کی تلاش سے کیا مراد ہے؟ آیت مجیدہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خدا کے تقرب اور نزدیکی کا وسیلہ تلاش کرنا مقصود ہے۔ خدا کے تقرب کے لئے بہت سے وسائل ہیں جن میں سے ہم چند وسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ فرائض کی بجا آوری

فرائض کی ادائیگی بارگاہ الٰہی میں تقرب کا وسیلہ ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے

ایک خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا:

إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَوَسَّلَ بِهِ الْمُتَوَسِّلُونَ إِلَى اللهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى الْإِيمَانُ بِهِ وَبِرَسُولِهِ وَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِهِ فَإِنَّهُ ذِرْوَةُ الْإِسْلَامِ ، وَكَلِمَةُ الْإِخْلَاصِ فَإِنَّهَا الْفِطْرَةُ وَإِقَامُ الصَّلٰوةِ فَإِنَّهَا الْمِلَّةُ وَإِيتَاءُ الزَّكٰوةِ فَإِنَّهَا فَرِيضَةٌ وَاجِبَةٌ وَصَوْمُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَإِنَّهُ جُنَّةٌ مِّنَ الْعِقَابِ وَحَجُّ الْبَيْتِ وَ اعْتِمَارُهُ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَيَرْحَضَانِ الذَّنْبَ ۔ وَصِلَةُ الرَّحِمِ فَإِنَّهَا مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ وَمَنْسَاةٌ فِي الْأَجَلِ ۔ وَصَدَقَةُ السِّرِّ فَإِنَّهَا تُكَفِّرُ الْخَطِيئَةَ ۔ وَصَدَقَةُ الْعَلَانِيَةِ فَإِنَّهَا تَدْفَعُ مِيتَةَ السَّوْءِ ۔ وَصَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ فَإِنَّهَا تَقِي مَصَارِعَ الْهَوَانِ "(۱)

ترجمہ: اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈنے والے کے لئے بہترین وسیلہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا ہے اور اس کی راہ میں جہاد کرنا کہ وہ اسلام کی سربلند چوٹی ہے اور کلمہ توحید کہ وہ فطرت کی آواز ہے اور نماز کی پابندی کہ وہ عین دین ہے اور زکوٰۃ ادا کرنا کہ وہ فرض و واجب ہے اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا کہ وہ عذاب کی سپر ہیں اور خانہ کعبہ کا حج و عمرہ بجالانا کہ وہ فقر کو دور کرتے اور گناہوں کو دھو دیتے ہیں اور عزیزوں سے حسن سلوک کرنا کہ وہ مال کی فراوانی اور عمر کی درازی کا سبب ہے اور مخفی طور پر خیرات کرنا کہ وہ گناہوں کا کفارہ ہے اور کھلم کھلا خیرات کرنا کہ وہ بری موت سے بچاتا ہے اور لوگوں پر احسانات کرنا کہ وہ ذلت و رسوائی کے موقع سے بچاتا ہے۔

۲۔ خدا کے اسماء وصفات سے توسل

اللہ کو اسماء وصفات سے یاد کرنا اور پکارنا بھی توسل کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ روایات میں بالعموم اور اہل بیت کی دعاؤں میں بالخصوص اس پر زور دیا گیا ہے ہم اس سلسلہ کی صرف دو احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸

الف۔ ترمذی نے اپنی سنن میں ''بریدہ'' سے نقل کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ بِاَنِّی اَشْھَدُ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ، الْاَحَدُ، الصَّمَدُ، الَّذِی لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لَقَدْ سَأَلْتَ اللّٰہَ بِاسْمِہِ الْاَعْظَمِ الَّذِی اِذَا دُعِیَ بِہٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِہٖ اَعْطیٰ۔''(۱)

(خدایا! میں تجھ سے اپنی اس گواہی کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو وہ خدا ہے کہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور تو احد ہے صمد ہے نہ تو کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا اور تیرا کوئی ہمسر نہیں ہے)

یہ سنا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تو نے خدا کو اس کے اسم اعظم کے واسطہ سے سوال کیا ہے اور جب اس اسم اعظم کے ذریعہ سے اسے پکارا جائے تو وہ جواب دیتا ہے اور جب اس کے وسیلہ سے اس سے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

ب۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ایک دعا منقول ہے جسے ''دعائے سمات'' کہا جاتا ہے۔ اس دعا میں یہ کلمات بھی ہیں:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِاِسْمِکَ الْعَظِیْمِ الْاَعْظَمِ، الْاَعَزِّ الْاَجَلِّ الْاَکْرَمِ الَّذِی اِذَا دُعِیتَ بِہٖ عَلٰی مَغَالِقِ اَبْوَابِ السَّمَاءِ لِلْفَتْحِ بِالرَّحْمَۃِ انْفَتَحَتْ وَاِذَا دُعِیتَ بِہٖ عَلٰی مَضَایِقِ اَبْوَابِ الْاَرْضِ لِلْفَرَجِ انْفَرَجَتْ وَاِذَا دُعِیتَ بِہٖ عَلَی الْعُسْرِ لِلْیُسْرِ تَیَسَّرَتْ۔''(۲)

ترجمہ: خدایا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے عظیم، بزرگ، عزیز، جلیل اور کریم نام کے واسطہ سے کہ اس نام کے ساتھ جب تجھے بلایا جاتا ہے در ہائے آسمانی کے بند ہونے کے بعد

۱۔ سنن ترمذی جلد ۵ ص ۵۱۵ حدیث ۳۴۷۵

۲۔ مصباح المتہجد طوسی ص ۴۱۷

رحمت کے ساتھ کھولنے کے لئے تو دروازے کھل جاتے ہیں اور جب تجھے بلایا جاتا ہے زمین کے دروازوں کے تنگ ہونے کے بعد کشادگی کے لئے تو کشادگی پیدا ہوجاتی ہے اور جب تجھے پکارا جاتا ہے اس کے ذریعے تکلیف کے وقت آسانی کے لئے تو آسانی ہوجاتی ہے۔

دعائے جوشن کبیر اس توسل کا بہترین نمونہ ہے جسے ہم قدر کی راتوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

۳۔ قرآن کریم کے ذریعے سے توسل

توسل کا ایک راستہ یہ ہے کہ انسان قرآن کو پڑھے اور اس کے وسیلہ سے خدا سے اپنی حاجات طلب کرے۔ توسل کی یہ قسم دراصل فعل خدا سے توسل ہے۔ کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے جسے اس نے قلب رسول پر نازل کیا ہے۔

احمد بن حنبل نے عمران بن حصین صحابی سے نقل کیا کہ میں نے رسول خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"اِقْرَؤُا الْقُرْاٰنَ وَاسْأَلُوا اللهَ تَبَارَكَ وَتَعالٰى بِهِ قَبْلَ اَنْ يَجِيئَ قَوْمٌ يَسْأَلُونَ بِهِ النَّاسَ" (۱)

قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے وسیلہ سے اللہ سے سوال کرو اس سے قبل کہ ایسا گروہ آئے جو قرآن کے وسیلہ سے لوگوں سے سوال کرے)۔

مندرجہ بالا حدیث پر تدبر کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ہر اس چیز سے توسل جائز ہے جس کی خدا کے ہاں قدر و منزلت ہو۔ اسی لئے شب ہائے قدر میں مستحب ہے کہ انسان قرآن کو کھول کر یہ دعا پڑھے

"اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ بِكِتَابِكَ الْمُنْزَلِ وَمَافِيهِ، وَفِيهِ اسْمُكَ الْاَكْبَرُ وَاَسْمَاؤُكَ الْحُسْنٰى...." (۲)

۱۔ مسند احمد بن حنبل حدیث ۴۴۵۴

۲۔ ابن طاؤس: اقبال ص ۴۱

(خدایا! میں تجھے تیری ہی بھیجی ہوئی کتاب کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں اور جو کچھ اس میں ہے تجھے اس کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں جب کہ اس میں تیرا اسم اعظم اور تیرے خوبصورت نام موجود ہیں)۔

۴۔ مومن بھائی کی دعا سے توسل حاصل کرنا

مغفرتِ الٰہی کے حصول اور اسبابِ توسل میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان اپنے مومن بھائی سے اپنے حق میں دعا کرائے۔ توسل کی اس قسم پر تمام موحدینِ جہان کا اتفاق پایا جاتا ہے اس کے لئے یہی بات جاننا کافی ہے کہ حاملین عرش فرشتے اہل ایمان کے لئے خدا سے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں: "یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ آمَنُوا"۔ (سورۂ غافر آیت ۷)

صرف فرشتے ہی اہل ایمان کی مغفرت طلب نہیں کرتے ان کے علاوہ مومن اپنے بزرگ اہل ایمان کے لئے بھی مغفرت طلب کرتے ہیں۔

"رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ" (سورۂ حشر ۱۰)

(خدایا ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جنہوں نے ایمان میں ہم سے سبقت کی ہے)۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت اسلامی سے فرمایا تھا کہ میرے حق میں دعا کرو۔ آپ نے فرمایا:

" ثُمَّ سَلُوا (لِیَ) الْوَسِیلَةَ فَاِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِی الْجَنَّةِ لاٰ تَنْبَغِی اَنْ تَکُونَ (اِلَّا) لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللهِ وَاَنَا اَرْجُو اَنْ اَکُونَ اَنَا هُوَ فَمَنْ سَأَلَ لِیَ الْوَسِیلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ"۔ (۱)

(پھر تم میرے لئے "وسیلہ" کی درخواست کرو۔ یہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو

۱۔ مستدرک بحار الانوار جلد ۴ ص ۶۱

بندگانِ خدا میں سے ایک بندہ کونصیب ہوگا اور مجھے امید ہے کہ وہ مجھے ملے گا۔ جو میرے لئے مقام وسیلہ کی درخواست کرے گا تو میری شفاعت اس پر حلال ہوجائے گی)۔

۵۔حیاتِ پیغمبر میں آنحضرت کی دعا سے توسل

اللہ کی تمام مخلوق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریف ترین اور گرامی ترین انسان ہیں۔ قرانی آیات میں آپؐ کے بلند مقامات کی طرف بہت سی آیات اشارہ کرتی ہیں لیکن اس مختصر سی کتاب میں ان کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

آنحضرتؐ کی شان کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ خدا آپ کو دوسرے لوگوں کے لئے عذاب سے محفوظ رکھنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے اور خدا فرماتا ہے کہ جب تک آنحضرتؐ لوگوں میں موجود ہوں گے تب تک ان پر عذاب نازل نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾ (انفال ۳۳)

(جب تک آپ ان میں موجود ہیں خدا انہیں عذاب نہیں دے گا اور جب تک یہ استغفار کرتے رہیں گے تب تک خدا انہیں عذاب نہیں دے گا)۔

آنحضرتؐ کی عظمت کے لئے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ خدا نے ان کے نام کو اپنے نام کے ساتھ شامل کیا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کی طرح سے لازمی قرار دیا۔

"وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧١﴾" (سورۂ احزاب ۷۱)

(جس نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی)۔

الغرض آیات کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں جو مقام آپ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے اور اللہ آپ کے دعا کو رد نہیں کرتا اسی لئے اللہ نے گناہ گاروں کو حکم دیا ہے کہ وہ رسولؐ کے پاس جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ ان کے لئے استغفار

کریں۔اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے استغفار کی درخواست کے لئے پیغمبر کے پاس نہ جانے کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے“ (سورۂ منافقون/ ۵)

" وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ " (سورۂ النساء/۶۴)

(اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں اور آپ کے پاس آئیں اور خدا سے بخشش طلب کریں اور رسولؐ بھی ان کے لئے بخشش طلب کریں تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

کچھ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ امتوں میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے اپنے دور کے نبی سے درخواست کرتے تھے کہ وہ ان کے لئے استغفار کریں۔ چنانچہ فرزندان یعقوبؑ کی جب غلطی آشکار ہوئی تو انہوں نے اپنے والد سے کہا:

يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ (سورۂ یوسف/۹۷، ۹۸)

(ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کے لئے استغفار کریں ہم یقینا خطا کار تھے۔حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت کی درخواست کروں گا بے شک وہ بہت بخشنے والا مہربان ہے)۔

توسل کی اس قسم کے متعلق آج تک کسی مسلمان نے اختلاف نہیں کیا ہے انبیاء کی دعا کی قبولیت کی وجہ خدا کے حضور ان کی قدر و منزلت ہے۔

۶۔آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپ کی دعا سے توسل

سابقہ چار اصول پر توجہ کرنے سے رابطہ کا امکان واضح ہو جاتا ہے۔اور ہم اپنی بحث میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ بزرگ شخصیات جہانِ برزخ میں زندہ ہیں اور ان سے ہمارا رابطہ ممکن ہے۔اسی لئے اگر ہم ان کی زندگی میں ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کریں یا ان کی وفات

کے بعد ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کریں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور قرآن کریم میں نبیؐ سے استغفار کرانے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ حکم آنحضرتؐ کی زندگی تک مخصوص نہیں ہے۔ یہ حکم عام ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴿۶۴﴾ (سورۃ النساء/۶۴)

(اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے آپ کے پاس آئیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کریں اور رسول ان کے لئے استغفار کریں تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

یہ بات مسلم ہے کہ رسول پاک کی دعا کی استجابت کا سبب آنحضرتؐ کی پاکیزہ روح، نفسِ کریم اور ان کا مقامِ تقرب ہے۔ اسی معنوی کرامت کا اثر ہے کہ اللہ آپ کی دعا قبول کرتا ہے کیونکہ محبتِ الٰہی سے سرشار دل سے نکلی ہوئی دعا فوراً قبول ہوتی ہے اور اس حوالے سے آنحضرتؐ کی مادی اور برزخی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔

مذکورہ آیت صرف حیات پیغمبر تک محدود نہیں ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عصر صحابہ اور تابعین سے لے کر آج تک تمام مسلمان اس رحمت کے دروازے کو اپنے لئے کھلا ہوا سمجھتے ہیں اور روضہ مطہر کے زائرین آنحضرتؐ پر درود وسلام پڑھنے کے بعد مذکورہ آیت کو پڑھتے ہیں اور آنحضرتؐ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپؐ ان کے لئے استغفار فرمائیں۔ جب بھی کوئی شخص روضہ مطہر میں داخل ہوتا ہے تو تمام زائرین کو اسی حالت میں پاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپ سے توسل اور دعا کی درخواست کے لئے ہم کتب اہل سنت سے بطور نمونہ چند روایات نقل کرتے ہیں:

۱۔ محی الدین نووی اہل سنت کے عالیقدر محدث گزرے ہیں انہوں نے صحیح مسلم کی

شرح لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

زائر کو چاہیے کہ رسول اکرمؐ کی طرف رُخ کرے اور اپنے لئے ان سے متوسل ہو اور آپؐ کے وسیلے سے خدا کے حضور شفاعت کی درخواست کرے۔

اس سلسلہ کی خوبصورت روایت وہ ہے جسے قاضی ابو الطیب، ماوردی اور ہمارے دوسرے اساتذہ نے عتبی سے نقل کیا ہے۔

عتبی کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول خداؐ کی قبر مطہر کے پاس موجود تھا کہ ایک صحرا نشین عرب آیا اور اس نے کہا:

السلام علیك یارسول الله سمعت الله یقول: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ وقد جئتك مستغفراً من ذنبی مستشفعاً الی ربی"(۱)

(یارسول اللہ! آپ پر سلام ہو میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ کہتے سنا "ولو انهم...

اب میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لئے آپ کے حضور حاضر ہوا ہوں۔ آپ میرے حق میں استغفار کریں)۔

۲۔ صاحب کتاب "مغنی"، ابن قدامہ حنبلی نے 'رسول خداؐ کی زیارت کے آداب اور زیارت رسول مستحب ہے' کے زیر عنوان رسول خداؐ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جو بھی شخص مجھے سلام کرتا ہے میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس کے بعد صاحبِ کتاب نے صحرا نشین عرب کا واقعہ نقل کیا ہے جسے ابھی ہم نے بیان کیا ہے۔ اس واقعہ سے ان کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اس انداز سے آپ کی زیارت مستحب ہے۔

۱۔ نووی، مجموع، شرح مہذب شیرازی و شرح بر صحیح مسلم، جلد ۸ ص ۲۵۶۔ طبع مکتبۃ الارشاد

۳۔ سمہودی نے محمد بن عبداللہ سامری حنبلی کی کتاب ''المستوعب'' سے آنحضرتؐ کی زیارت کی کیفیت اس طرح نقل کی ہے:۔

" السلام علیك یارسول الله، السلام علیك یانبی الله... اللهم انك قلت فی کتابك لنبیك "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ" وانی قداتیت نبیك مستغفرا فاسألك ان توجب لی المغفرة کما او جبتها لمن اتاه فی حیاته اللهم انی اتوجه الیك بنبیك صلی الله علیه وآله وسلم" (۱)

(یارسول اللہؐ! آپ پر سلام ہو۔ یا نبی اللہ! آپ پر درود ہو...... خدایا! تو نے اپنی کتاب میں اپنے نبی سے کہا ہے "ولو انهم اذظلمو انفسهم جآءوك" اب میں استغفار کے لئے تیرے نبی کے حضور حاضر ہوا ہوں۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے بھی اسی طرح سے مغفرت کو واجب فرما جس طرح سے تو نے ان کے لئے مغفرت واجب کی تھی جو آنحضرتؐ کی زندگی میں ان کے پاس آئے تھے۔ خدایا! میں تیرے نبی کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں)۔

۴۔ غزالی (المتوفی ۵۰۵ھ) نے زیارت مدینہ کے فضائل کے باب میں آنحضرتؐ کی زیارت کی کیفیت کو تفصیل سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

درود پاک مکمل کرنے کے بعد قبر مطہر کے سامنے زائر کو کھڑا ہو جانا چاہیے اور خدا کی حمد وثنا کرے اور آنحضرتؐ پر بہ کثرت درود وسلام پڑھے۔ اس کے بعد "ولو انهم..." کی آیت تلاوت کرے اور یہ کہے:

" اللهم اناقدسمعنا قولك واطعنا امرك وقصدنا نبیك مستشفعین به الیك من ذنوبنا وقد اثقل ظهورنا من اوزارنا..." (۲)

۱۔ وفاء الوفاء جلد ۴ ص ۱۳۷۶۔ تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید

۲۔ احیاء العلوم جلد اول ص ۲۵۹ طبع دار المعرفۃ

خدایا! ہم نے تیرا فرمان سنا اور تیرے حکم کی اطاعت کی اور تیرے نبی کے حضور حاضر ہوئے اور ہم انہیں تیری بارگاہ میں اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے شفیع قرار دیتے ہیں چنانچہ ان کے طفیل ہمارے وہ گناہ معاف کردے جنہوں نے ہماری کمر کو جھکا دیا ہے۔

مذکورہ بالا علماء کے علاوہ دیگر اہل سنت علماء نے بھی کیفیت زیارت کو نقل کیا ہے اختصار کے مدنظر ہم ان کے بیانات نقل کرنے سے رک رہے ہیں۔

۷۔ پاکیزہ افراد کی منزلت کا واسطہ دے کر توسل کرنا

اب تک ہم نے حیاتِ رسول اور حیاتِ رسول کے بعد دعائے پیغمبر کے توسل پر بحث کی ہے لیکن توسل کا دامن انتہائی وسیع ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے مطابق انسان اولیائے الٰہی کے وجود پاک کا واسطہ دے کر خدا سے اپنی حاجات طلب کرسکتا ہے اور اولیائے الٰہی کی شخصیت کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دے سکتا ہے، مثلاً یوں کہے: ''خدایا! تجھے تیرے محبوب بندوں کا واسطہ، تجھے تیرے گرامی قدر اولیاء کے قرب و منزلت کا واسطہ اور تجھے رسول خدا اور ان کی آل پاک کا واسطہ''۔

توسل کی یہ قسم نہ صرف مسلمانوں میں رائج ہے بلکہ ایک روایت صحیح جسے ''حدیث ضریر'' کہا جاتا ہے، سے بھی ثابت ہے اور ہمارے مخالفین بھی اس حدیث کی صحت کے قائل ہیں۔ ذیل میں ہم اس حدیث کو نقل کرتے ہیں:

عثمان بن حنیف راوی ہیں:

اِنَّ رَجُلاً ضَریراً اَتَی النَّبِیَّ، فَقَالَ: ادعُ اللهَ اَنْ یُعافِینی؟ فقال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شئتَ دعوتُ وان شئتَ صبرتَ وهو خیر؟

قال: فادْعُه، فامره اَنْ یَتَوضّأَ فیُحسِنَ وضوءَه ویصلّی رکعتین و یدعو بهذا الدعاء: اللّٰهم اِنّی اسئلك واتوجّه الیك بنبیّك محمّد نبی الرحمة، یا محمد

إِنِّي اتوجّه بِكَ إِلَى ربِّي فِي حاجَتِي لِتُقضىٰ، اَللّٰهُمَّ شفّعه فيّ"

فقال ابن حنيف فَوَاللهِ مَا تفرّقنا وَطَالَ بنا الحديثُ حتّى دخلَ علينا كَأَن لم يكن به ضُرّ" (۱)

(عثمان بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے عرض کیا کہ میرے لئے دعا کریں کہ خدا مجھے شفا عطا کرے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اگر تو چاہے تو میں دعا کر دیتا ہوں اور اگر تو صبر کر سکے تو وہ بہتر ہے۔

نابینا نے کہا کہ آپؐ دعا فرمائیں۔

رسول خداؐ نے اس سے فرمایا کہ اچھی طرح سے وضو کر اور دو رکعت نماز ادا کر اور اس کے بعد یہ دعا مانگ:

پروردگار! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے پیغمبر محمدؐ کا تجھے واسطہ دیتا ہوں جو کہ نبی رحمت ہے، اس کے وسیلہ سے میں تیری طرف رخ کرتا ہوں۔

اے محمدؐ! میں نے آپ کے وسیلہ سے اپنے پروردگار کی طرف رخ کیا ہے تا کہ میری حاجت پوری ہو سکے۔ پروردگار! آنجناب کی شفاعت کو میرے حق میں قبول فرما۔

ابن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ہم ابھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے اور ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ بوڑھا شخص ہمارے پاس آیا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ کبھی نابینا نہ تھا'')۔

قارئین کرام! توجہ فرمائیں کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود دعا نہیں کی تھی بلکہ اس شخص کو تعلیم دی کہ وہ آپ کے برجستہ صفات کا خدا کو واسطہ دے اور یوں کہے:

۱۔ سنن ترمذی: جلد ۵ کتاب دعوات باب ۱۱۹ حدیث ۳۵۷۸۔ سنن ابن ماجہ: جلد اول ص ۴۴۱۔ حدیث ۱۳۸۵۔ مسند احمد جلد ۴ ص ۱۳۸

الف: اسئلک بنبیک۔ تیرے نبی کے طفیل تجھ سے سوال کرتا ہوں

ب۔ اتوجہ الیک بنبیک۔ تیرے نبی کے وسیلہ سے تیری بارگاہ میں متوجہ ہوتا ہوں

ج۔ محمد نبی الرحمۃ۔ محمدؐ نبی رحمت کے طفیل

یہ جملے ظاہر کرتے ہیں کہ نابینا نے مظہرِ رحمت وجود پیغمبر کو واسطہ قرار دیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے کچھ قارئین صحت حدیث سے مطمئن ہونے کے خواہش مند ہوں تو ایسے قارئین سے التماس ہے کہ یہ حدیث احادیث صحیحہ میں سے ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے "ھذا حدیث حسن صحیح" یہ حدیث بہتر اور صحیح ہے۔ (۱)

ابن ماجہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے (۲)

یہ حدیث اتنی معتبر اور مستند ہے کہ وہابیوں کے فکری امام ابن تیمیہ نے بھی اس حدیث کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے کتاب "مجموعۃ الرسائل والمسائل" میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں جس ابوجعفر کا ذکر کیا گیا ہے وہ ابوجعفر خطمی ہے اور وہ ثقہ ہے۔ (۳)

رفاعی" دور حاضر کا مشہور وہابی مصنف ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے۔ (۴)

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کا واقعہ خلیفہ ثالث کے دور میں بھی پیش آیا تھا ایک حاجت مند شخص کی مشکلات اس دعا کے توسل سے دور ہوئی تھیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے واقعہ میں آنحضرتؐ نے نابینا کو ان کلمات کی تعلیم دی تھی جب کہ دوسرے واقعہ میں رسول اکرمؐ کے

۱۔ سنن ترمذی، ابواب الادعیہ، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۳۸۔ مستدرک حاکم جلد اول ص ۳۱۳۔ جامع الصغیر ص ۵۹۔ التاج الجامع الاصول جلد اول ص ۸۲۸۶

۲۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۴۴۱۔ انتشارات دار احیاء الکتب العربیہ، ترمذی

۳۔ مجموعۃ الرسائل والمسائل جلد اول ص ۸۱۳

۴۔ التوصل الی حقیقۃ التوسل ص ۱۵۸

بلند مرتبہ صحابی عثمان بن حنیفؓ نے اپنی پاک فطرتوں کے تحت ان کلمات کی تعلیم دی تھی۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عثمان کے دور حکومت میں ایک شخص اپنے کسی کام کے لئے کئی بار خلیفہ کے پاس گیا لیکن خلیفہ نے اس کا کام نہ کیا۔ ایک دن اس نے عثمان بن حنیف کو دیکھا تو اس نے اپنا معاملہ ان کے سامنے بیان کیا۔

عثمان بن حنیف نے کہا کہ جاؤ اچھی طرح سے وضو کرو اور دو رکعت نماز پڑھو پھر یہ کلمات کہو:

"اَللّٰھُمَّ اِنّی اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّنا مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ، یا مُحَمَّدُ اِنّی اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلیٰ رَبِّكَ لِتُقْضیٰ حَاجَتِی"

خدایا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اپنے نبی محمد نبی رحمت کے وسیلہ سے تیری جانب متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد! آپ کے ذریعہ سے آپ کے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ میری حاجت پوری ہو سکے۔

چنانچہ حاجت مند شخص نے یہ عمل انجام دیا اور خلیفہ کے پاس گیا تو اس کی حاجت پوری ہوگئی پھر اس نے عثمان بن حنیف سے ملاقات کی اور ان سے سند دعا دریافت کی۔ ابن حنیف نے جواب دیا کہ ہم رسول خداؐ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک نابینا شخص آیا اور اس نے آپ سے دعا کی درخواست کی پیغمبر اکرمؐ نے اس شخص کو یہی عمل تعلیم کیا تھا جو میں نے تجھے تعلیم کیا ہے۔ (۱)

پاک انسانوں سے توسل کی تاریخ

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اسلام سے پہلے اور نور اسلام کے ظہور کے بعد جب بھی موحد افراد پر کوئی مشکل آتی تھی تو وہ بلند و پاک شخصیتوں سے جو پروردگار کی بارگاہ میں مقام و منزلت

۱۔ معجم طبرانی جلد ۹ ص ۳۰۔۳۱ حدیث ۸۳۱۱۔ واضح رہے کہ ہم پہلی حدیث کے ضمن میں کیفیت استدلال پر بحث کر چکے ہیں لہٰذا یہاں ہم اختصار کر رہے ہیں۔

رکھتے تھے توسل کرتے تھے اور اپنی پاک فطرتوں کے تحت اسے مطلوب و مرغوب عمل سمجھتے تھے۔

ذیل میں ہم بطور نمونہ چند واقعات کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ حضرت عبدالمطلبؑ اور شیر خوار محمد مصطفیٰؐ کا واسطہ

مکہ اور اس کے گردونواح پر خشک سالی چھائی ہوئی تھی۔ حضرت عبدالمطلبؑ نے اپنے شیر خوار پوتے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور خدا سے بارش طلب کی۔ (اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور خوب بارش برسی)۔

حضرت ابوطالبؑ نے اپنے مشہور شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَابیضُ یُستَسقَی الغَمَامُ بِوَجھِہ   ثِمالُ الیتامیٰ عِصمةٌ للارامل (۱)

(محمد نورانی چہرے کا مالک ہے اس کے وسیلہ سے بادل سے بارش طلب کی جاتی ہے۔ وہ یتیموں کی پناہ گاہ ہے اور بیوگان کا مددگار ہے)۔

۲۔ ابوطالبؑ آنحضرتؐ کے ایام جوانی میں ان سے متوسل ہوتے ہیں۔

جس زمانہ میں ابوطالبؑ رئیس قریش تھے تو اس وقت بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش ہوا تھا پورا عرب خشک سالی اور قحط کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ قریش حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور ان سے خشک سالی کی شکایت کی۔ حضرت ابوطالبؑ نے محمد مصطفیٰؐ کا ہاتھ پکڑا۔ اس وقت آپ نوجوان تھے۔ ابوطالبؑ انہیں لے کر خانہ کعبہ تشریف لائے اور ان کی پشت دیوار کعبہ سے لگائی۔ پھر ابوطالبؑ کبھی نوجوان محمد کی طرف دیکھتے اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتے گویا کہہ رہے تھے کہ خدایا! اس جوان کے طفیل باران رحمت نازل فرما۔

۱۔ فتح الباری: ج ۲ ص ۳۹۸: دلائل النبوة: ج ۲ ص ۱۲۶۔

چند لمحات ہی گزرے تھے کہ مکہ اور گردونواح پر بادل چھا گئے اور اتنی بارش ہوئی کہ بیابان، وادیاں اور درے پانی سے بھر گئے۔(۱)

بعض مورخین کہتے ہیں کہ "وابیض یستسقی الغمام لوجهه..." کا قصیدہ ابوطالبؑ نے اس وقت پڑھا تھا۔

۳۔ بچوں اور بزرگوں کے ہمراہ نماز استسقاء

جب خشک سالی چھا جائے تو نماز استسقاء پڑھنی چاہیے، اس نماز کے آداب کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نمازیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ چھوٹے بچوں اور بوڑھوں کو بھی لے جائیں۔(۲)

بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ نماز استسقاء کے وقت چوپایوں کو بھی ساتھ لے جائیں۔ معصوم بچوں، بزرگ بوڑھوں اور بے زبان جانوروں کو لے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ عملی طور پر خدا کے حضور یہ عرض کریں کہ، اے ہمارے پروردگار! اگرچہ ہم رحمت کے قابل نہیں رہے لیکن یہ معصوم بچے یہ بوڑھے اور یہ بے زبان جانور تیری رحمت کے لائق ہیں۔ خدایا! ان کی وجہ سے ہم پر رحم فرما۔

پروردگار! باغبان ایک درخت کے لئے سارے باغ کو پانی پلاتا ہے اور اس درخت کے صدقے عام زمینی جڑی بوٹیاں بھی سیراب ہوجاتی ہیں۔

نماز استسقاء کی یہ کیفیت اس امر کو واضح کرتی ہے کہ تمام ایسی موجودات سے توسل جائز ہے جو حق کی رحمت کی موجب ہوں۔ چنانچہ یہ ایک فطری امر ہے یہ چیز اسلام سے پہلے بھی رائج تھی اور اسلام نے بھی اسے جاری رکھا۔

۱۔ فتح الباری جلد ۶ ص ۴۹۲۔ سیرت حلبی جلد اول ص ۱۱۶

۲۔ کتاب ام: تالیف امام شافعی جلد اول ص ۲۳۔

۴۔ خلیفہ دوم رسول اکرمؐ کے چچا سے متوسل ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری میں مرقوم ہے کہ جب بھی خشک سالی ہوتی تو حضرت عمر بن خطاب رسول اکرمؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کو وسیلہ بنا کر خدا سے بارش طلب کرتے تھے اور وہ اسی موقع پر یہ الفاظ کہتے تھے:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّا کُنّا نَتوسَّلُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّنا فَتَسقِینا وِاِنَّا نَتوسَّلُ اِلَیْكَ بِعَمِّ نَبِیِّنا فَاسْقِنا فَیُسقَون" (۱)

(خدایا! ہم تیرے نبی کے وسیلہ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں سیراب کرتا تھا اور ہم تیرے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر تجھ سے بارش کی درخواست کرتے ہیں۔ ہم پر بارش نازل فرما)

اس روایت کی صحتِ سند میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اہل سنت کا فیصلہ ہے کہ بخاری کی تمام روایات بلحاظ سند صحیح ہیں۔ البتہ اس کی دلالت میں اختلاف ممکن ہے۔

بخاری کی اس روایت کو جب بھی کسی منصف اور غیر متعصب شخص کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ فوراً یہ کہے گا کہ خلیفۂ وقت نے حضرت عباس کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیا تھا تاکہ اس کی وجہ سے خدا دوسروں پر رحم کرے اور باران رحمت کا نزول فرمائے۔

یہاں توسل کا فائدہ یہ ہے کہ پروردگار! اگر ہم نزولِ باران کے مستحق نہیں ہیں لیکن پیغمبر اکرمؐ کے چچا اس نسبت کی وجہ سے تیرے منزلت مزلت و مقام عظیم رکھتے ہیں۔ پروردگار! ان کی خاطر سے رحمت نازل فرما۔

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۳۲ باب صلاۃ الاستقاء

۵۔ فاطمہ بنت اسدؓ کے حق میں پیغمبر کی دعا

طبرانی نے اپنی مشہور کتاب ''معجم طبرانی'' میں انس بن مالک کی سند سے لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسدؓ کی وفات ہوئی تو رسول خدا ان کے سرہانے تشریف لائے اور فرمایا: میری دوسری ماں! خدا آپ پر رحمت نازل فرمائے۔ آپ خود بھوکی رہتی تھیں لیکن مجھے کھانا کھلاتی تھیں۔ خود بے لباس رہتی تھیں مجھے لباس پہناتی تھیں خود روکھی سوکھی کھاتی تھیں لیکن مجھے لذیز غذا کھلاتی تھی اس کام میں رضائے الٰہی کے حصول کے علاوہ آپ کا اور مطمح نظر نہیں تھا۔

پھر آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ تین بار انہیں غسل دیا جائے۔ آپ نے اپنا پیراہن عطا کیا اور فرمایا کہ انہیں میرے پیراہن کا کفن پہناؤ۔ بعد ازاں آنحضرتؐ کے حکم سے ان کے لئے لحد بنائی گئی۔

آنحضرتؐ دفن سے پہلے اس قبر میں خود اترے اور قبر کی خاک کو اپنے ہاتھوں سے باہر نکالا۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد آپ خود قبر میں سو لیٹے اور کہا: خدا ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے۔ وہ زندہ ہے اس پر موت نہیں ہے۔

پھر آپؐ نے یہ کہا:

''...اِغْفِرْ لِأُمِّي فَاطِمَةَ بِنْتَ اَسَدٍ وَلَقِّنْهَا حُجَّتَهَا وَأَوْسِعْ عَلَيْهَا مَدْخَلَهَا بِحَقِّ نَبِيِّكَ وَالْاَنْبِيَاءِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِي فَاِنَّكَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ''

(خدایا! میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما اپنی حجت کی اسے تلقین فرما۔ اس کی قبر کو وسیع فرما۔ تجھے تیرے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے حق کا واسطہ، اس دعا کو قبول فرما۔ بے

شک تو تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے''(۱)

اس حدیث سے حضرت علیؑ کی والدہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خدا کو اس کی پاکیزہ مخلوق کے حق کا واسطہ دے کر سوال کیا جاسکتا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص اس حدیث پر یہ اعتراض کرے کہ اس حدیث کے سلسلہ سند میں ''روح بن صلاح'' شامل ہے اور وہ ضعیف ہے۔

ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حبّان اور حاکم نیشاپوری جیسے علم الرجال کے ماہرین نے اس کی توثیق کی ہے(۲)

ہم یہاں انہی احادیث اہل سنت پر اکتفاء کرتے ہیں حالانکہ اس سلسلہ کی روایات کہیں زیادہ ہیں نیز اس نوعِ توسّل کے متعلق اہل بیتؑ کی روایات امیر المومنینؑ، امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کی دعاؤں میں بہت زیادہ ہیں(۳)

HASAN ALI

۱۔ حلیۃ الاولیاء جلد ۳ ص ۱۲۱۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۰۸۔ استیعاب درحاشیہ الاصابۃ جلد ۴ ص ۳۸۲۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۲ ص ۱۱۸ حدیث ۷۔ مجمع الزوائد ہیثمی جلد ۹ ص ۲۵۶۔ کنز العمال جلد ۱۳ ص ۶۳۶ حدیث ۳۷۶۰۸

۲۔ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۸۵ حدیث ۲۸۰۱

۳۔ صحیفہ علوی: ۵۱، صحیفہ سجادیہ دعا ۴۴۔

توسل کے متعلق سوالات

مسلمان حرمِ پیغمبر یا دوسرے مقامات پر جو اعمال انجام دیتے ہیں ان میں وہابی توسل پر بہت زیادہ اعتراضات کرتے ہیں۔ہم یہاں ان کے اعتراضات کا تجزیہ کرتے ہیں:

سوال ا: کیا مردہ سے دعا کی درخواست اس کی پرستش نہیں ہے؟

وہابی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی زندہ انسان سے جو کسی کی حاجت پوری کرنے کے لائق ہو، دعا کی درخواست کرنا جائز ہے اور یہ پرستش نہیں ہے۔لیکن کسی مردہ سے دعا کی درخواست کہ اس طرح کے عمل پر مرنے والا قدرت نہیں رکھتا۔اس لئے یہ ایک طرح کی پرستش ہے اور جو شخص ایسا عمل کرے وہ مشرکین میں سے قرار پاتا ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جس سے درخواست کی جارہی ہے اس کا مردہ یا زندہ ہونا نہ تو عبادت و پرستش کا معیار ہے اور نہ ہی شرک و توحید کا معیار ہے۔بھلا یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ زندہ شخص سے دعا کی درخواست عین توحید ہو اور اسی دعا کی اگر کسی مرنے والے سے درخواست کی جائے تو وہ عین شرک شمار کی جائے؟!! جب کہ ماہیت عمل ایک ہے اور اگر فرق ہے تو صرف یہی کہ ایک جس سے درخواست کی جارہی ہے وہ زندہ ہے اور دوسرا جس سے درخواست کی جارہی ہے وہ دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔کوئی بھی موحّد موت وحیات کو توحید وشرک کا معیار قرار نہیں دیتا۔ موت وحیات کو زیادہ سے زیادہ اس درخواست کے لئے مؤثر یا غیر مؤثر کہا جاسکتا ہے لیکن اسے

توحید وشرک کا معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔ مرنے والے سے دعا کی درخواست کو شرک قرار دینے والے افراد کا موقف یہ ہے کہ ان کی نظر میں موت سے انبیاء واولیاء کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور وہ اولیائے الٰہی کے لئے برزخی حیات کے قائل نہیں ہیں۔

حالانکہ اس باب کے پہلے سوال کے جواب میں ہم واضح دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ شہداا ور انبیاء واولیا بلکہ مجرمین بھی مرنے کے بعد برزخی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۳۔ کوئی بھی دعوت اور درخواست شرک کا رنگ اس وقت اختیار کرتی ہے جب درخواست کرنے والا جس سے سوال کر رہا ہے اس کو معبود اور خدا تصور کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ تمام امور اس کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔

اب اگر کسی درخواست کرنے والا کا نظریہ یہ ہو تو فریق ثانی خواہ زندہ ہو یا مردہ پھر بھی وہ شخص اس کی پرستش کرنے والا شمار کیا جائے گا اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے دعا کی درخواست اس نیت پر کرے کہ وہ خدا کا مقرب بندہ ہے اور خدا اس کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے تو اس بات کا شرک سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور دنیا کے تمام مسلمان پیغمبر خداؐ کے حضور انہیں اس صفت سے متصف قرار دیتے ہیں۔

سوال ۲: کیا کسی مرنے والے سے دعا کی درخواست کرنا بے فائدہ نہیں ہے؟

بعض افراد یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں وہ توسل تلاش کرنے والے کی درخواست کو قبول کرنے سے قاصر ہیں اس لئے اس سے ہر طرح کا توسل اور دعا کی درخواست لغو اور بے ہودہ اور بے فائدہ عمل ہے۔

جواب: اس سوال کی بنیاد دراصل مادہ پرستی کے فلسفہ پر قائم ہے اور اس طرز فکر کے حامل افراد اولیائے الٰہی کے متعلق موت کو اختتامِ حیات قرار دیتے ہیں اور یہ لوگ برزخی زندگی کے منکر ہیں۔ہم سابقہ صفحات میں اس اصول کو ثابت کر چکے ہیں کہ اولیائے الٰہی مرنے کے بعد دنیاوی حیات سے بھی بہتر تر زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ ہماری باتوں کو سنتے ہیں اور ہمارے اور انکے درمیان رابطہ منقطع نہیں ہوا لہٰذا ان سے دعا کی درخواست کرنا عاقلانہ فعل ہے۔ یہ فعل نہ تو لغو ہے اور نہ ہی بے ہودہ اور باقی رہی یہ بات کہ وہ ہماری درخواست کا مثبت جواب دیتے ہیں یا نہیں تو اس کا دارومدار درخواست دہندہ کی شرائط اور درخواست کے موضوع سے ہے۔

سوال ۳: کیا ہمارے اور دنیا سے رخصت ہونے والوں کے درمیان کوئی رکاوٹ ہے؟

کچھ لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ ہمارے اور دنیا سے رخصت ہوجانے والوں کے درمیان ایک حد فاصل پائی جاتی ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان ارتباط سے مانع ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے:

"وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۝۱۰۰" (سورۂ مومنون)

(ان کے آگے قیامت کے دن تک ایک رکاوٹ موجود ہے)۔

جواب: عربی زبان میں ''برزخ'' رکاوٹ اور مانع کو کہا جاتا ہے۔لیکن یہ مانع اور رکاوٹ نئے سرے سے دنیا میں آباد ہونے سے ہے۔اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ یہ عرصہ ان کے ارتباط سے مانع ہے ہمارے بیان کردہ مفہوم کا ثبوت اس آیت مجیدہ سے ملتا ہے:

"حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ۝۹۹ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا

تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ "(سورۂ مومنون)

[یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت وارد ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے دنیا میں واپس لوٹا دے۔ مجھ سے جو نیکی کے کام چھوٹ گئے تھے میں انہیں بجالاؤں گا (ارشاد ہوتا ہے) ہرگز نہیں۔ یہ تو فقط ایک بات ہے جسے وہ کہہ رہا ہے۔]

مقصد یہ ہے کہ مرنے والا بدکار دنیا میں واپسی کی درخواست کر رہا ہے۔ قرآن اس کے جواب میں یہ کہتا ہے "وَمِنْ وَرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" ان کی اس خواہش کے آگے روز قیامت تک ایک رکاوٹ حائل ہے۔

دونوں آیات ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رکاوٹ کا تعلق دنیا کی واپسی سے ہے۔ اس کا تعلق زندہ اور مردہ کے ارتباط سے نہیں ہے۔

سوال ۴: قرآنی آیت "انک لا تسمع الموتٰی" کا کیا مقصد ہے؟

وہابی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو مُردوں سے تشبیہ دی ہے اور پھر اللہ نے اپنے حبیب سے فرمایا ہے: "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" آپ مُردوں کو اپنی باتیں سنوا نہیں سکتے (سورۂ نمل/۸۰)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾" (سورۂ فاطر/۲۲)

(آپ قبر والوں کو کچھ نہیں سنا سکتے)۔

مشرک کو مُردہ سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ دونوں حسِ سماعت سے محروم ہیں۔ مُردہ سن نہیں سکتے اور مشرک سننا نہیں چاہتا۔

جواب: مشرک اور مردہ کی مشابہت کی وجہ نہ سننا یا قوتِ سماعت سے محروم ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ مشرکین کے پاس قوتِ سماعت موجود تھی۔ ان کے درمیان وجہ شبہ ایک اور چیز ہے اور

وہ فائدہ مند ہونے کی نفی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح سے ایک مردہ کو ایمان اور عملِ صالح کی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس طرح سے مشرکین کو بھی دعوت اسلام سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ کے شاگرد ابن قیم جوزی نے اپنی کتاب ''الروح'' میں ان دونوں آیات کی یہی تشریح کی ہے۔

اب ان چار سوالات کے بعد ہم دعائے اولیاء کی یاد آوری کرنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ شیخ خلیل سہارنپوری نے جواز توسل کے عنوان پر ۷۵ علمائے اہل سنت کے فتاویٰ جمع کیے تھے۔ پھر عبدالرحمن سربازی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا انہوں نے نام رکھا: عقیدہ اہل سنت و جماعت درردوہابیت وبدعت'' یہ کتاب ۱۳۷۰ شمسی ہجری (اہل ایران کا مخصوص کیلنڈر) میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت سیدالمرسلین ﷺ کی قبر مطہر کی زیارت بارگاہ الٰہی میں تقرب کا عظیم ترین ذریعہ ہے اور بہت زیادہ ثواب کا موجب ہے اور بلند درجات کے حصول کا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور اس کا درجہ شرعی فرائض اور واجبات کے قریب ہے اگرچہ اس کے لئے اور سفر کی تکالیف اور جان و مال کو خرچ کرنا ہی کیوں نہ لازم آتا ہو۔ علاوہ ازیں انبیا، اولیا، صالحین، شہداء اور صدیقین سے توسل خواہ ان کی زندگی میں ہو یا ان کی وفات کے بعد ہو جائز ہے۔(۱)

۱۔ عقائد اہل سنت و جماعت درردوہابیت وبدعت ص ۸۶۔ مؤلفہ خلیل احمد سہارن پوری۔

۳

غیر اللہ سے مدد مانگنا

سوال: قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ (ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) لہٰذا غیر اللہ سے مدد مانگنا فرمان خداوندی کے خلاف ہے اس آیت کو ہم روزانہ اپنی نمازوں میں دہراتے ہیں۔

جواب: غیر اللہ سے مدد مانگنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ غیر اللہ خواہ انسان ہو یا کوئی طبیعی عامل ہو، اس اعتقاد سے اس سے مدد مانگی جائے کہ وہ مدد کرنے میں خدا سے بے نیاز ہے اور وہ خود مختار حیثیت سے انسان کی مدد کر سکتا ہے تو ایسی مدد مانگنے کو شرک کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی کو وجود و ہستی یا فعل و کارِ خدا سے بے نیاز سمجھنا دراصل اسے خدا اور معبود ماننے کے مساوی ہے۔ اس عقیدہ کے تحت کسی سے مدد کی درخواست کرنا یقیناً شرک ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی کاشتکار عوامل طبیعی کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ یہ عوامل اذن خداوندی کے بغیر بیج کو شگافتہ کرتے ہیں اور فصل کو پکاتے ہیں تو ایسا شخص یا تو خدا کا منکر ہے یا پھر مشرک ہے۔

۲۔ غیر اللہ سے یہ سمجھ کر مدد طلب کرنا کہ خدا نے اسے مدد کرنے کی قوت و طاقت دی

ہے اور وہ خدا کی عطا کردہ طاقت کی وجہ سے انسان کی مدد کرتا ہے تو اس طرح کی مدد طلب کرنے سے شرک لازم نہیں آتا بلکہ یہ عقیدہ عین توحید ہے۔ کیونکہ جہان مادی اسباب ومسببات کا جہان ہے اور خدا کا فیض اس کے مقرر کردہ اسباب کے ذریعے سے ہی انسان تک پہنچتا ہے۔ سبب صاحبِ اختیار نہیں ہوتا وہ امر الٰہی سے مؤثر بنتا ہے۔

سورہ حمد کی یہ آیت جسے ہم دن رات پڑھتے ہیں یہ آیت استعانت کو خدا کے ساتھ مخصوص کرتی ہے اور یہ حکم دے رہی ہے کہ صرف خدا سے ہی مدد طلب کی جائے جب کہ مشرک اپنے بتوں سے مدد طلب کرتے تھے اور انہیں اس کام میں خود مختار سمجھتے تھے۔ اور اگر مشرکین اپنے بتوں کو خود مختار نہ سمجھتے ہوتے تو پھر انہیں ''الہ'' اور خدا کے ناموں سے کبھی بھی یاد نہ کرتے۔

اگر ہم لفظوں کو بدل دیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ مشرکین اپنے خداؤں کو خدا کی مخلوق مانتے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جہان کے امور بالعموم اور انسانوں کی قسمت بالخصوص ان ہی بتوں کے سپرد ہے اور وہ انہیں فاعلِ مطلق اور جہان کا متصرفِ کل سمجھتے تھے۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں جب ان سے مدد کی درخواست کی جاتی تھی تو وہ شرک اور ان کے خدائی اختیارات کے عقیدہ پر مبنی ہوتی تھی۔

لیکن جب یہ عقیدہ نہ ہو اور انسان جس سے مدد طلب کر رہا ہے اسے ممکن الوجود اور غیر مستقل سمجھتا ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کی مدد اذنِ الٰہی کے ساتھ مشروط ہے تو ایسی درخواست اگرچہ ظاہری حالات میں تو غیر اللہ سے دکھائی دے گی لیکن حقیقت میں یہ خدا سے ہی مدد مانگنا قرار پائے گی کیونکہ اس کے پس منظر میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ خدا نے اس شخص کو قدرت وطاقت دی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی مدد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ حمد میں فرماتا ہے کہ ہمیں صرف خدا سے ہی مدد طلب کرنی چاہیے جب کہ دوسرے مقام پر ہمیں غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

"وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" (سورۂ البقرہ/۴۵)

(صبر اور نماز سے مدد طلب کرو)۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نماز اور صبر کا تعلق انسان کے فعل سے ہے اور ان دونوں کاموں کی ادائیگی سے انسان کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ حضرت ذوالقرنین نے دیوارِ یاجوج و ماجوج بنانے کے وقت لوگوں سے مدد مانگی تھی۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

"مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ" (سورۂ کہف/۹۵)

(ذوالقرنین نے کہا کہ میرے رب نے جو کچھ میرے اختیار میں دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم لوگ اپنی قوت سے میری مدد کرو)۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ" (سورۂ انفال/۷۲)

[(مکہ میں ٹھہرے ہوئے غیر مہاجر مومن) اگر تم سے دین کے تحفظ کے لئے مدد طلب کریں تو ان کی مدد تم پر فرض ہے]۔

چنانچہ یہ آیات ہوں یا دیگر آیات اہل عقل کی روش یہی رہی ہے کہ انسان کا انسان سے مدد مانگنا نہ تو شرک ہے اور نہ ہی غیر اللہ کی پرستش ہے۔ اگر ہم غیر اللہ سے مدد مانگنے کو شرک سے تعبیر کرنے لگیں تو پھر روئے زمین پر ہمیں ایک بھی موحد دکھائی نہیں دے گا۔ اس طرز تفکر کے تحت توحید کے ٹھیکیدار وہابی بھی موحد نہ رہ سکیں گے کیونکہ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی حالات میں اپنے جیسے انسانوں سے مدد طلب کیا کرتے ہیں۔

درحقیقت دنیا کے تمام مسلمان اس بات سے آگاہ ہیں کہ حقیقی ناصر و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

"وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱۲۶﴾" (سورۂ آل عمران)
(مدد تو صرف غالب و حکیم خدا کی طرف سے ہے)۔

اس عقیدہ کے باوجود تمام مسائل زندگی میں انسان ایک دوسرے سے مدد مانگتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اس عمل کو "وایاک نستعین" کی خلاف ورزی نہیں سمجھا جاتا۔

اصل بات یہ ہے کہ "وایاک نستعین" آیت مجیدہ سے مشرکین کی روش کی تردید کی گئی ہے جو اپنے دیوتاؤں سے مدد مانگتے تھے اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے بت اور دیوتا اپنے اعمال وافعال میں خود مختار ہیں اور وہ خدا سے بے نیاز ہیں۔

اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ زندہ انسانوں سے مدد کی درخواست کرنا مفید ہے جب کہ مرے ہوئے افراد سے مدد مانگنا بے سود ہے۔

اس اعتراض کا جواب بڑا ہی واضح ہے کیونکہ موت انسانی زندگی کا اختتام نہیں ہے۔ موت ایک ایسا دروازہ ہے جس سے انسان ایک مرحلہ سے گزر کر دوسرے مرحلہ میں منتقل ہوتا ہے اور قرآن کے بیانات اس امر کے شاہد ہیں کہ انسانوں کا اولیائے الٰہی سے ارتباط قائم ہے اور ان سے اپنے لئے مدد کی درخواست کرنے کی حیثیت دعا کی درخواست کرنے کے مساوی ہے۔ اس موضوع کی تفصیل بحث توسل کے زیر عنوان پیش کی جا چکی ہے لہٰذا اولیائے الٰہی سے مدد کی درخواست اگر مناسب شرائط کے ساتھ ہو تو وہ مستجاب اور نتیجہ بخش ثابت ہوتی ہے۔

۴

اولیائے الٰہی سے شفاعت کی درخواست

سوال: کیا اولیاء سے شفاعت کی درخواست موجب شرک نہیں ہے اور کیا یہ ان کی عبادت کرنے کے مترادف نہیں ہے؟

جواب: قیامت کے دن اولیائے الٰہی کی شفاعت کا عقیدہ ایک مسلم الثبوت عقیدہ ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اسلامی فرقے انبیاء کی شفاعت اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء کی شفاعت پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ البتہ آٹھویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ اور بارہویں صدی کے نصف میں محمد بن عبدالوہاب نے یہ اختلاف پیدا کیا کہ کیا وہ شفیع جن کی شفاعت کتاب وسنت سے ثابت ہے، ان سے شفاعت کی درخواست کی جاسکتی ہے یا نہیں اور کیا یہ کہنا درست ہے "اے محبوب خدا! قیامت کے دن آپ میری شفاعت فرمائیں"؟(۱)

تمام علمائے دین اس امر پر متفق ہیں کہ جن بزرگواروں کو خدا نے حق شفاعت دیا ہے ان سے اس طرح کی درخواست کرنا صحیح ہے۔ جب کہ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوھاب کا یہ نظریہ ہے کہ اس جہان میں رہ کر اُن بزرگوار شخصیات سے اپنی شفاعت کی درخواست کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کی بجائے خدا سے درخواست کرنی چاہیے کہ خدایا! پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرا شفیع قرار دے۔

۱۔ مثلاً یہ جملہ "یا وجیهاً عند الله اشفع لنا عند الله"

آیئے کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کریں تا کہ حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹایا جاسکے۔

درخواست شفاعت کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت رسول مقبولؐ اور دیگر سچے شفاعت کنندگان کی قیامت کے دن شفاعت کا یہ مطلب ہے کہ وہ امت کے گناہ گاروں کی بخشش کی درخواست کریں گے اور ان سے شفاعت کی دعا اس لئے کی جاتی ہے کہ خدا کے نزدیک ایک مقام رکھتے ہیں اور ان کی دُعا ہدف اجابت تک جلد پہنچتی ہے، اس کے نتیجے میں گناہ گار خدا کی مغفرت پالیتا ہے۔ علاوہ ازاین برادر مومن سے دعا کی درخواست اور اس سے بڑھ کر نبی اکرمؐ سے درخواست کرنے میں معمولی سا اشکال بھی نہیں ہے کہ اگر ہم کہیں: اے وہ ذات جسے خدا کے ہاں مقام حاصل ہے آپ خدا کے حضور ہماری شفاعت کریں۔ یعنی آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے گناہ معاف کردے یا ہماری حاجات پوری کرے۔

اصولی طور پر حدیث وتفسیر کی کتابوں میں لفظ ''استشفاع'' طلبِ شفاعت کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اہل سنت کے امام الحدیث محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح بخاری میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے:

''اذا استَشفَعُو اِلَى الامامِ لِيَستَسقِي لَهُم لَم يَرُدَّهُم'' جب لوگ قحط کے زمانہ میں اپنے پیشوا سے طلب باراں کی دعا کا مطالبہ کریں تو پیشوا کو چاہیئے کہ ان کی درخواست رد نہ کرے۔

شفاعت کی درخواست کا مفہوم دعا کی درخواست کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور مذکورہ باب کا مفہوم بھی یہی ہے۔ مومن سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرانا انتہائی پسندیدہ امر ہے۔ پھر نجانے انبیاء واولیاء سے اس درخواست کا کیا مقام ہوگا؟!!

علاوہ ازیں صحابہ کرام آنحضرتؐ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد آنحضرتؐ سے شفاعت کی درخواست کرتے تھے۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔حدیث انس بن مالک

ابوعیسیٰ ترمذی سنن اربعہ میں سے ایک کے مؤلف ہیں۔انہوں نے انس بن مالک سے یہ روایت نقل کی ہے:

سألتُ النبیّ آن یشْفَع لی یوم القیامة. فقالَ: انا فاعِل، قلتُ: فاین اطلُبك؟ فقال: علی الصِّراطِ (۱)

(انس کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں۔ آپ نے میری درخواست قبول کی اور فرمایا کہ میں ایسا ہی کروں گا میں نے رسول خدا سے عرض کیا کہ قیامت کے دن میں آپ کو کہاں تلاش کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے صراط کے پاس تلاش کرنا)۔

انس نے الہام فطرت کے تحت آنحضرتؐ سے شفاعت کی درخواست کی اور اس درخواست کا مقصد دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔انس نے آپؐ سے شفاعت طلب کی اور رسول خداؐ نے بھی اسے مُثبت جواب دیا اور شفاعت کی درخواست کو شرک تصوّر نہیں کیا اور اسے یہ درخواست کرنے سے نہیں روکا۔

۲۔سواد بن قارب کی حدیث

سواد بن قارب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی تھے۔انہوں نے رسول خداؐ کی شان میں کچھ اشعار پڑھے،آپ سے شفاعت کی درخواست کی اور اپنے ایک شعر میں کہا:

وکن لی شفیعاً یوم لاذو شفاعة
بمغن فتیلا عن سواد بن قارب (۲)

۱۔سنن ترمذی جلد ۴ ص ۶۲۱ حدیث ۲۴۳۳

۲۔اصابہ ابن حجر جلد ۲ ص ۹۵۔شمارہ ترجمہ ۳۵۸۳۔یہ درخواست چھ طرق سے نقل کی گئی ہے۔

(اے عالی قدر پیغمبر! قیامت کے دن میرے شفیع بننا۔ جس دن سواد بن قارب کو کسی دوسرے کی شفاعت ذرہ برابر فائدہ نہ دے گی)۔

۳۔ حدیث ابوبکر

جب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ کے جسد اطہر کو ایک کپڑے سے ڈھانپ کر اس انتظار میں رکھ دیا گیا کہ مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مراسم تجہیز و غسل و کفن و دفن کے لئے مسجد میں جمع ہوں گے۔ اس وقت حضرت ابوبکر پیغمبر اکرمؐ کے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور اپنے آپ کو آنحضرتؐ کے جسد مبارک پر گرایا آنجنابؐ کو بوسہ دیا اور یہ الفاظ کہے:

"بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي طِبْتَ حَيّاً وَ مَيِّتاً، اُذْكُرْنا يا مُحَمَّد عِنْدَ رَبِّكَ وَلْنَكُنْ مِنْ بالِكَ"۔ (میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ زندگی میں بھی طیب و طاہر تھے اور موت کے بعد بھی آپ طیب و طاہر ہیں۔ اے محمدؐ! ہمیں اپنے خدا کے حضور یاد کرنا اور ہمیں فراموش نہ کر دینا)۔ (۱)

"اذکرنا عند ربک" کا جملہ درخواست شفاعت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

۴۔ حدیث علیؑ

محدثین لکھتے ہیں کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو حضرت علیؑ نے آپ کو غسل دیا اور غسل کے وقت آپ نے یہ جملے کہے:

"بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي اُذْكُرْنا عِنْدَ رَبِّكَ وَ اجْعَلْنا مِنْ بالِكَ"۔ (۲)

(میرے ماں باپ آپ پر قربان، اپنے رب کے ہاں، ہمیں یاد رکھیے اور ہمارا خیال رکھیے گا)۔

۱۔ سیرت حلبی جلد ۳/ ۴۷۴ طبع دار المعرفہ بیروت

۲۔ مجالس مفید، مجلس ۱۲ ص ۱۰۳، نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۵ طبع بیروت نہج البلاغہ طبع لاہور خطبہ ۲۳۲۔

۵۔ نوجوان کی حدیث

مصعب بن اسلمی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے خاندان کا ایک نوجوان رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں۔

آنحضرت نے فرمایا: بیان کرو۔

نوجوان نے کہا: "اَسْاَلُكَ اَنْ تَجْعَلَنِي مِمَّنْ تَشْفَعُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" میری درخواست یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کو جن لوگوں کی شفاعت کرنا ہے مجھے بھی ان میں شامل کیجئے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تجھے اس کام کی کس نے رہنمائی کی ہے؟

نوجوان نے کہا کہ کسی نے مجھے اس کی ترغیب نہیں دی میں نے خود یہ بات سوچی ہے۔

"رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن تیری شفاعت کروں گا۔(۱)

کتب حدیث میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جنہیں نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

شفاعت اولیاء کے متعلق ایک سوال

عام طور پر ایک سوال کیا جاتا ہے کہ صاحبانِ شفاعت اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور وہ آپ کی آواز نہیں سنتے لہٰذا ان سے شفاعت کی درخواست کرنا بے سود ہے۔

اس سوال کا جواب ہم اس سے قبل توسل کے باب میں دے چکے ہیں، یہاں ہم اجمالی طور پر کچھ گذارشات پیش کرتے ہیں۔

سائل کے تصورات کے برعکس شفیع حضرات واقعی زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان روزانہ اپنی نماز میں رسول خدا کو خطاب کر کے انہیں سلام کرتے ہیں اور اپنی نماز میں یہ

۱۔ مجمع الزوائد جلد ۱۰/ ۳۶۹

کہتے ہیں: "السلامُ علیك ایّھا النبیّ ورحمۃُ اللہ وبرکاتُہ"۔ (اگر نبی مردہ ہوتے تو انہیں مخاطب کر کے سلام کیوں کیا جاتا؟)

دوسری بات یہ ہے کہ شہداء کا زندہ اور سننے والا ہونے کے لئے قرآن کریم کی نص قطعی موجود ہے۔(۱) چنانچہ یقینی طور پر شہدا کے پیغمبرؐ اور ان کے امام بدرجۂ اتم زندہ اور سننے والے ہیں۔

اس مسئلہ کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

یقیناً اس طرح کے سوالات کرنے والے حقیقی شافعین کو مشرکین کے فعل اور ان کی طرف سے بتوں سے طلبِ شفاعت کی مانند سمجھ کر یہ اعتراضات کرتے ہیں جب کہ اللہ نے مشرکین کے فعل پر تنقید کی ہے اور فرمایا ہے:

" وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط " (سورۂ یونس/۱۸)

(وہ خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ تو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی فائدہ دے سکتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ معبود خدا کے ہاں ہمارے شفاعت کنندہ ہیں)۔

(وہابی بھی عام مسلمانوں کو اس آیت کا مصداق قرار دیتے ہیں)۔ اس کا جواب یہ ہے۔

ا۔ پیغمبر اکرمؐ سے شفاعت کی درخواست کرنا اور مشرکین کی طرف سے بتوں سے شفاعت کی درخواست کرنے میں واضح کا فرق ہے۔

مشرکین اپنے بتوں کو اپنے خدا قرار دیتے تھے اور انہیں مالکِ شفاعت سمجھتے تھے اسی لئے وہ ان سے شفاعت طلب کرتے تھے اور وہ انہیں اپنے لئے مکمل اختیارات کا مالک سمجھتے تھے۔

ا۔ سورہ البقرہ آیت ۱۵۴۔ سورہ آل عمران آیت ۱۶۹

اسی لئے قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اذن الٰہی کے بغیر کوئی بھی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (سورۂ البقرہ/۲۵۵)

(خدا کی اجازت کے بغیر کون اس کے ہاں شفاعت کر سکتا ہے)؟

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو صاحب شفاعت سمجھتے تھے اور انہیں شفاعت کے لئے کامل الاختیار قرار دیتے تھے اس کے برعکس موحد مسلمان انبیاء واولیاء کو خدا کے بندے تصور کرتے ہیں انہیں مالک شفاعت نہیں سمجھتے اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے خالص بندوں کی شفاعت اذن الٰہی سے مشروط ہے اتنے بڑے فرق کی موجودگی میں مسلمانوں کے عقیدۂ شفاعت کو مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کے مساوی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

۲۔ مشرکین اپنے بتوں کے لئے دو کام انجام دیتے تھے جسے مذکورہ آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

ا۔ اپنے بتوں کو خدا قرار دیتے تھے "ویعبدون من دون اللہ"

۲۔ مشرکین اپنے بتوں کو اپنا شفیع قرار دیتے تھے۔ "ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا" ان کے مشرک ہونے کی اساس بت پرستی تھی نہ کہ عقیدہ شفاعت۔ اگر شفاعت کی درخواست کو شرک قرار دیا جائے تو اس کی وجہ بھی بتوں کی الوہیت کا عقیدہ ہی ہو سکتا ہے۔ صرف طلب شفاعت کی وجہ سے انہیں مشرک نہیں قرار دیا گیا۔

۵

کیا خدا کو مقام اولیاء کی قسم دینا شرک نہیں ہے؟

سوال: کچھ لوگ انبیاء و اولیاء کے مقام کو مدنظر رکھ کر خدا کو ان کے مقام کا واسطہ دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ خدایا! تجھے رسولِ اعظم کے حق کا واسطہ، میرے فلاں بیمار کو شفا عطا فرما۔ اللہ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے لہٰذا خدا کو ان کے حق کا واسطہ دینا بے سود ہے۔

جواب: ''حق'' سے مراد ان کی وہ منزلت اور وہ مقام ہے جو انہیں خدا کے ہاں حاصل ہے۔ لہٰذا اگر ہم اس منزلت کو ''حق'' سے تعبیر کریں تو یہ وہ حق ہے جو خدا نے انہیں عطا کیا ہے اور یہ مطلب عینِ توحید ہے خداوندِ عالم نے کچھ مقامات پر بندہ کو صاحبِ حق اور خود کو اس کا مقروض ظاہر کیا ہے مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:

"كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٧﴾" (سورۂ روم / ۴۷)

(اہل ایمان کی مدد ہم پر حق ہے)۔

حدیث نبوی میں یہ الفاظ وارد ہیں:

"حَقٌّ عَلَى اللهِ عَونُ مَنْ نَكَحَ الْتِمَاسَ الْعِفَافِ عَمَّا حَرَّمَ اللهُ" (۱)

(اللہ پر حق ہے کہ جو شخص اپنی عفت کی حفاظت کی خاطر نکاح کرنے کا خواہش مند ہو تو

۱۔ جامع الصغیر سیوطی ص ۳۳

HASSANAIN BOOKS

اللہ اس کی مدد کرے)۔

آیات و روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے اس طرح کے خدا پر حقوق کا تذکرہ کتاب و سنت میں عام ہے۔

یہ بات درست ہے کہ ذاتی طور پر کسی بندے کا خدا پر کوئی حق نہیں ہے لیکن کچھ بندوں کا خدا نے از روئے لطف و کرم صاحبِ حق کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔ حد یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں سے قرضِ حسنہ بھی طلب کیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا" (سورۂ حدید/۱۱)

(کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دے)؟

اس سے قبل ہم توسل کی بحث میں ایک نابینا کی حدیث پیش کر چکے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اسے یہ کلمات تعلیم فرمائے تھے:

"اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ"

اس جملہ میں لفظ "بنبیك" دو سابقہ افعال سے متعلق ہے اور وہ ہیں

۱۔"اسألک" ۲۔"اتوجه الیک" اور جملہ کا معنی یہ ہے کہ خدایا! میں تجھ سے تیرے نبی محمد نبی رحمت کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے حضور متوجہ ہوتا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسدؓ کے دفن کے وقت یہ دعا پڑھی تھی:

" اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمِّي فَاطِمَةَ بِنْتِ أَسَدٍ وَوَسِّعْ عَلَيْهَا مَدْخَلَهَا بِحَقِّ نَبِيِّكَ وَالْأَنْبِيَاءِ الَّذِي مِنْ قَبْلِي" (۱)

(خدایا! میری والدہ فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما اور ان کی جگہ کو ان کے لئے کشادہ

۱۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۰۸۔ حلیۃ الاولیاء جلد ۳ ص ۱۲۱۔ استیعاب در حاشیہ الاصابہ جلد ۴ ص ۳۸۲

فرما۔ تجھے تیرے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے حق کا واسطہ دعا قبول فرما)۔

صحیفۂ سجادیہ اور ان دعاؤں میں جو ائمہ سے ہم تک پہنچی ہیں اس طرح کی قسم دینا بہت زیادہ ان حضرات سے منقول ہے۔ دلچسپی رکھنے والے افراد وہاں سے رجوع کریں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۶

غیر اللہ کی نذر ماننا

سوال: شیعہ اور دوسرے مسلمان اولیائے الٰہی کی نذر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دنبہ رسول خداؐ یا حسینؑ بن علیؑ کی نذر ہے۔ جب کہ غیر اللہ کی نذر ماننا ناجائز ہے۔

جواب: غیر اللہ کی نذر ماننے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اس نیت سے نذر مانی جانے کہ اس سے بندگان خدا کا تقرب نصیب ہو اور ان کی رضا حاصل ہو۔ (اور اس سے خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود نہ ہو) یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس طرح کی نذر ومنت ایک طرح کا شرک ہے اور بت پرستی کے مساوی ہے۔

۲۔ نذر سے خدا کی قربت اور اس کی رضا مقصود ہو اور اس کا ہدیہ ثواب اولیاء الٰہی کے نام کیا جائے تا کہ اس طرح سے اللہ کی رضا حاصل ہو سکے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس طرح کی نذر اور اس قصد اور پاک نیت سے مانی جانے والی نذر ایک پسندیدہ اور قابل تعریف عمل ہے۔

نذر کی دونوں اقسام پر لوگوں کی نظر نہیں ہوتی اسی لئے اس طرح کے اعتراضات پیدا ہوتے ہیں

واضح رہے کہ ''نذر'' ایک امر عبادی ہے لہٰذا سے قربۃً الی اللہ کے قصد سے انجام دینا چاہیے۔ نذر ماننے والے کو اس طرح کے الفاظ سے نذر ماننی چاہیے۔

"لِلّٰهِ عَلَیَّ اِنْ قُضِیَتْ حَاجَتِی اَنْ اَذْبَحَ هٰذِہِ الشَّاۃَ لِلنَّبِیِّ"

(خدا کی رضا اور تقرب کو حاصل کرنے کے لئے میں یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر میری حاجت پوری ہوگئی تو میں نبیؐ کے لئے یہ گوسفند ذبح کروں گا)۔

نذر ماننے کا صحیح صیغہ یہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔لیکن اکثر لوگ اپنی نادانی یا اختصار پسندی کے لئے یہ کہتے ہیں:

"ھذا للنبی، یا۔ نذرت ھذا للنبی" (یہ نبی کے لئے ہے۔ میں نے یہ نبی کے لئے نذر مانی ہے)

سوال بہر حال یہ ہے کہ آخر نبی اکرم کے لئے نذر کیسے مانی جاسکتی ہے اور "للنبی" (نبی کے لئے) کہنے کا جواز کیا ہے جب کہ نذر صرف خدا کے لئے ہوتی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نذر کے صیغہ میں لفظ "لِلّٰہِ علیَّ" میں "لام" تقرب کے معانی کے لئے ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى" (سورۂ سبا/۴۶)

(دو دو ہو کر اور اکیلے ہو کر اللہ کی قربت کے حصول کے لئے اٹھو)۔

حالانکہ منت و نذر کے صیغہ میں "للنبی" کے لفظ میں "لام" "انتفاع" کے معانی میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ" (سورۂ توبہ/۶۰)

(زکوٰۃ بس تہی دستوں اور مساکین کے لئے ہے)۔

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موحد اور مشرک کا عمل اگر چہ ظاہری طور پر یکساں ہوتا ہے لیکن بلحاظ جوہر دونوں کے عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے مشرک بتوں کے لئے چڑھاوے چڑھاتا ہے اور ان کے تقرب کی غرض سے جانور ذبح کرتا ہے۔ جب کہ موحد خدا کی رضا اور اس کے تقرب کو مدنظر رکھ کر قربانی کرتا ہے۔ اللہ نے مشرکین کے عمل کی ان الفاظ سے مذمت کی ہے:

"وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ذٰلِكَ فِسْقٌ"(سورۂ مائدہ۳/۵)

(اور جو جانور بتوں کے لئے ان کے آستانوں پر ذبح کیا جائے دین سے خارج ہونے کا موجب ہے)۔

مشرک کے برعکس ایک مومن خدا کیلئے نذر کرتا ہے اور ذبح کے وقت خدا کا نام لیتا ہے۔ پھر اپنے نیک عمل کا ثواب اولیاء اللہ کو ہدیہ کرتا ہے اور اس طرح سے درگاہِ الٰہی میں تقرب کا خواہش مند ہوتا ہے۔

ایک شخص حضرت رسول مقبول کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میری ماں اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں صدقہ خیرات کیا کرتی تھی اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اسے کوئی فائدہ پہنچے گا؟

رسول خداؐ نے فرمایا: ہاں!

اس شخص نے کہا: کون سا صدقہ اسے زیادہ فائدہ دے گا؟

آپؐ نے فرمایا: پانی

یہ سنا تو سوال کرنے والے نے ایک کنواں کھدوایا۔ جب کنواں مکمل ہو گیا تو کہا "هٰذِهِ لِاُمِّ سَعْدٍ"، (اس کنوئیں کا ثواب سعد کی ماں کے لئے ہو)۔

توجہ فرمائیں "لام سعد" میں جو لام استعمال ہوا ہے وہی لام "وللنبی" میں استعمال ہوا ہے۔(۱)

اس لام کے اصطلاح میں لام انتفاع کہا جاتا ہے یہ "لام تقرب" نہیں ہوتا مقصد یہ ہے کہ نذر کی روح یہ ہے کہ درگاہ الٰہی کے تقرب کے حصول کیلئے میں عہد کرتا ہوں کہ جانور ذبح کروں گا اور اس کا ثواب پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدیہ کروں گا اور اس ذریعہ سے میں درگاہِ خدا کا تقرب حاصل کروں گا تاکہ اللہ اس عمل کی وجہ سے میرے بیمار کو صحت عطا فرمائے۔

۱۔ فرقان القرآن ص ۱۳۳

۷

کیا غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے؟

سوال: یہ بات عام مشاہدے میں آتی ہے کہ عام مسلمان بالخصوص شیعہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قران اور اپنے ائمہ کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں کیا اس طرح کی قسمیں کھانا از روئے شریعت درست ہے؟

HASSANAIN DEPO

جواب: اللہ تعالیٰ نے قران حکیم میں تقریباً چالیس قسمیں کھائی ہیں اور ان میں غیر اللہ کی بھی قسمیں کھائی ہیں۔ مثلاً انجیر، زیتون، طور سینین، بلد امین، شب و روز، فجر، دس راتوں، جنت، شفع و وتر، طور، کتاب مسطور، بیت معمور، سقف مرفوع، بحر مسجور اور جانِ پیغمبر کی قسمیں کھائی ہیں (۱)۔

ان قسموں سے دو چیزیں مقصود ہیں:

۱۔ ان قسموں سے صاحبان فکر افراد کو آیات الٰہی میں غور و فکر کی ترغیب دی گئی ہے مثلاً سورج چاند کی قسمیں کھا کر خدا نے انسانوں کو ان کے فوائد کی طرف متوجہ کیا ہے اور ان کے ایمان کو استحکام بخشا ہے۔

۲۔ اشیاء کی قسم کھا کر اللہ نے ان چیزوں کی فضیلت و منزلت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً خدا نے جان پیغمبر کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا:

۱۔ حسب ذیل سورتوں کی طرف رجوع فرمائیں۔ التین، الضحیٰ، الفجر، طور، حجر، یونس اور سورہ شمس

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ (سورۂ حجر/۷۲)

(آپ کی زندگی کی قسم! وہ اپنی شہوات کی مستی میں سرگردان تھے)۔

قرآن کریم کی قسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا دو مقاصد کے اثبات کے لئے قسمیں کھائی ہیں۔ ان قسموں کی موجودگی میں بھلا یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم شرک یا حرام ہے؟!! اگر اس طرح کی قسمیں عقیدہ توحید کے منافی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں یہ قسمیں نہ کھاتا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس طرح کی قسمیں کھانے کا حق خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ بندگان خدا کو غیر اللہ کی قسم کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل روایات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے:

اقوال رسولؐ میں غیر اللہ کی قسم

رسول مقبول ﷺ کی حیات طیبہ میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں دکھائی دیتی ہیں جن میں آپؐ نے غیر اللہ کی قسمیں کھائی تھیں۔ ذیل میں ہم ان کے چند نمونے نقل کرتے ہیں:

۱۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت لکھی ہے:

"جاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ أَيُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجراً؟ فَقَالَ: أَمَا وَأَبِيكَ لَتُنَبَّأَنَّهُ أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ، تَخْشَى الفَقْرَ وَتَأْمُلُ البَقَاءَ..." (۱)

(ایک شخص حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: یا رسول اللہؐ! کس صدقہ کا اجر سب سے زیادہ ہے؟

آپؐ نے فرمایا: تیرے باپ کی قسم! تجھے اس سے آگاہی دی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اس حالت میں صدقہ دو جب تم تندرستی کی حالت میں ہو اور تمہیں اس حال کی خود بھی ضرورت ہو اور تمہیں صدقہ دیتے وقت افلاس کا خوف ہو اور تمہیں مستقبل کی فکر ہو)۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۳ ص ۹۴ باب افضل الصدقۃ از کتاب زکوٰۃ

صحیح مسلم میں منقول ہے

جاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُول اللّٰهِ مِنْ نَجْدٍ یَسْأَلُ عَنِ الاِسْلامِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: خَمْسُ صَلَوات فِی الْیَومِ وَاللَّیْلِ۔ فَقَالَ هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهُنَّ؟ قَالَ لا ... اِلّا اَنْ تَطَوَّعَ وَصِیامُ شَهرِ رَمَضانَ۔ فَقَال: هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهُ؟ قالَ لا ... اِلّا اَنْ تطوّعَ وَذَکَرَلَهُ رَسُولُ اللّٰهِ الزَّکٰوة۔ فَقَالَ الرَّجُلُ: هَلْ عَلَیَّ غَیْرُهُ؟ قالَ: لا ... اِلّا اَنْ تُطوِّعَ۔ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ یَقُولُ: وَاللّٰهِ لا اَزِیدُ عَلیٰ هٰذا ولا اَنْقص مِنْهُ۔ فَقَالَ رَسُولُ ﷺ: اَفْلَحَ وَاَبِیهِ۔ اِنْ صَدَقَ۔ اَوْقَالَ دَخَلَ الْجَنَّة۔ وَاَبِیهِ۔ اِن صَدَق" (۱)

(نجد کا ایک باشندہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اسلام کے متعلق سوالات کیے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد ان امور پر ہے۔

الف۔ دن رات میں پانچ نمازوں کی ادائیگی۔ نجدی شخص نے کہا: کیا ان کے علاوہ مجھ پر اور بھی کوئی نماز فرض ہے؟

آپؐ نے فرمایا جی ہاں، بطور مستحب۔

ب۔ ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ اس شخص نے کہا: کیا اس کے علاوہ بھی کوئی روزے مجھ پر فرض ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: جی ہاں بطور مستحب

ج۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس شخص نے کہا: اس کے علاوہ کوئی اور زکوٰۃ بھی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: جی ہاں، بطور مستحب

اس کے بعد وہ شخص آپؐ کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں نہ تو اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم کروں گا۔

۱۔ صحیح مسلم جلد اول ص ۳۲ باب ما ھوالاسلام

رسول خداؐ نے فرمایا: اگر اس نے سچ کہا تو اس کے باپ کی قسم اس نے نجات پائی۔ یا آپ نے یہ الفاظ کہے کہ اس کے باپ کی قسم، اگر اس نے سچ کہا ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔

صرف رسول خداؐ نے ہی غیر اللہ کی قسم نہیں کھائی تھی امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اپنے خطبات، کلمات اور مکتوبات میں بھی بار بار غیر اللہ کی قسم کھائی ہے۔

امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب اسلامی تربیت کا بلند ترین نمونہ تھے۔ اور آپؑ نے اپنے کلمات وخطبات اور مکاتیب میں بارہا اپنی جان کی قسم کھائی تھی۔ آپؑ نے بارہا "لعمری" (۱) مجھے میری زندگی کی قسم) اور اپنے مخاطب افراد سے "لعمر ابیک" (تیرے باپ کی زندگی کی قسم) کہہ کر خطاب کیا تھا۔ (۲)

کتب حدیث وتاریخ میں اس طرح کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ کتاب ہذا کے صفحات میں ان کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ (۳)

قسم کی حرمت کے قائل افراد کے دلائل

وہ افراد جو غیر اللہ کی قسم کھانے کے مخالف ہیں، وہ اپنے نظریہ کے لئے دو احادیث سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ انّ رسول الله سمع عمر وهو يقول: وابي فقال: إِنَّ اللهَ يَنْهَا كُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِابَائِكُمْ وَمَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِف بِاللهِ أَوْ يَسْكُت۔ (۴)

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا "مجھے میرے باپ کی قسم" تو آپؐ نے فرمایا: اللہ تمہیں تمہارے باپ دادا کی قسم سے منع کرتا ہے۔ جس کو قسم کھانا ہو تو وہ اللہ کی

۱۔ نہج البلاغہ خطبات ۲۴۔ ۳۳۔ ۵۶۔ ۸۹

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۵۔

۳۔ موطا امام مالک بشرح زرقانی جلد ۴ ص ۱۵۹ حدیث ۵۸۰

۴۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۲۷۷۔ سنن ترمذی جلد ۴ ص ۱۰۹۔ سنن نسائی جلد ۷ ص ۴۔ ۵ سنن کبریٰ جلد ۱۰ ص ۲۹۔

قسم کھائے یا پھر خاموش رہے)۔

جواب: اس حدیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں آباؤ اجداد کی قسم سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کے بزرگ مشرک اور بت پرست تھے۔ اور خدا کی نظر میں کسی بھی مشرک کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ انسان ان کی قسم کھائے۔ حسب ذیل دو احادیث سے ہمارے بیان کردہ مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا:

"لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ وَلَا بِأُمَّهَاتِكُمْ وَلَا بِالْأَنْدَادِ"۔ (۱)

(اپنے ماں باپ کی قسمیں نہ کھاؤ اور نہ ہی بتوں کی قسم کھاؤ)۔

"لَا تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ وَلَا بِالطَّوَاغِيتِ"۔ (۲)

(اپنے آباؤ اجدا کی قسمیں نہ کھاؤ اور بتوں کی بھی قسمیں نہ کھاؤ)۔

ان دو احادیث پر غور کرنے سے پہلی حدیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے حضرت عمر کو باپ کی قسم کھانے سے اس لئے منع کیا تھا کہ یہ شرک اور مشرکین کا شعار تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول خداؐ "آبائی" کے ساتھ "انداد" اور "طواغیت" کا لاحقہ شامل نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی ممانعت کا تعلق ایک مخصوص مورد کے ساتھ تھا۔ بعد کی دو روایات پر توجہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ پہلی حدیث کا تعلق مقدسات کی قسم سے نہیں ہے حدیث میں مشرک باپ دادا کی قسموں سے منع کیا گیا ہے نہ کہ مظاہر توحید قسموں سے روکا گیا ہے۔

۲۔ جاء ابن عمر رجل فقال: اِحْلِف بِالْكَعْبَةِ, قَالَ لَا وَلٰكِنْ اَحْلِفُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ فَاِنَّ عُمَرَ كَانَ يَحْلِفُ بِاَبِيهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ: لَا تَحْلِفْ بِاَبِيكَ فَاِنَّ مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ اَشْرَكَ"۔ (۳)

۱۔ سنن ابن ماجہ جلد اول/ ۲۷۸۔

۲۔ سنن نسائی جلد ۷ ص ۷

۳۔ سنن کبریٰ جلد ۱۰ ص ۲۹۔ مسند احمد جلد اول ص ۴۷۔ جلد ۲ ص ۳۴، ۶۷، ۸۷، ۱۲۵۔ سنن بیہقی جلد ۱۰ ص ۲۹۔

(ایک شخص عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ آپ کعبہ کی قسم کھائیں۔ ابن عمر نے کہا نہیں۔ البتہ میں رب کعبہ کی قسم کھاؤں گا۔ عمر اپنے باپ کی قسم کھاتے تھے تو رسول خداؐ نے ان سے کہا تھا کہ تم اپنے باپ کی قسم نہ کھاؤ۔ جس نے بھی غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا)۔

اس حدیث میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں:

الف: ایک شخص نے ابن عمر سے کعبہ کی قسم کھانے کو کہا۔ لیکن انہوں نے یہ قسم نہ کھائی اور اس کی توضیح کے لیے انہوں نے دوسرا مطلب بیان کیا۔

ب: حضرت عمرؓ نے رسول اکرمؐ کے سامنے باپ کی قسم کھائی تو آنحضرتؐ نے انہیں اس سے روک دیا۔

ج۔ پھر رسول خداؐ نے قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "من حلف بغير الله فقد اشرك" جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

اس روایت کا جواب حسب ذیل ہے:

ا۔ ابن عمر نے کعبہ کی قسم کھانے سے اس لئے اجتناب کیا تھا کہ رسول خدا نے حضرت عمر کو اپنے باپ کی قسم کھانے سے منع کیا تھا۔

ابن عمر نے بالکل غلط اجتہاد کیا تھا کیونکہ حضرت عمر کا باپ بت پرست تھا رسول خدا نے انہیں باپ کی قسم کھانے سے روکا تھا۔ لہٰذا ایک بت پرست کا کعبہ سے موازنہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ یقیناً یہ "قیاس مع الفارق" ہے جو کہ بالبداہت باطل ہے۔

ا۔ ایک قدر و قیمت نہ رکھنے والے کافر کی قسم سے ممانعت کعبہ کی قسم حرمت کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ کعبہ اللہ کا پہلا گھر ہے اور مسلمان کا قبلہ دوم ہے۔

۲۔ "من حلف بغير الله اشرك" (جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی تو اس نے شرک کیا)، اس حدیث میں جس "غیر اللہ" کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کا پتہ اس وقت کے مسلمانوں کے

معاشرتی آداب سے لگایا جاسکتا ہے۔

کیا غیر اللہ کی ہر طرح قسم شرک ہے یا لات ومنات کی قسم کھانا شرک ہے جس کا عرب معاشرے میں رواج تھا اور نو مسلم افراد کے ذہن میں ابھی جاہلیت کا معاشرتی اقدار باقی تھا اس لئے وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی سابقہ عادت کے تحت لات ومنات کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مقدسات کی قسم کھانے سے نہیں روکا گیا بلکہ بے قدر و قیمت بتوں کی قسموں سے منع کیا گیا ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک حدیث میں یہ ارشاد فرمایا:

"مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِي حَلْفِهِ بِاللّاتِ وَ العُزّىٰ فَلْيَقُلْ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ"(۱)

(جو شخص قسم کھائے اور اپنی قسم میں یہ کہے کہ مجھے لات وعزیٰ کی قسم ہے، تو اسے چاہیے کہ فوراً "لا الہ الا اللہ" کہے)۔

یہ حدیث سابقہ دو احادیث کا ضمیمہ ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ ابھی تک مسلمانوں میں زمانہ جاہلیت کے کچھ آثار باقی تھے اور کبھی کبھی اپنی پرانی عادت کے مطابق طواغیت کی قسم کھاتے تھے۔ اس رسم کو ختم کرنے کیلئے حبیب خداؐ نے وہ حکم دیا تھا جسے ابن عمر نے اپنے اجتہاد سے مقدسات پر بھی جاری کر دیا تھا۔ جب کہ رسول خدا کا مقصد بتوں کی قسموں سے منع کرنا تھا۔

اس بحث کے اختتام پر ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے لیکن مقدمات کے فیصلے میں صرف اللہ کی قسم اٹھانی پڑتی ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام کی قسم پر مقدمات کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تمام فقہاء نے یہی بیان کیا ہے(۲)

۱۔ سنن نسائی جلد ۷ ص ۸

۲۔ کتاب "نظام القضاء والشهادة" جلد اول ص ۱۷۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۸

اولیاء اللہ کے ایام ولادت ووفات منانا

سوال: اولیائے خدا کے ایام ولادت ووفات منانے کا ابھی رواج ہو چلا ہے جب کہ عصر صحابہ میں یہ چیز رائج نہیں تھی۔ یہ بعد کی پیداوار ہے۔ آخر اسے انجام دینے کی کیا دلیل ہے؟

جواب: تاریخ گواہ ہے کہ بہت عرصہ سے مسلمان پیغمبر اکرمؐ کی ولادت باسعادت کا ہر سال جشن مناتے تھے اور اس اجلاس میں خطباء آنحضرتؐ کی تعریف وتوصیف کیا کرتے تھے البتہ یہ جشن کب سے شروع ہوا اس کی حتمی تاریخ معلوم نہیں ہے، اتنی بات یقینی ہے کہ اس طرح کے جشن تمام اسلامی دنیا میں منعقد کیے جاتے تھے۔

احمد بن محمد المعروف قسطلانی (المتوفی ۹۲۳ھ) دسویں صدی کے مشہور عالم تھے انہوں نے جشن میلاد النبی کے متعلق یہ لکھا ہے:

مسلمان ہمیشہ ماہِ میلادِ (ربیع الاول) میں جشن میلاد پیغمبر مناتے ہیں۔ لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور راتوں کو صدقہ وخیرات کیا جاتا ہے، لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر نیکیاں کرتے ہیں۔ جشن میں آنحضرتؐ کی ولادت کی مبارکبادی کے اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی برکات ہر سال نمایاں ہوتی ہیں۔ خدا اس پر رحمت کرے جو شب ولادت عید منائے

اور جس کے دل میں درد ہے اس کے درد میں اضافہ کرے۔(۱)

حسین بن محمد حسن المعروف دیار بکری (المتوفّٰی ۹۶۰ھ) مکہ کے ایک قاضی تھے، انہوں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

مسلمان ہمیشہ ماہِ میلاد میں جشن مناتے ہیں۔ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں رات کے وقت صدقات دیتے ہیں خوشی کا اظہار کرتے ہیں، غرباء و مساکین سے بھلائی کرتے ہیں، آنحضرتؐ کی مولودیں پڑھی جاتی ہیں اور آنحضرتؐ کی کرامات ہر زمانہ میں نمایاں ہوتی ہیں۔(۲)

قرنِ دہم کی ان تاریخی دستاویزات سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخِ اسلام میں مسلمان اولیائے الٰہی کی ولادت کے جشن منانے کے عادی تھے اور علمائے اسلام نے بھی اس کے جواز پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ اس عمل کا مقصد صرف آنحضرتؐ سے عقیدت کا اظہار ہے۔ اب ہم اس فعل کی دلیل شرعی بیان کرتے ہیں:

آنحضرتؐ کی مہر و مودت دین اسلام کا حصہ ہے

آنحضرتؐ کی مہر و مودت قرآنی حکم ہے۔ کوئی بھی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ آنحضرتؐ کی میلاد منانا اس محبت کا عملی اظہار ہے۔ اس سلسلہ میں ہم قرآن کریم کی دو آیات پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ٱقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾"۔ (سورۂ توبہ/۲۴)

۱۔ مواہب اللدنیہ جلد اول ص ۲۷

۲۔ تاریخ خمیس جلد اول ص ۳۲۳

(آپ کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور تمہارا کمایا ہوا مال اور تمہاری وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خوف ہے، وہ تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنے حکم کو لے آئے۔ اللہ فاسق لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا)۔

یہ آیت مجیدہ واضح کرتی ہے کہ رسول مقبولؐ کی محبت خدا کی محبت کی طرح سے واجب ہے یہ محبت شریعت و احکام الٰہی کا مقدمہ ہے۔ شریعت پر عمل محبتِ رسولؐ کی رہ گزر سے ہو کر گزرتا ہے۔

۲۔ حسبِ ذیل آیت میں اہل ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے:

"فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷" (سورۂ اعراف/۱۵۷)

(وہ لوگ جو رسول پر ایمان لائے اور ان کی تکریم کی اور ان کی مدد کی اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی اتباع کی یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں)۔

اس آیت مجیدہ میں مسلمانوں کو چار حکم دیئے گئے ہیں:

۱۔ "امنوا بہ" (پیغمبر پر ایمان لائے)

۲۔ "عزروہ" (ان کی تعظیم و توقیر کی)

۳۔ "ونصروہ" (مشکلات میں ان کی مدد کی)

۴۔ "واتبعو النور الذی انزل معہ" اور اس قرآن کی پیروی کی جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے)۔

مذکورہ بالا آیات واضح کرتی ہیں کہ رسول خداؐ کی محبت اور ان کی تکریم فرائض دین میں سے ہے۔ اب میلادِ رسول پر اعتراض کرنے والوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ بتائیں میلاد رسولؐ کا جشن محبت مصطفیؐ کا مظہر ہے یا نہیں ہے؟

اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہے اور جشن میلاد کو جو بھی شخص دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حبیبِ خدا کی محبت و الفت اور تعظیم و توقیر پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں کے عمل کی بنیاد حکمِ قرآن پر مبنی ہے اور اسے کسی طرح سے بھی بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بدعت ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس کی قرآن و سنت میں کوئی بنیاد نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذکر کو بلندی عطا کی ہے جیسا کہ سورۂ انشراح میں ارشادِ قدرت ہے:

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝" (سورۂ انشرح آیت ۴)

(کیا ہم نے آپ کے ذکر کو بلندی نہیں دی؟)

یہ آیت مجیدہ بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے ذکر کی بلندی ایک ایسی نعمت ہے جو خدا نے آپ کو عنایت فرمائی ہے۔ اور یہ محافلِ میلاد بھی ذکر کی بلندی کا ایک نمونہ ہیں۔ آنحضرتؐ کی ولادتِ باسعادت کے دن ہر طرح کے لہو و لعب سے دور رہ کر خوشیاں منانا آپ کے ذکرِ مبارک کی بلندی کا مظہر ہے۔

جب حضرت عیسیٰؑ کی دعا سے آپؑ کی قوم پر آسمانی خوان نازل ہوا تو انہوں نے اسے روزِ عید قرار دیا تھا جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے:

"رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝" (سورۂ مائدہ ۱۱۴/۵)

(اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے دسترخوان نازل فرما۔ جو ہمارے اول و آخر کے لئے عید کا سبب ہو اور تیری طرف سے نشانی ہو۔ ہمیں رزق عطا فرما۔ تو بہترین رزق دینے والا ہے)۔

اگر نزولِ مائدہ کا دن ہر سال عید کا دن قرار پا سکتا ہے۔ جب کہ وہ محدود اور جلد زائل

ہونے والی نعمت تھی تو سید العالمین کا یوم ولادت اور ان کا یومِ بعثت عید اور جشن کا دن کیوں نہیں ہوسکتا؟

لہٰذا مسلمان ہر روز وشب اور ہر ماہ اور ہر سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر خیر کے لئے جو محافل منعقد کرتے ہیں اور ان میں حبیب خدا کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہیں اور حبیب خدا کی شان میں نازل ہونے والی آیات تلاوت کرتے ہیں اور آپ کی شان میں اشعار وقصائد پڑھتے ہیں تو وہ آنحضرتؐ کی مہر ومحبت کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں اور جہاں تک آنحضرتؐ کی ولادت کے دن خصوصی جشن کے انعقاد کا تعلق ہے تو اس کی وجہ ہے کہ آپ کی ولادت خدا کی طرف سے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے اسی لئے مسلمان اس دن کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ ویسے بھی مسلمانوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس روز جشن منانا شریعت کا تقاضا ہے یہ جشن آپ کی ولادت کی خوشی میں اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے ہوتا ہے اور اس کا شریعت سے ارتباط نہیں ہے۔

HASSAN ALI BOHRAN

۹

اولیائے الٰہی کی زیارت قبور

سوال: کیا اولیائے الٰہی کی قبور کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے؟

جواب: اولیائے الٰہی کی زیارت کا تو بڑا مقام ہے اس سے ہٹ کر ہر شہر اور دیہات میں وادی خاموشاں کی زیارت سے انسان پر انتہائی مُثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہم کچھ اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں:

قبرستان جانے سے انسان کو اپنے عاجز ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے میری مادی قوت وطاقت چند دنوں کی مہمان ہے آخر کار مجھے بھی مرنا ہے۔ جب کوئی ہوش مند شخص قبروں کی زیارت کرتا ہے تو وہ دنیا کی ناپائیداری کا قریب سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے ذہن میں فکرِ آخرت پیدا ہوتی ہے اور جہانِ مادی کے انجام کو اپنی آنکھوں دیکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو خود خواہی اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے اور وہ سعادتِ اخروی اور حیاتِ جاوید کی جستجو کرتا ہے۔

پیغمبر اکرم نے اسی تربیتی نکتہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَزُورُو القُبُورَ فَاِنَّهَا تُذَکِّرُکُمُ الآخِرَة"۔ (۱)

۱۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۵۰۰ حدیث ۱۵۶۹

(زیارت قبور کے لئے جاؤ وہ تمہیں آخرت کی یاددہانی کراتی ہیں)۔

آنحضرتؐ نے اپنی ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"زُورُوا الْقُبُورَ فَإِنَّ لَكُمْ فِيهَا عِبْرَةٌ"۔ (۱)

(قبروں کی زیارت کے لئے جاؤ تمہارے لئے اس میں درسِ عبرت ہے)۔

اب تک ہم نے جو کچھ عرض کیا اس کا تعلق عام انسانوں کی قبروں کی زیارت سے تھا۔ جب کہ شہداء کے مزارات کی زیارت کی بات ہی اور ہے۔

وہ مجاہدین جنہوں نے اپنی ملت و دین کے دفاع کے لئے اپنے خون کو بہایا اور انسانی اور الٰہی مقاصد کے لئے جان کا نذرانہ پیش کیا ان کی قبور کی زیارت سے اعلیٰ اقدار جنم لیتی ہیں۔

جب کوئی انسان راہِ حق کے شہداء کی قبور پر حاضر ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ ترین روحانی اور تربیتی آثار کے علاوہ شہداء سے ایک طرح کا عہد و پیمان کرتا ہے اور زیارت کرنے والا شہیدانِ وفا کے مزار پر جا کر یہ اعلان کرتا ہے کہ میں آپ کے راستے پر چلتا رہوں گا اور جس عظیم مقصد کے لئے آپ نے اپنی پیاری جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے میں ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔

اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ہم ایک زندہ مثال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ خانۂ خدا کا زائر طواف سے قبل حجر اسود کا استلام کرتا ہے اور حجر اسود پر ہاتھ رکھ کر دراصل حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی بیعت کرتا ہے کہ آپ نے جس عقیدہ توحید کا چراغ روشن کیا تھا میں اس عقیدہ پر ثابت قدم رہوں گا اور اس کو عام کرنے کے لئے اپنے تمام وسائل سے کام لوں گا۔

توحید کے عظیم مبلغ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ تک زائر کا ہاتھ نہیں پہنچتا اس لئے وہ ان کی یادگار پر ہاتھ رکھ کر مراسمِ بیعت انجام دیتا ہے۔

۱۔ کنز العمال جلد ۱۵ ص ۶۴۷ حدیث ۴۲۵۵۸

احادیث اسلامی میں وارد ہے کہ بیت اللہ کے زائر کو چاہیے کہ جب وہ حجر اسود کے استلام کا قصد کرے تو وہ یہ جملے کہے:

"اَمَانَتِی اَدَّیْتُهَا وَمِیثَاقِی تَعَاهَدْتُهُ لِتَشْهَدَ لِی بِالْمُوَافَاةِ" (۱)

(جو امانت میرے ذمہ تھی میں اسے ادا کر رہا ہوں اور میں اپنی بیعت کی تجدید کرتا ہوں تا کہ تو اس کی ادائیگی کی گواہی دے)۔

شہدائے اسلام خواہ وہ بدر و احد میں آسودہِ خواب ہوں یا کربلا میں ہوں ان کی قبور پر حاضری دینے کا بھی یہی مقصد ہے۔ قبورِ شہدا کا زائر ان کی ضریح کے سامنے کھڑا ہو کر اور ان پر درود و سلام پڑھ کر ان سے یہ عہد کرتا ہے کہ میں ان کے راستے پر اپنا سفر جاری رکھوں گا۔

بالفاظ دیگر قبر شہید کی زیارت جہاں اس کے احترام و اکرام کی مظہر ہے وہاں شہید کی موت کو آئیڈیل اور کمالِ مطلوب بھی ثابت کرتی ہے۔ ہر شخص شہید کا احترام کرتا ہے کہ اس نے ایک مقدس مشن کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے اور شہید کی زیارت سے انسان اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ بھی راہِ شہید پر گامزن رہے گا۔

حرمِ رسولؐ میں حاضری

رسول خداؐ کے حرم یا آپؐ کے جانشینوں کے حرم میں جب انسان حاضری دیتا ہے تو اس کا ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ انسان ہدایتِ خلق کے لئے ان کی فداکاری اور ان کی جانفشانی کو سراہتا ہے علاوہ ازیں ذوات عالیہ کے حضور حاضر ہونا ان سے ایک طرح کی بیعت کا بھی مظہر ہوتا ہے۔

امام ہشتم نے معصومین کی زیارت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"اِنَّ لِکُلِّ اِمامٍ عَهْداً فِی عُنُقِ اَولیائِهِ وَشِیعَتِهِ وَاِنَّ مِنْ تَمامِ الوَفاءِ

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۰ ص ۴۰۰ باب ۱۲، از ابواب طواف حدیث اول

بِالْعَهْدِ زِيَارَةُ قُبُورِهِمْ"۔ (۱)

(ہر امام کا اس کے دوستوں اور شیعوں کے ذمہ عہد و پیمان ہوتا ہے اور ان کی قبور کی زیارت اس عہد و پیمان کا ایک حصہ ہوتی ہے)۔

قبرِ رسول اور قبورِ ائمہ کا زائران سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ وہ پوری زندگی ان کے راستے پر چلتا رہے گا اور وہ ان کے راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر نہیں چلے گا۔

رسولِ اکرمؐ کی قبر مطہر کا زائر زبانِ حال سے یہ عرض کر رہا ہوتا ہے:

اے خدا کے رسولؐ! مہاجرین و انصار نے حدیبیہ میں حریمِ رسالت کے دفاع کے لئے آپ کی بیعت کی تھی (۲) مکہ کی اہلِ ایمان خواتین نے آپ کی بیعت کی تھی کہ وہ شرک اور گناہ سے پرہیز کریں گی (۳) گناہ گار اہلِ ایمان کو حکم ملا کہ وہ آپ کی حضور پہنچ کر اپنی مغفرت کی دعا کرائیں (۴)

اے عظیم القدر اللہ کے رسول! اے شفیع المذنبین! میں آپ کے حضور حاضر ہو کر اور آپ کی تربت پاک کو سلام کر کے آپ کی بیعت کر رہا ہوں۔ میں اپنی پوری زندگی آپ کی تعلیمات پر عمل پیرا رہوں گا، شرک اور دوسرے گناہوں سے دور رہوں گا اور اس عمل کے عوض آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خداوند عالم سے میری بخشش کے لئے دعا فرمائیں۔

زیارت قبور تمام فقہی مذاہب میں مستحب ہے۔ اس کے لئے ہمیں زیادہ حوالے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اتنا عرض کرنا ہی کافی ہے کہ کبھی کبھی خود حضرت رسول خداؐ قبرستانِ بقیع جاتے تھے اور وہاں جا کر اہل ایمان کو یوں مخاطب کرتے تھے:

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۰ ص ۳۴۶ باب ۴۴، از ابواب مزار حدیث ۲

۲۔ "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" سورۂ فتح/۱۸

۳۔ "اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ" سورۂ ممتحنہ/۱۲

۴۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۝ سورۃ النساء

"السَّلامُ عَلَيْكُمْ دارَ قَومٍ مُؤمِنِينَ وَاتاكُمْ ماتُوعَدُونَ غَداً، مُؤَجَّلُونَ وَإنَّا إنْ شاءَ اللهُ بِكُمْ لاحِقُونَ، اللّهُمَّ اغْفِرْ لأهْلِ بَقِيعِ الغَرْقَدِ" (۱)

(اے اہل ایمان لوگوں کے گھر میں رہنے والو تم پر سلام ہو۔ خدا نے تم سے جو وعدہ کیا ہے وہ تمہیں کل عطا کرے گا۔ تم موت اور قیامت کے درمیان کی منزل سے گزر رہے ہو اور ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں۔ خدایا اہل بقیع غرقد کی مغفرت فرما)۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔ صحیح مسلم ۳/ ۶۳ کتاب الجنائز

۱۰

خواتین اور زیارت قبور اور دو سوالوں کے جواب

سوال: کیا عورتوں کے لئے قبروں پر جانا ممنوع نہیں ہے؟

جواب: اپنے عزیزوں کی قبور ہوں یا اولیائے الٰہی کی قبور ہوں اس میں مرد عورت کے لئے یکساں احکام ہیں۔ کیونکہ مرد و عورت کے لئے احکام اسلام مساوی ہیں البتہ جہاں کوئی دلیل خاص کردے تو علیحدہ بات ہے اور عورتوں کے لئے زیارت قبور سے ممانعت کی کوئی مخصوص دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس حکم میں مرد و عورت کے مساوی ہونے کی دلیل موجود ہے۔

حضرت رسول خداؐ نے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا:

"زوارو القبورَ فانّها تذ کّرکُم الآخرةَ"۔ (۱)

(قبروں کی زیارت کے لئے جاؤ یہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں)۔

آپ نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

زُورُوا القبورَ فانّ لکُم فیها عِبْرةٌ"۔ (۲)

(قبروں کی زیارت کو جاؤ اس میں تمہارے لئے عبرت کا سامان ہے)

یہ صحیح ہے کہ مذکورہ بالا احادیث میں جمع مذکر مخاطب کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن

۱۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۵۰۰ حدیث ۱۵۶۹

۲۔ کنز العمال جلد ۱۵ / ۶۴۷ حدیث ۴۲۵۵۸

کتاب وسنت میں جتنے بھی احکام بیان کیے گئے ہیں ان سب میں مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود وہ احکام عورتوں کے لئے بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ مردوں کے لئے ہیں۔ البتہ عدم اشتراک پر کوئی دلیل موجود ہو تو پھر علیحدہ بات ہے۔ لہٰذا نماز وزکوۃ کی ادائیگی کے احکام پر مشتمل آیات میں گو کہ خطاب مردوں سے ہے لیکن ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ" (سورۃ البقرہ ۲/۱۱۰)

(تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور تم جو بھی بھلائی اپنے لئے آگے روانہ کرو گے تو اسے خدا کے ہاں پاؤ گے)۔

یہاں ''اقیموا'' اور ''اتوا'' جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں تو کیا نماز اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے کیا عورتیں نماز اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں؟

اگر صیغہ جمع مذکر کے باوجود اس میں عورتیں بھی شامل ہیں تو حدیث میں موجود لفظ ''زوروا القبور'' کے حکم میں بھی عورتیں یکساں شریک ہیں۔

علاوہ ازیں ہم عورتوں کے لئے زیارت قبور کے لئے حسب ذیل روایات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم میں مرقوم ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبریلؑ نازل ہوئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کا پروردگار آپ کو حکم دے رہا ہے کہ آپ اہل بقیع کی زیارت کے لئے جائیں اور ان کے لئے مغفرت کی درخواست کریں۔

اس حکم کے بعد رسول خدا اپنے بستر سے اٹھے اور بقیع کی طرف روانہ ہوئے۔ بی بی عائشہ بھی آپ کے پیچھے چل پڑیں اور انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ میں اہل بقیع کی زیارت

کیسے کروں؟

آپ نے فرمایا کہ تم یہ کہو کہ ''مومنین و مسلمین کی سرزمین میں رہنے والوں پر سلام۔ خدا اگلوں اور پچھلوں پر رحمت نازل فرمائے''(۱)

اس مقام پر ہماری دلیل یہ ہے کہ اگر عورتوں کے لئے زیارتِ قبور حرام ہوتی تو رسول خدا نے اپنی زوجہ کو یہ کلمات کیوں تعلیم کیے تھے؟

علاوہ ازیں جب بی بی عائشہ اس حدیث کو عورتوں سے بیان کرتی تھیں تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زیارت قبور عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے جائز ہے؟

۲۔ حضرت خاتون جنت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت حمزہ علیہ السلام کی زیارت کے لئے مقامِ احد جاتی تھیں اور آپ وہاں دو رکعت نماز پڑھتی تھیں اور حمزہؑ پر گریہ کرتی تھیں۔

حاکم نیشاپوری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور عادل ہیں اسی لئے یہ روایت بخاری و مسلم کی روایت کے برابر ہے۔(۲)

۳۔ ترمذی نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت کی ہے کہ عبدالرحمان بن حضرت ابوبکر نے ''حُبشی'' نامی جگہ پر وفات پائی۔ ان کے جنازہ کو مکہ لایا گیا اور وہاں دفن کیا گیا۔ بعد میں ان کی بہن بی بی عائشہ مکہ آئیں تو وہ بھائی کی قبر پر گئیں اور انہوں نے بھائی کی قبر پر دو شعر پڑھے جو اُن کے غم واندوہ کی ترجمانی کرتے تھے۔(۳)

۴۔ بخاری لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے ایک عورت کو ایک قبر کے کنارے روتا ہوا دیکھا

۱۔ صحیح مسلم جلد ۳ ص ۶۴۔ باب مایقال عند دخول القبور والدعاء لاھلھا۔ از کتاب الجنائز

۲۔ مستدرک حاکم جلد اول ص ۳۷۷ طبع دار المعرفت

۳۔ سنن ترمذی جلد ۳ ص ۳۷۱ حدیث ۱۰۵۵

تو آپ نے فرمایا کہ بردباری اختیار کر اور رشتہ داروں کی جدائی پر صبر کر۔(۱)

بخاری نے تو اس روایت کا ضمیمہ نقل نہیں کیا ہے جب کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں بخاری کی روایت نقل کر کے پھر آگے یہ لکھا ہے کہ وہ عورت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پہچانتی تھی اس نے آپؐ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: میری مصیبت سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟

ایک اور عورت نے جو اس کے پاس تھی اس سے کہا: کیا تو اس مرد کو پہچانتی ہے؟ یہ تو رسول خداؐ تھے۔

چنانچہ وہ عورت اپنی گستاخی کی تلافی کے لئے آنحضرت کے گھر گئی اور عرض کیا: یارسول اللہ مجھے معاف کر دیں میں نے آپؐ کو پہچانا نہیں تھا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: مصیبت میں بردباری اچھی چیز ہے۔(۲)

اگر رشتہ داروں کی قبر کی زیارت کرنا حرام ہوتا تو پیغمبر اسلام اس خاتون کو صبر کا حکم نہ دیتے بلکہ یہ فرماتے کہ تیرا قبر پر جانا ہی حرام ہے۔

(رسول خدا نے قبر پر جانے کو حرام قرار نہیں دیا اس کے برعکس مصیبت میں صبر کرنے کا حکم دیا ہے)۔

دو سوالات کے جواب

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کا قبرستان جانا حرام ہے اور وہ استدلال میں دو حدیثیں پڑھتے ہیں۔

۱۔ لَعَنَ اللہُ زَوّاراتِ القُبُور (۳)

۱۔صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۳ باب قول الرجل للمرأۃ عند القبر اصبری از کتاب الجنائز

۲۔سنن ابوداؤد جلد ۳ ص ۱۹۲ حدیث ۳۱۲۴

۳۔سنن ابن ماجہ جلد اول/ ۵۰۳ حدیث ۱۸۷۶۔سنن ابوداؤد جلد ۳ ص ۲۱۸ حدیث ۳۲۳۶۔سنن ابوداؤد میں لفظ ''زوارات'' کی بجائے ''زائرات'' کا لفظ مرقوم ہے۔

(خدا قبور کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کرے)۔

جواب: استدلال کے لئے جن شرائط کی ضرورت ہے یہ حدیث ان شرائط سے خالی ہے۔ اس حدیث کو سابقہ دلائل کی وجہ سے منسوخ سمجھنا چاہیے۔ اتفاقاً کچھ اہل سنت محدثین بھی اس کو منسوخ سمجھتے ہیں مثلاً کیونکہ ترمذی جو کہ ناقلِ حدیث ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث زیارتِ قبور کے جواز سے پہلے کی ہے اور جب رسول اکرمؐ نے زیارت کو جائز قرار دیا تو تمام مردوں اور عورتوں کو اس کی یکساں اجازت دی گئی (۱)

قرطبی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث میں ان عورتوں پر لعنت کی گئی ہے جو اپنا زیادہ تر وقت قبرستان میں بسر کرتی ہیں اور اپنے شوہروں کے حقوق پامال کرتی ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے لفظ ''زوّارات'' استعمال کیا ہے اور ہم سب کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ لفظ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ ابن ماجہ نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ ایک دن رسول خداؐ باہر آئے تو آپ نے عورتوں کو بیٹھا ہوا دیکھا تو آپؐ نے فرمایا: تم کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟

انہوں نے کہا: ہم جنازہ کا انتظار کر رہی ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے میت کو غسل دینا ہے؟

عورتوں نے کہا: نہیں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا جنازہ اٹھانا ہے؟

آپؐ نے کہا: نہیں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اسے قبر میں اتارنا ہے؟

عورتوں نے کہا: نہیں۔

۱۔ سنن ترمذی جلد ۳/ ۳۷۱ باب ماجاء من الرخصة فی زیارة القبور

HASANAIN BOOK

آپؐ نے فرمایا: واپس لوٹ جاؤ گناہ گار ہو رہی ہو اجر و ثواب کی حقدار نہیں بن رہی ہو(۱)۔

جواب: یہ حدیث از روئے سند اور از روئے دلالت قابلِ استدلال نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں ''دینار بن عمرو'' شامل ہے اور علم رجال کے ماہرین کے بقول وہ مجہول، کذاب، متروک اور خطا کار شخص تھا۔ جس حدیث کا راوی اتنا ضعیف ہو وہ روایت استدلال کے قابل نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اس حدیث کا تعلق زیارتِ قبور سے نہیں ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں رسول خداؐ نے ان عورتوں کی مذمت کی تھی جو کسی فریضہ یا مستحب امر کی ادائیگی کے لئے قبرستان نہیں آئی تھیں۔ لہٰذا اس روایت کا زیارت قبور سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دین فطرت اور آسانی دلانے والا دین ہے۔ آنحضرت کا فرمان ہے:

یہ دین مضبوط و مستحکم ہے اس میں نرمی سے کام لیا کرو۔(۲)

فرض کیجئے کہ ایک ضعیف ماں کا جوان بیٹا دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور وہ منوں مٹی تلے دفن ہو جاتا ہے۔ ماں کا دل بیٹے کی موت پر جل رہا ہے اور اگر اسے تسلی مل سکتی ہے تو صرف بیٹے کی قبر پر پہنچنے کی وجہ سے مل سکتی ہے۔ کیا پسر مردہ ماں کو بیٹے کی قبر پر جانے سے روکنا اس کے درد والم میں اضافہ کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ اگر شریعت ایک ماں کو اس کے بیٹے کی قبر پر جانے کی بھی اجازت نہیں دیتی تو کیا دین کو آسان اور سہل دین اور دین فطرت قرار دیا جا سکتا ہے؟

زیارت قبور میں عبرت آموزی اور یادِ آخرت کا پہلو پایا جاتا ہے اور انسان وہاں جا کر اپنے عزیزوں کی قبور پر قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور فاتحہ پڑھتا ہے۔ عورتوں کو آخر اس فیض سے محروم کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

۱۔ فتح الباری جلد ۳/ ۱۴۸ باب ۳۱، زیارۃ القبور حدیث ۱۲۸۳

۲۔ "ان ھذا الدین متین فاوغلوا فیہ برفق" مسند احمد جلد ۳/ ۱۹۹

بالفاظ دیگر زیارت قبور میں یادِ آخرت اور عبرت انگیزی کا فلسفہ مضمر ہے۔ لہٰذا اسے ایک صنفِ کے لئے جائز اور دوسری صِنف کے لئے ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

زیارت قبور کے لئے یہ احتیاط ضرور کرنی چاہیے کہ اس عمل میں کسی طرح کا گناہ اور خلاف شریعت کام شامل نہ ہو۔ غالباً اس وجہ سے کچھ دنوں کے لئے عورتوں کو زیارت قبور سے روکا گیا ہوگا۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۱

زیارتِ قبور کے قصد سے سفر کرنا

سوال: کیا زیارت قبور کے قصد سے سفر کرنا جائز ہے؟

جواب: سابقہ دو سوالات کے جواب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زیارت قبور مستحب ہے اور اسلام نے اس کے مثبت اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تاکید کی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انبیاء و اولیاء کی قبور کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا جائز ہے؟ مثلاً کوئی شخص رسولِ اکرمؐ کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے مدینہ طیبہ کا سفر کرتا ہے یا حضرت سید الشہداء اور آپ کے جانثار ساتھیوں کی مزارات کی زیارت کے لئے کربلا معلیٰ کا سفر کرتا ہے تو اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

اس سوال کا مختصر اور جامع ترین جواب یہ ہے کہ جب زیارت قبور مستحب ہے تو اس کے مقدمہ یعنی سفر کو بھی حرام نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کی مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زیارت مؤکد مستحبات میں سے ایک ہے کہ تمام علمائے اسلام اس پر متفق ہیں۔ چنانچہ تقی الدین سبکی شافعی (المتوفّٰی ۷۵۶) آٹھویں صدی ہجری کے مایہ ناز عالم تھے۔ انہوں نے ابن تیمیہ حرانی (المتوفّٰی ۷۳۸ھ) کے اس فتویٰ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زیارت بدعت ہے، کے خلاف پوری کتاب لکھی جس کا نام "شفاء السقام فی زیارة

خیر الانام" رکھا اس کتاب میں انہوں نے چوتھی صدی کے اہل سنت علماء سے لے کر اپنے دور کے علما تک کی آراء نقل کیں اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ قبرِ رسول کی زیارت کا مستحب ہونا فقہ اسلامی کے مسلمات میں سے ہے۔(۱)

علامہ و محقق معاصر آیت اللہ امینی (۱۳۲۰۔۱۳۹۰ھ) نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الغدیر'' میں اس موضوع پر مکمل بحث کی ہے اور انہوں نے چالیس سے زیادہ فقہاء محدثین کی آراء کو پیش کیا ہے۔(۲)

دونوں بزرگوں کی کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں شائقین ان کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ہم یہاں صرف تین باتوں کو ان کی سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

۱۔محمد بن عبدالوهاب کہتا ہے کہ زیارت پیغمبر مستحب ہے لیکن مدینہ کا سفر مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کے قصد سے کیا جائے۔(۳)

۲۔عبدالرحمن جزیری نے "الفقه علی المذاهب الاربعه" نامی کتاب لکھی ہے اور اس کتاب میں انہوں نے اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کے فتاوی جمع کیے ہیں۔اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

''قبر پیغمبر کی زیارت بالاترین مستحباب میں سے ہے اور اس کے متعلق احادیث بھی وارد ہوئی ہیں''۔اس کے بعد مؤلف نے اس سلسلہ کی چھ احادیث نقل کی ہیں اور اس کے ساتھ آداب زیارت بیان کیے ہیں۔(۴)

واضح رہے کہ مذکورہ متن پر مؤلف نے کوئی حاشیہ نہیں لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔شفاء السقام ص ۶۵ تا ۷۹

۲۔الغدیر جلد ۵/ ۱۰۹۔۱۲۵

۳۔الهدیة السنیه، رسالہ دوم

۴۔الفقه علی المذاهب الاربعة جلد اول/ ۵۹۰

اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب اس پر متفق ہیں۔

۳۔شیخ عبدالعزیز بن باز کا بیان ہے کہ جو شخص مسجد نبوی کی زیارت کرے اس کے لئے مستحب ہے کہ روضہ رسول میں دو رکعت نماز ادا کرے۔ اس کے بعد رسولِ خداؐ پر سلام کرے۔ اسی طرح سے قبرستان بقیع میں جانا بھی مستحب ہے اور وہاں پر مدفون شہداء کو سلام کرنا مستحب ہے۔(۱)

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اکرمؐ کی قبرِ مطہر کی زیارت مستحب ہے۔ اب صرف یہی ایک سوال باقی رہتا ہے کہ کیا حبیب خداؐ کی قبر مطہر اور آپ کے وفادار ساتھیوں کی قبور کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے کہ جو سفر کسی مستحب امر کا ذریعہ اور مقدمہ ہو تو وہ طبعاً مستحب ہے یا کم از کم مباح ضرور ہے۔ اس کی اصولی دلیل امت اسلامیہ کے افراد کا چودہ صدیوں کا عمل ہے جو زیارتِ قبر پیغمبر کے جواز کی سب سے بڑی سند ہے۔

مسلمان اور زیارت کے لئے سفر مدینہ

تاریخ اسلام گواہی دیتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد دور دراز رہنے والے مسلمانوں نے قبرِ مطہر کی زیارت کیلئے مدینہ کا سفر کیا تھا۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ بلال حبشیؓ آنحضرت کے مؤذن تھے وہ رسول خداؐ کے سچے عقیدت مند تھے اور آنحضرتؐ ان سے محبت کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت بلالؓ نے اسلامی ملک کی سرحدوں کی نگہبانی کے فریضہ کا انتخاب کیا تھا اور مدینہ سے رخصت ہو گئے تھے۔ ایک رات انہیں حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: بلال! اتنی بے مہری کیوں ہے؟ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم میری زیارت کے لئے آؤ؟

۱۔ جریدۃ الجزیرہ مورخہ ۲۴ ذی قعدۃ الحرام ۱۴۱۱ھ شمارہ ۶۸۲۶

بلالؓ اس حالت میں نیند سے بیدار ہوئے کہ ان کے چہرے پر غم واندوہ کا ہالہ تھا انہوں نے سفر کی تیاری کی اور مدینہ کا ارادہ کیا اور جب وہ روضہ رسولؐ میں پہنچے تو بلند آواز سے گریہ کیا اور اپنا چہرہ آنحضرتؐ کی قبر پر ملنا شروع کیا۔ اس وقت گلشنِ رسولؐ کے دونوں پھول حسنین کریمین ان کے پاس آئے۔ بلالؓ نے دونوں شاہزادوں کو گلے لگایا اور بوسے دیئے۔

حسنین کریمین نے بلالؓ سے فرمایا کہ ہم آپ کی آواز میں اذان سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ اذان سنائیں جو آپ ہمارے نانا جان کے کہنے پر دیا کرتے تھے۔

صبح کے وقت بلال مسجد کی چھت پر چڑھے جہاں وہ پہلے اذان دیا کرتے تھے وہاں کھڑے ہوئے اور اذان کہنا شروع کی۔

جب ان کی اذان کی آواز مدینہ کی فضاؤں میں بلند ہوئی تو یوں لگا جیسے مدینہ میں زلزلہ آگیا ہو۔ جب انہوں نے اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ کہا تو لوگوں کے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں اور جب بلال نے اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ کہا تو مدینہ کے لوگ روتے ہوئے گھروں سے باہر آگئے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ رحلت پیغمبرؐ کے بعد اس دن سے زیادہ مدینہ میں رونے کی صدائیں کبھی بلند نہ ہوئی تھیں۔ (۱)

۲۔ ''سبکی'' رقم طراز ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک گروہ کو شام سے مدینہ بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ رسول اکرمؐ کو سلام کر کے واپس آجائیں۔ (۲)

واقدی اپنی کتاب فتوح الشام میں لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ ثانی نے بیت المقدس کے لوگوں سے مصالحت کی تو کعب الاحبار اُن کے پاس آیا اور اس نے اسلام قبول کیا۔ خلیفہ کو اس کے اسلام لانے سے خوشی ہوئی۔

۱۔ ابن عساکر: مختصر تاریخ دمشق: جلد ۵/ ۲۶۵۔ تہذیب الکمال جلد ۴/ ۲۸۹

۲۔ سبکی: شفاء السقام بحوالہ مناسک امام ابوبکر ابی عاصم النبیل ص ۱۴۳

حضرت عمر نے کعب الاحبار سے کہا کہ کیا تم میرے ساتھ مدینہ چل سکتے ہو اور قبر رسول کی زیارت کر کے اس سے فیض یاب ہونا چاہتے ہو؟

کعب نے خلیفہ کی درخواست کو قبول کیا اور واپسی پر وہ ان کے ہمراہ مدینہ آیا۔ جب حضرت عمر مدینہ پہنچے تو وہ سب سے پہلے مسجد نبوی میں گئے اور رسول خداؐ کو سلام کیا۔(۱)

واضح رہے کہ ہمیں اپنے نظریہ کے اثبات کے لئے اس طرح کے جزئی واقعات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مسلمانوں کا چودہ صدیوں کا عمل اس کے جواز پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے کہ وہ دور دراز سے زیارتِ رسولؐ کے قصد سے رختِ سفر باندھ کر مدینہ پہنچتے ہیں۔

"سبکی" نے ہر دور میں مدینہ منورہ حاضری دینے والوں کو زبردست داد تحسین دی ہے اور لکھا ہے کہ ہر دور میں بیت اللہ کے زائرین قبرِ مطہر کی زیارت کے قصد سے مدینہ کا رُخ کرتے ہیں۔ بعض افراد زیادہ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے مختصر راستے کی بجائے لمبے راستوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

اس کے بعد سبکی لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زائرین مدینہ مسجد نبوی کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی غرض سے سفر کرتے ہیں وہ لوگ سخت مغالطہ کا شکار ہیں۔ اگر یہ نظریہ رکھنے والے لوگ خود زائرین سے ان کی نیت پوچھ لیں تو انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ان کے سفر کا اول و آخر مقصد قبرِ رسولؐ کی زیارت اور ان پر درود و سلام پڑھنا ہے۔

اگر زائرین مدینہ کا ہدف اور مقصد مسجد نبوی کی زیارت ہوتا تو پھر وہ قریبی راستوں کو چھوڑ کر طویل راستوں کا انتخاب کیوں کرتے؟

چنانچہ صدیوں سے علماء و مسلمین کا یہ اجماع اس عمل کے شرعی ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ اس مسئلہ میں اجماع امت اپنی بالاترین شکل میں دکھائی دیتا ہے۔(۲)

۱۔ واقدی: فتوح الشام جلد اول ص ۲۴۴

۲۔ شفاء السقام ص ۱۰۰۔۱۰۱

زیارت قبور کو حرام کہنے والوں کی دلیل

ساتویں صدی ہجری کے اختتام تک تمام علمائے اسلام اس امر پر متفق تھے کہ زیارت کے لئے سفر کرنا مباح ہے اور اگر کسی مستحب امر کا مقدمہ بالفرض مستحب نہ بھی ہو تو کم از کم مباح ضرور ہوتا ہے۔ لیکن آٹھویں صدی کے اوائل میں ابن تیمیہ نے اس سے اختلاف کیا اور اس کے اپنے موقف کی صداقت کے لئے ابو ہریرہ کی بیان کردہ حدیث کو اپنی اساس قرار دیا اور یوں اس نے اجماعِ علماء کی مخالفت کی۔ ابن تیمیہ نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ حدیث تین طرح سے مروی ہے اور جو الفاظ ابن تیمیہ کے نظریہ کو تقویت دیتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ لَا تُشَدُّ الرِّحالُ اِلّا اِلٰی ثَلاثَۃِ مَساجِدَ: مَسْجِدی ھٰذا، وَمَسْجِدِ الحَرام، وَمَسْجِدِ الأَقصیٰ (۱)

(بار سفر نہ باندھا جائے مگر تین مساجد کے لئے۔ میری مسجد، مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ)

۲۔ اِنّما یُسافِرُ اِلی ثَلاثَۃ مَساجِد: مَسْجِدِ الکَعْبَۃ، و مَسْجِدی، وَمَسْجِدِ ایلیا
(سفر تین مساجد کے لئے کیا جاتا ہے۔ مسجد کعبہ، میری مسجد اور مسجد ایلیا)۔

ابن تیمیہ نے حدیث کے ظاہری الفاظ کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا کہ مقصدِ عبادت کے لئے صرف تین مقامات کا سفر کیا جا سکتا ہے جب کہ قبرِ رسول کی زیارت ایک امرِ عبادی اور مستحب ہے اور وہ ان تین مقامات میں شامل نہیں ہے۔

اگر ابن تیمیہ کے استدلال پر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو اس کے استدلال کی کمزوری واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہم سب اسی بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ استثنائی جملہ ہمیشہ دو حصوں

۱۔ صحیح مسلم: جلد ۴/ ۱۲۶۔ باب لاتشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔ از کتاب حج۔

اس مفہوم کی تیسری حدیث ان الفاظ سے منقول ہے "تشد الرحال الی ثلاث مساجد"

صحیح مسلم جلد ۴/ ۱۲۶۔ حدیث کے ان الفاظ سے ابن تیمیہ کے موقف کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ ابن تیمیہ کا یہ موقف تھا کہ مذکورہ تین مساجد کے علاوہ باقی کسی بھی طرح کی زیارت کے لئے سفر کرنا ممنوع اور حرام ہے۔

پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے پہلے حصہ کو "مستثنیٰ منہ" کہا جاتا ہے اور دوسرے حصہ کو مستثنیٰ کہا جاتا ہے اور عام طور پر حرف "اِلَّا" کے ذریعے سے استثنا کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

"ماجاء نی اَحَدٌ اِلَّا زیداً" (میرے پاس کوئی نہیں آیا سوائے زید کے) اب اس کی شکل وصورت کچھ یوں ہوگی۔

۱۔ جملہ مستثنیٰ منہ: مَا جَاءَ نِی اَحَدٌ

۲۔ جملہ استثنائی: اِلَّا زَیْداً

مذکورہ حدیث بھی دو جملوں سے مرکب ہے جس کی شکل وصورت حسب ذیل ہے۔

۱۔ مستثنیٰ منہ: لا تشد الرحال

۲۔ جملہ استثنائی: الا الی ثلاثۃ مساجد

اس کا پہلا جملہ جو کہ مستثنیٰ منہ ہے وہ واضح نہیں ہے۔ عربی زبان کے قواعد کے تقاضوں کے تحت یہاں ایک کلمہ کو مقدر ماننا پڑے گا اور کلمہ مقدر کے متعلق دو احتمال ہیں:

۱۔ مستثنیٰ منہ: "الی مسجد" ہے

۲۔ یا پھر مستثنیٰ منہ: "الی مکان" ہے

احتمال اول کے تحت حدیث کا مفہوم یوں ہوگا "لا تشد الرحال الیٰ مسجد من المساجد اِلَّا الی ثلاثۃ" یعنی تین مساجد کے علاوہ باقی کسی مسجد کی زیارت کے لئے سفر نہ کیا جائے۔

اگر معنی حدیث یہی متعین کیا جائے تو آنحضرتؐ کی گفتگو جو کہ نفی واثبات پر مشتمل ہے اس کا تمام تر دارومدار مسجد کے سفر پر ہے۔ اور اس کا مقصد یہ بنے گا کہ نماز کی ادائیگی کے لئے تین مساجد کے علاوہ باقی کسی مسجد کی طرف زحمتِ سفر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں

زیارت پیغمبر کا سفر مستثنیٰ منہ ''مسجد'' میں شامل نہ ہوگا اور وہ دائرہ کلام سے خارج ہوگا اور نہی کا اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اور مفہوم حدیث یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے کے لئے تین مساجد کے علاوہ باقی کسی مسجد کی طرف سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی تمام مساجد میں عبادت کا ثواب یکساں ہے۔ مثلاً ایک جامع مسجد ایک شہر میں موجود ہے تو اس چھوڑ کر کسی دوسری جامع مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے دونوں مساجد میں نماز پڑھنے کا ثواب برابر ہے۔ لہٰذا ایک مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد جانا ایک بے مقصد اور لغو کام ہے لیکن یہ تین مساجد اس قانون سے مستثنیٰ ہیں۔ ان تین مساجد میں نماز پڑھنے کا ثواب باقی مساجد سے کہیں زیادہ ہے۔

حدیث میں نفی و اثبات کے تحت جو استثنا کیا گیا ہے اس کا تعلق صرف مساجد سے ہے جب کہ دوسرے مراکز کا سفر دائرہِ حدیث سے خارج ہے اور حدیث میں ان کے جواز اور حرمت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔

دوسرے احتمال کے تحت حدیث کا معنی یہ ہوگا۔

"لاتشدُّ الی مَکانٍ مِنَ الامکنۃِ الّاالی ثَلاثۃٍ" تین مساجد کے علاوہ اور کسی جگہ سفر نہیں کرنا چاہیے۔

اگر اس احتمال کو درست تعلیم کیا جائے تو اس سے ابن تیمیہ کے موقف کی تائید ممکن ہے۔ لیکن مسلمانوں کا عملی اجماع اور مرقد رسولؐ کی زیارت کے استحباب کی متواتر روایات کی وجہ سے ابن تیمیہ کے موقف کی تردید ہوتی ہے اور اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے اور اس بنا پر حدیث کے مفہوم اور مسلمانوں کے عملی اجماع میں کوئی تضاد نہیں ہے پہلے احتمال کی موجودگی کی وجہ سے ابن تیمیہ کے استدلال کی قطعیت ختم ہو جاتی ہے۔

۲۔ اگر بالفرض احتمال دوم کو فوقیت دی جائے اور یہ کہا جائے کہ حدیث میں لفظ

''مکان'' مقدر ہے تو پھر حدیث کا مفہوم غیر صحیح صورت اختیار کرے گا جس کے صدور کی آنحضرتؐ جیسے حکیم وخبیر سے توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ کیونکہ احتمال دوم کے تحت حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ مذکورہ تین مساجد کی زیارت کے علاوہ دنیا کے ہر مقام کی طرف مطلقاً سفر کرنا حرام ہے جب کہ اسلامی منطق سفر کی بہت سی قسموں کو جائز اور مستحب قرار دیتی ہے۔ مثلاً تحصیلِ علم کے لئے سفر، تجارت کی غرض سے سفر، صلہ رحمی کے لئے سفر، سیاحت کے لئے سفر اور جہاد کے لئے سفر۔ اس کے علاوہ بھی سفر کے دسیوں مقاصد ہو سکتے ہیں جنہیں اسلام میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس صورت میں ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم حدیث میں لفظ، مسجد، کو مقدر تسلیم کریں اور سفرِ زیارت کو مضمونِ حدیث کے دائرے سے خارج شمار کریں۔

اصولی طور پر احتمال اول بھی کچھ اتنا زیادہ صحیح دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ حدیث میں زبانِ مبارکِ رسول اللہؐ سے واضح الفاظ میں یہ کہا گیا ہے کہ مذکورہ تین مساجد کے علاوہ اور کسی مسجد کی طرف سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ جب کہ محدثین لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ آپ ہمیشہ ہفتہ کے دن کبھی پیدل اور کبھی سوار ہو کر نماز ادا کرنے کے لئے مسجد قبا تشریف لے جاتے تھے اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ اس وقت مدینہ سے مسجد قبا کا فاصلہ بارہ کیلو میٹر کا تھا۔ (۱)

مساجد سبعہ کی زیارت

مدینہ منورہ کے قریب مساجد سبعہ (سات مساجد) کے نام سے اور مراکز بھی موجود ہیں۔ خانہ خدا کے زائرین جب مدینہ منورہ آتے ہیں تو وہ ان مساجد کی زیارت سے ضرور شرفیاب ہوتے ہیں۔

اگر ہم مذکورہ سات مساجد کے ساتھ مسجد ردشمس، مسجد بلال اور مسجد اجابہ کو بھی شامل کرلیں تو پھر تعداد سات سے کہیں متجاوز ہوجاتی ہے۔ زائرین ان مساجد میں دو رکعت نماز ادا

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۶۔ صحیح مسلم، سنن نسائی باشرح سیوطی ص ۳۷۲

کرتے ہیں زائرین کا زیادہ رجحان مسجد امام علیؑ کی طرف ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان مساجد میں نماز پڑھنے کا ثواب دنیا کی دیگر مساجد سے زیادہ نہیں تو پھر زائرین ان مساجد کی زیارت کے لئے کیوں جاتے ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں جب کہ شریعت میں اس طرح کا کوئی حکم وارد نہیں ہوا ہے۔ تو کیا کہ ان مساجد کی زیارت کے لئے سفر کرنا بدعت قرار پائے گا۔ اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے:

ان مساجد کے دیدار کے لئے سفر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ شریعت نے ان مساجد کے لئے کوئی حکم دیا ہے یا ان مساجد میں نماز پڑھنے کی زیادہ فضیلت ہے۔ اس سفر کے محرکات دو ہیں:

۱۔ صدر اسلام کے مسلمانوں کی جانفشانی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یہ سفر کیا جاتا ہے اور مسلمان وہاں جا کر یہ دیکھتے ہیں کہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں نے جنگ خندق کے نامساعد حالات میں کس طرح سے نماز قائم کی تھی اور جہاد کو بھی جاری رکھا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کچھ مساجد ایسی بھی ہیں جو ان مقامات پر تعمیر ہوئی ہیں جہاں لشکرِ اسلام لشکرِ کفر و یہود کے مقابلے پر نبرد آزما تھا اور مسلمان وہاں جا کر یہ دیکھتے ہیں کہ جب مشرکین کا پہلوان ''عمرو بن عبدود'' واصل جہنم ہوا تھا تو مشرکین کی ہمتیں کیسے پست ہوئی تھیں۔

چنانچہ ان تاریخی مراکز کی زیارت کی وجہ سے ہمارے حوصلوں کو مہمیز ملتی ہے اور ان مقامات پر ہم تجدید عہد کرنے جاتے ہیں اور راہ توحید کے شہدا سے جن کا خون وہاں بہا ہے یہ عہد کرتے ہیں کہ ان کے راستے پر چلتے رہیں گے۔

۲۔ ان مساجد کی زیارت کا دوسرا محرک یہ ہے کہ راہِ توحید کے شہداء کا خون ان مقامات پر بہا ہے۔ اسی لئے زائرین وہاں تبرک کے قصد سے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سرزمین شہیدانِ راہ حق کی پامردی کی گواہ ہے۔ چنانچہ یہ وہ دو محرکات ہیں جو لوگوں کو ان مساجد کی زیارت پر آمادہ کرتے ہیں اسی طرح سے خیبر و فدک جیسے مقامات کے محرکات بھی یہی ہیں۔

جہاں تک ان مساجد میں نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو اس کا تعلق بھی ایک حکمِ الٰہی سے ہے جس کا تعلق ایک کلیہ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بھی انسان کسی مسجد میں جائے تو وہاں دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھے۔

مذکورہ مساجد کے سفر سے زائرین کا ہدف یہ نہیں ہوتا کہ وہ وہاں جا کر نماز ادا کریں گے البتہ جب وہ مسجد میں قدم رکھتے ہیں تو پھر ایک عمومی حکم کے تحت وہ ان مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۲

قبور پر قبہ بنانا

سوال: کیا قبروں پر عمارت بنانا جائز ہے؟

جواب: اولیائے الٰہی کی قبور پر عمارت تعمیر کرنا جائز ہے جسے بہت سے دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ہم کچھ دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔قبور انبیاء کی حفاظت کے لئے سلف صالح کا کردار

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اولیاء وانبیاء کی قبور کی حفاظت کے لئے عمارتیں بنانا انسان کا پرانا وطیرہ ہے۔ چنانچہ ستارۂ اسلام کے طلوع سے قبل انبیائے بنی اسرائیل کی قبور پر عمارتیں بنائی گئی تھیں اور جب مسلمانوں نے فلسطین، اردن وشام کے علاقوں کو فتح کیا تو انہوں نے بھی ان مزارات کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھا تھا اور آج تک یہ حالت قائم ہے۔ مسلمانوں نے انبیاء کے مزارات پر نہ تو کوئی اعتراض کیا تھا اور نہ ہی انہیں ویران کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے ان کی تعمیر نو میں فعال کردار انجام دیا اور مزارات کی خدمت وحفاظت کے لئے ملازمین مقرر کیے جو مزارات کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔

۲۔آثار کی حفاظت درحقیقت اصلیت کی حفاظت ہے۔

آثار کو محفوظ رکھنے میں عظیم فوائد مضمر ہیں۔ بالخصوص حضرت رسول مقبولؐ کا مدفن،

آپ کی ازدواج، اولاد، صحابہ اور جن گھروں میں آپ نے زندگی بسر کی اور جن مساجد میں آپؐ نے نمازیں ادا کیں ان تمام آثار کو محفوظ رکھنے میں اسلام اور مسلمانوں کی عظمت مضمر ہے اس نکتہ کو سمجھانے کے لئے ہم مختصر سا مقدمہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو یہ دنیا چھوڑے دو ہزار سال گذر چکے ہیں۔ آج حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ اور ان کی کتاب انجیل اور ان کے حواریوں کے وجود کو مغرب میں ایک تاریخی افسانہ کا نام دیا جا رہا ہے اور حالت یہ ہو چکی ہے کہ کچھ مستشرقین ایک ایسے شخص کے وجود میں جس کا نام مسیح ہو، اُن کی ماں کا نام مریم ہو اور اس کی کتاب کا نام انجیل ہو شک کرنے لگے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ''لیلیٰ مجنوں'' کی طرح سے ایک افسانہ ہے جو لوگوں کے تخیلات کی پیداوار ہے۔

حضرت مسیحؑ کے وجود کو لوگ افسانہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں حضرت مسیحؑ کا کوئی ظاہری نشان دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً جہاں آپ پیدا ہوئے تھے اس جگہ کو آج تک متعین نہیں کیا گیا اور جس گھر میں پلے بڑھے تھے وہ گھر کہیں دکھائی نہیں دیتا اور نصرانی عقیدہ کے مطابق جہاں دفن ہوئے تھے اس جگہ کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی۔ ان کی آسمانی کتاب بھی تحریف سے محفوظ نہ رہ سکی اور جہاں تک اناجیل اربعہ کا تعلق ہے ان سب میں حضرت مسیحؑ کا صلیب پر چڑھنے اور ان کے دفن ہونے کے واقعات موجود ہیں جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان اناجیل کی تدوین حضرت مسیحؑ کے بعد عمل میں لائی گئی تھی۔ بہت سے ماہرین ادبیات ان اناجیل کو دوسری صدی عیسوی کی کتابیں قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر حضرت مسیحؑ کے تمام آثار محفوظ ہوتے تو روزِ روشن میں خواب دیکھنے والوں اور شک کرنے والوں کے لئے شک کا موقع نہیں تھا۔ اس کے برعکس مسلمان دنیا کے لوگوں سے کھل کر کہتے ہیں کہ سرزمین حجاز میں آج سے چودہ صدیاں پہلے ایک صادق وامین انسان کو انسانی رہنمائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور اس نے

بڑی کامیابی حاصل کی تھی اور اس انسان کی زندگی کی تمام خصوصیات محفوظ ہیں۔ اس انسان کی زندگی میں معمولی سا نقطہ ابہام بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جس گھر میں آپ پیدا ہوئے تھے وہ گھر بھی موجود ہے اور یہ وہ کوہِ حرا ہے کہ جہاں آپؐ پر وحی نازل ہوئی تھی۔

اور یہ وہ مسجد ہے جس میں آپ نے نمازیں پڑھی تھیں اور یہ وہ گھر ہے جس میں آپ مدفون ہوئے اور یہ ان کی اولاد اور ازواج اور رشتہ داروں کے گھر ہیں اور یہ ان کی اولاد، اوصیاء خلفاء اور ازواج کی قبریں ہیں۔

اگر خدانخواستہ ہم آنحضرتؐ کے ان آثار کو مٹادیں تو ہم نے صرف آثار کو نہیں مٹایا بلکہ اصالت کو مٹایا ہے اور ہم اپنے اس عمل سے دشمنانِ اسلام کو موقع فراہم کریں گے کہ وہ آنحضرتؐ کے وجود کو بھی افسانوی اور تخیلاتی وجود کہنے لگیں۔

آثار مٹانے کی حرکت جہاں مظاہر اسلام و اصالت رسالت کو مٹانے کے مساوی ہے۔ وہاں یہ بے ادبی اور گستاخی کی بھی مظہر ہے۔

اسلام کا آئین ابدی اور جاودانی ہے اور یہ روز قیامت تک تمام انسانوں کے لئے آئینِ ہدایت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ آثار رسالت کو محفوظ رکھا جائے تاکہ اس کی وجہ سے دین کو بقا ملے اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنے نبی اور ان کی تاریخ پر یقین کامل ہو چنانچہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح شکوک وشبہات سے دوچار ہوجائے۔

۳۔ انبیاء کے گھرانوں کی بلندی

قرآن مجید کی سورۂ نور میں ایک آیت ہے جسے آیتِ نور کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ کے نور کو ایسے زبردست چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے جو روشن ستارہ کی مانند چمک رہا ہو۔ اس کے بعد والی آیت میں اللہ نے اس نورانی مشعل کا ظرف بیان کیا ہے کہ یہ نورانی مشعل ایسے گھروں میں

ہے جن کی بلندی کا خدا نے حکم دیا ہے اور ان گھروں میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور وہاں صبح شام خدا کی تسبیح ہوتی ہے۔

فِي بُيُوتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (سورۂ نور/۳۶)

(یہ چراغ نوران گھروں میں روشن ہے جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے۔اور وہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے ان گھروں میں صبح شام خدا کی تسبیح کی جاتی ہے)۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان گھروں سے ''مساجد'' مراد نہیں ہیں کیونکہ ''بیت'' اور ''مسجد'' میں فرق ہے۔ بیت اس گھر کو کہا جاتا ہے جہاں ''بیتوتہ'' کیا جائے یعنی شب بسری کی جائے۔ انسانی مسکن کو بیت کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں انسان شب بسری کرتے ہیں۔

قران کریم نے جہاں بھی مسلمانوں کی عبادت گاہ کا تذکرہ کیا تو اسے لفظ ''مسجد'' یا ''مساجد'' سے تعبیر کیا۔ چنانچہ پورے قران میں لفظ مسجد جمع اور واحد کی شکل میں اٹھائیس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

جب کہ لفظ ''بیت'' واحد یا جمع کی صورت میں چھیاسٹھ(۶۶) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرانی زبان میں بیت اور مسجد دو علیحدہ علیحدہ مقامات کے نام ہیں اور ان دونوں کو ایک قرار دینا ایک دعویٰ بلا دلیل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ''بیوت'' سے انبیاء، اولیاء اور خدا کے پیارے انسانوں کے گھر مراد ہیں جن میں وہ لوگ رہ کر صبح شام خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔

جلال الدین سیوطی انس بن مالک سے نقل کرتے ہیں کہ جب رسول خداؐ نے ''فی بیوت اذن اللہ ان ترفع'' کی آیت کی مسجد میں تلاوت کی تو آپ کے صحابہ میں سے ایک صحابی اٹھا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! اس سے مراد کون سے گھر ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: اس سے انبیاء کے گھر مراد ہیں؟

اس وقت حضرت ابوبکر کھڑے ہوئے اور حضرت علیؑ و بتولؑ کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا: یارسول اللہؐ! یہ گھر بھی ان گھروں میں شامل ہے جن کی قدر و منزلت کا خدا نے حکم دیا ہے؟

رسول اکرمؐ نے فرمایا: جی ہاں یہ ان میں سے برترین گھر ہے۔(۱)

اس بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ "فی بیوت اذن اللہ ان ترفع" کی آیت میں جن بلند مرتبہ گھروں کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مساجد کی بجائے انبیاء کے گھر مراد ہیں۔

سوال یہ ہے کہ "اذن اللہ ان ترفع (اللہ نے جن کے بلند کرنے کی اجازت دی ہے) سے کیا مراد ہے؟ یہاں دو احتمال ہیں:

۱۔ رفع سے رفعِ حسی مراد ہے۔

۲۔ رفع سے رفع معنوی مراد ہے۔

احتمال اول کے مطابق اس سے مراد یہ ہوگی کہ ان گھروں کی دیواریں بلند کی جائیں اور ان پر چھت ڈالی جائے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: "رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾" (سورۂ نازعات/۲۸) (اس کی چھت کو بلند کیا اور اسے منظم بنایا)

قرآن مجید نے جن گھروں کا تذکرہ کیا ہے ان پر پہلے سے چھت بھی تھی اور ان کی دیواریں بھی تھیں اس لئے اس "ترفیع" سے معنوی بلندی مراد ہے۔ یعنی ان گھروں کی رفعت و منزلت۔ مقصد آیت یہ ہوگا کہ خدا ان گھروں کی رفعت و منزلت کا حکم دیتا ہے اور اس رفعت و منزلت کا تقاضا یہ ہے کہ ان گھروں کا احترام کیا جائے اور اگر وہ بوسیدہ ہوجائیں تو ان کی تعمیرِ نو کرنی چاہیے۔

(ان گھروں کا احترام ان افراد خانہ کی وجہ سے ہے جو ان میں رہائش پذیر ہیں اور جو

۱۔ درمنثور جلد ۶ ص ۲۰۳

خدا سے راز و نیاز میں مصروف رہتے ہیں اور جن کی صبح و شام خدا کے ذکر وفکر میں ہوتی ہے۔ خرید و فروخت اور دنیاوی کاروبار جنہیں اللہ کے ذکر اور نماز اور زکوۃ سے غافل نہیں کرسکتا۔

چنانچہ ایسی بزرگوار شخصیات کی وجہ سے خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کے آثار کا احترام واکرام کیا جائے اور انہیں ویرانی اور آلودگی سے محفوظ رکھا جائے)۔

ہم سب جانتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ اپنے گھر میں مدفون ہیں۔ اس گھر میں آپ ہمیشہ خدا کا ذکر کرتے تھے۔ آپ کا گھر اس آیت کے حکم کے تحت محترم قرار پاتا ہے اور اس گھر کو خراب کرنا یا ویران کرنا قرآن حکیم کے صریحاً خلاف ہے۔

آنحضرتؐ کے علاوہ مدینہ کے بہت سے گھر ایسے ہیں جنہیں عظیم شخصیات کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ صحیح روایت کے مطابق حضرت خاتون جنت سلام اللہ علیہا کو بھی ان کے گھر میں دفن کیا گیا تھا (۱)۔ وہ گھر آج بھی روضہ رسول کے ساتھ متصل ہے اور موجود ہے۔

امام علی نقی اور امام حسن عسکریؑ بھی اپنے انہی گھروں میں مدفون ہیں جہاں وہ خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آیت قرآنی کے مطابق یہ گھر عزت واحترام کے قابل ہیں اور انہیں ویران کرنا حکم خداوندی کے خلاف ہے۔

چند برس پہلے تک مدینہ منورہ میں محلہ بنی ہاشم کے آثار موجود تھے اور حسنین کریمین کے گھر اور امام جعفر صادقؑ کا مدرسہ بھی موجود تھا اور ۱۳۳۵ھ ہجری شمسی میں میں نے خود ان گھروں کی زیارت کی تھی پھر مسجد نبوی کی توسیع کے بہانے سے اسے مسمار کردیا گیا۔ حالانکہ مسجد نبوی کی توسیع ان آثار کی حفاظت کے منافی نہیں ہے۔

۴۔ قبور کی دیکھ بھال مہر و محبت کی علامت ہے۔

حضرت رسول اکرمؐ اور آپ کے اہل بیتؑ کی محبت اسلام کا بنیادی جز ہے اور اس کا تعلق

۱۔ الکافی جلد اول ص ۴۶۱

اسلام کے مؤکد اصول سے ہے۔ اس کے متعلق آیات و روایات گواہی دیتی ہیں۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"ثَلاثٌ مَنْ کُنَّ فِیهِ وَجَدَ حَلاوَةَ الإِیمانِ وَطَعْمَه اَنْ یَکونَ اللهُ وَرَسُولُهُ احبَّ الیهِ مِمّا سِواهُما..." (۱)

(تین صفات ایسی ہیں جس میں یہ صفات ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت اور ذائقہ کو محسوس کرے گا۔ ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ اس کو خدا اور اس کا رسولؐ تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہوں......)

پیغمبر اکرمؐ سے محبت کے کچھ تقاضے ہیں جن میں سے کچھ کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔ تقاضے حسب ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرتؐ کے فرامین کو عام کرنا اور ان پر عمل کرنا

۲۔ آنحضرتؐ کے آثار کو محفوظ کرنا

۳۔ ان کی قبور پر روضہ تعمیر کرنا

مذکورہ بالا امور محبت کو ظاہر کرتے ہیں

مشہور محدث ابوعیسیٰ ترمذی نے اپنی سنن میں یہ روایت نقل کی ہے:

"انّ النّبِی اَخَذَ بِیَدِالحَسَنَ وَالحُسَینَ وَقالَ: مَنْ اَحَبَّنِی وَاَحبَّ هٰذَیْنِ الغُلامَیْنِ وَاَبَاهُما وَاُمَّهُما کانَ مَعی فی دَرَجَتی یَومَ القِیامَة." (۲)

رسول اکرمؐ نے حسنؑ و حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

جس نے مجھ سے محبت کی اور میرے ان دو بچوں اور ان کے والد اور ان کی والدہ سے محبت کی تو وہ قیامت کے دن میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا۔

۱۔ جامع الاصول جلد اول ص ۷ ۳ حدیث ۲۲ (حدیث ۲۰۔۲۱ کی طرف بھی رجوع کیا جاسکتا ہے)۔

۲۔ جامع الاصول جلد ۹ ص ۷ ۱۵ حدیث ۶۷۰۶

HASAN ALI BOOKS PK

ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سبط اکبر امام حسنؑ سرزمینِ بقیع میں مدفون ہیں اور سبطِ اصغر امام حسینؑ کربلا میں دفن ہیں اوران کی قبریں روزِ اول سے ہی مسلمانوں کی زیارت گاہ رہی ہیں۔ان کی مزارات پر سائبان بنانا پیغمبر اکرمؐ کے شاہزادوں سے محبت کا عملی ثبوت ہے اور جو بھی یہ کام کرے گا فرمانِ رسول کے تحت وہ قیامت کے دن آنحضرتؐ کے ساتھ ان کے درجہ میں ہوگا۔

دنیا کی زندہ قومیں اپنے رہبروں اور ہیروز (خواہ وہ فوجی ہوں، سیاسی ہوں یا مصلح ہوں) کی یادگاریں قائم کرتی ہیں اور لوگ اپنے رہبروں کی موت کے موقع پر ان کے جنازوں میں بھرپور طریقہ سے شرکت کرتے ہیں اور صاف ستھرے مقام پر خوبصورت عمارتوں میں انہیں دفن کرتے ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کے اذہان میں اپنے ہیروز کا احترام قائم رہے۔

دنیا کی باقی زندہ قوموں کی طرح سے ہم مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنے رہبروں کے عالی شان مزارات بنا کر انہیں خراجِ تحسین پیش کریں۔

۵۔اصحاب کہف اوران کی قبور پر عمارت کی تعمیر

جب تین سو اور کچھ برس بعد لوگوں کو اصحاب کہف کا علم ہوا تو وہ مشتاقانہ واران کے غار کی طرف دوڑ پڑے اوراُن لوگوں کے دو گروہ بن گئے:

ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ہم ان کی قبور پر ایک یادگار بنائیں اور اس طرح ان کی تکریم کریں۔دوسرا گروہ کہتا تھا کہ جس غار میں ان کے اجسام پوشیدہ ہیں ہم اس پر مسجد تعمیر کریں گے۔

قرآن کریم نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

"فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾" (سورۂ کہف/۲۱)

(انہوں نے کہا کہ ان پر عمارت تعمیر کرو۔ان کا رب انہیں بہتر جانتا ہے اور جو لوگ ان

کے معاملہ پر غالب آئے انہوں نے کہا کہ ہم ضرور ان پر مسجد بنائیں گے)۔

آیت مجیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی قبروں پر روضے بنانے کا رواج تھا اور مسجد بنانے کا رواج بھی موجود تھا۔ البتہ پہلا نظریہ ان کا تھا جو مومن نہیں تھے اور دوسرا نظریہ ان کا تھا جو مومن تھے۔(۱)

دوسری تجویز یعنی مسجد بنانے کی تجویز موحدین کی طرف سے تھی کیونکہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ جب اصحاب کہف تین سو نو برس بعد نیند سے بیدار ہوئے تو انہوں نے ایک فرد کو شہر روانہ کیا۔ جب وہ شہر پہنچا تو شہر کی حالت ہی بدل چکی تھی لوگ مسیحؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی یہ انقلاب کیسے آ گیا کہ مشرکین کا شہر جہاں عقیدہ توحید رکھنا تک جرم تھا اس میں اتنی بڑی مقدار میں مومن کیسے پیدا ہو گئے۔(۲) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دینی اوضاع کی اس تبدیلی کے متعلق فرمایا:

"قال الذین غلبوا علی امرھم. ..." یعنی اس گروہ نے کہا جو پہلے گروہ پر غالب تھا۔ مقصد یہ ہے کہ جو گروہ فکر، عقیدہ اور آئیڈیالوجی کی وجہ سے غالب آ چکا تھا اور اس سے سیاسی غلبہ مراد نہیں ہے۔ کیونکہ مسجد کی تجویز یہ بتاتی ہے کہ یہ تجویز دینے والا گروہ دیندار افراد پر مشتمل تھا اور وہ گروہ دوسرے گروہ پر غالب آیا تھا۔ اور غالب گروہ اہل اقتدار کا گروہ نہیں تھا۔ اگر وہ گروہ اہل اقتدار پر مشتمل ہوتا تو وہ اس طرح کی گفتگو نہ کرتا۔ کیونکہ اہل اقتدار کی گفتگو کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا۔(۳)

۱۔ تفسیر طبری جلد ۱۵ ص ۲۲۵، تفسیر قرطبی اور تفسیر کشاف اور غرائب القرآن نیشاپوری کی طرف رجوع فرمائیں۔ مذکورہ تمام مفسرین نے لکھا کہ پہلی تجویز مشرکین کی تھی جبکہ دوسری تجویز موحدین کی تھی۔

۲۔ تفسیر طبری ۱۵ ص ۲۲۵

۳۔ ناصر الدین البانی ایک وہابی مؤلف ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "تحذیر الساجد" میں آیت کی دلالت سے صرف نظر کرتے ہوئے لکھا کہ مسجد کی تجویز اہل اقتدار گروہ نے پیش کی تھی۔ جب کہ طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ تجویز ان لوگوں نے پیش کی تھی جو آئین شرک پر غالب آئے تھے۔

(اوراس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اقتدار کی زبان اور منطق ہی جدا ہوتی ہے)

یہ آیت مجیدہ دو وجوہات کی بنا پر ہماری سند بن سکتی ہے۔

الف۔قران مجید نے ایک گروہ کی اس تجویز کو نقل کیا ہے کہ ہم یہاں ایک عمارت تعمیر کریں گے۔قران مجید نے اس گروہ کی تجویز کو ضرور نقل کیا ہے لیکن اس تجویز کی مذمت نہیں کی۔ اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ قبور پر عمارت بنانا جائز ہے۔اگر عمارت بنانا حرام ہوتا تو قران اس تجویز کی مذمت کرتا۔

اگر آپ قران کریم کی روش کا مطالعہ کریں تو جہاں بھی وہ کسی کی غیر صحیح بات کو نقل کرتا ہے تو اس پر تنقید ضرور کرتا ہے۔البتہ اگر اس کی غلطی واضح ہو تو پھر خاموش رہتا ہے۔

مثلاً جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس وقت اس نے یہ کہا تھا:

"اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴿۹۰﴾

(سورۂ یونس/۹۰)

(میں ایمان لاتا ہوں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں)

قران چاہتا ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان لحات کا ایمان فائدہ مند ہے اسی لئے قران نے اس پر فوراً تنقید کی اور کہا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴿۹۱﴾ (سورۂ یونس/۹۱)

اب ایمان لاتا ہے جب کہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسدین میں سے تھا۔

ب۔قران کریم نے اصحاب کہف کے غار پر مسجد بنانے کی تجویز کو ان لوگوں سے منسوب کیا ہے جو مشرکین پر غالب آچکے تھے۔اور اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اس گروہ نے یہ تجویز اپنی شریعت کے تقاضوں کے تحت پیش کی تھی۔اس حقیقت سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں کہ آسمانی شرائع

کے اصول وقواعد یکساں ہیں البتہ جزئیات اور کیفیات میں کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے۔(۱)

اسی لئے ہمارے فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ سابقہ شریعتوں کے ثابت شدہ احکام ہمارے لئے حجت ہیں مگر یہ کہ ان کے منسوخ ہونے پر کوئی مضبوط دلیل موجود ہو۔

ہمارے بیان کردہ پانچ دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

الف۔ انبیائے سابقین کی قبور کی حفاظت کے لئے مسلمان سلف صالحین کا عمل۔

ب۔ آثار کا محفوظ رکھنا، اصالت کے محفوظ رکھنے کے مساوی ہے۔

ج۔ اولیائے الٰہی کی قبور پر روضے تعمیر کرنا ''ترفیع بیوت'' کی ایک شکل ہے۔

د۔ اولیائے الٰہی کے آثار کو محفوظ رکھنا ان سے محبت ومودت کی دلیل ہے۔

ہ۔ اصحاب کہف کی غار پر عمارت تعمیر کرنے اور مسجد تعمیر کرنے کی تجویز۔

الغرض دلائل بالا سے اچھی طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولیائے الٰہی کی قبور پر عمارت قائم کرنے میں کوئی شرعی اشکال نہیں ہے بلکہ یہ بات خداوند عالم کو مرغوب ومطلوب ہے۔

اب آخر میں ہم اس حدیث کا جائزہ لیتے ہیں جس پر وہابیوں کا سارا دارومدار ہے۔

قبور کی ویرانی کے لئے وہابیوں کی دلیل

اب تک ہم نے قرآن وسنت اور مسلمانوں کی عملی سیرت سے مزارات کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم وہابیوں کی سب سے مضبوط دلیل کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھیں۔ مسلم نے اپنی صحیح میں ''ابی الھیاج اسدی'' سے نقل کیا کہ

"قَالَ لی عَلی بن ابی طالب الاابعثكَ عَلٰی مٰابعثنی عَلَیْهِ رَسُولُ اللهِ،اَنْ

۱۔ قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ سے بیان کیا۔"ولکل جعلنا شرعة ومنھاجا"۔(حوالہ غلط ھے) المائدہ/۴۸۔(ہم نے ہرامت کے لئے ایک آئین وروش مقرر کی ہے)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح واصول کے اعتبار سے خدا کا فیضان ایک ہی ہے البتہ اختلاف شکل وصورت وطریقہ میں پایا جاتا ہے۔

لاتدع تمثالاً الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ۔(۱)

علی بن ابی طالب نے مجھ سے فرمایا کیا میں تمہیں اس مشن پر نہ بھیجوں جس پر رسول خدا نے مجھے بھیجا تھا تم جس بھی (ذی روح کی) تصویر کو دیکھو تو اسے مٹا ڈالو اور جس بھی بلند قبر کو دیکھو اسے برابر کردو۔

چنانچہ بنائے قبہ وقبور کے مخالف اس حدیث کو قبہ ومزارات بنانے کی حرمت کی دلیل قرار دیتے ہیں اور شوال ۱۳۴۴ھ کو انہوں نے اسی حدیث کو بنیاد بنا کر ائمہ بقیع کی قبور کو ویران کیا تھا۔ اسی روز روزنامہ ''ام القریٰ'' میں سوال جواب کیے گئے اور مزارات کی ویرانی کے لئے اسی حدیث کو پیش کیا گیا۔

ہم اس حدیث کی صحت استدلال کے لئے اس حدیث کا از روئے سند و از روئے دلالت تجزیہ کرتے ہیں:

الف۔ سند حدیث

اس روایت کے راوی حسب ذیل ہیں

۱۔وکیع ۲۔سفیان ثوری ۳۔حبیب بن ابی ثابت ۴۔ابووائل

۵۔ابوالھیاج اسدی

اس حدیث کا پہلا راوی ''وکیع'' ہے اس کے متعلق یہ کافی ہے کہ مشہور محدث احمد بن حنبل یہ کہتے ہیں:

''وکیع نے پانچ سو احادیث میں غلطی کی ہے(۲)

۱۔صحیح مسلم جلد ۳ ص ۶۱۔کتاب الجنائز۔سنن ترمذی جلد ۲ ص ۲۵۶ باب ماجاء فی تسویۃ القبور۔سنن نسائی جلد ۴ ص ۸۸ باب تسویۃ القبر

۲۔تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی جلد ۱۱ ص ۱۲۵، ۱۳۱

HASSAN ALI BOOK DEPOT

ابن حنبل نے مزید کہا کہ ''وکیع'' حدیث بالمعنی بیان کرنے کا عادی تھا اور وہ احادیث سے کافی آشنائی نہیں رکھتا تھا (۱)۔

اس حدیث کا دوسرا راوی ''سفیان ثوری'' ہے۔ اس کے متعلق اتنا جاننا کافی ہے کہ ابن حجر نے اسے ''مدلّس'' کہا ہے اور ''ابن مبارک'' سے یہ قول نقل کیا ہے کہ سفیان احادیث بیان کر رہا تھا جب میں اس کی مجلس میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ نقل حدیث میں ''تدلیس'' کر رہا ہے۔ جیسے ہی اس کو مجھ پر نظر پڑی تو بڑا شرمندہ ہوا (۲) ''تدلیس'' کی خواہ کوئی کچھ بھی تفسیر کیوں نہ کرے مگر وہ ملکہ عدالت سے مناسب نہیں رکھتی۔ (۳)

اس حدیث کا تیسرا راوی ''حبیب بن ابی ثابت'' ہے اس کے متعلق ابن حبّان نے عطا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حدیث میں تدلیس کرتا تھا۔ اس کی احادیث قابلِ اتباع نہیں ہیں۔ (۴)

اس حدیث کا چوتھا راوی ''ابو وائل'' ہے جس کا اصل نام شقیق بن سلمہ اسدی کوفی ہے۔ یہ شخص حضرت علیؑ کا بدترین دشمن تھا۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ وہ امیر المومنین کے دشمنوں میں سے تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تو علی سے محبت رکھتا ہے یا عثمان سے؟ اس نے کہا کہ کسی زمانہ میں علی سے محبت رکھتا تھا لیکن اب عثمان سے محبت رکھتا ہوں (۵)

اس حدیث کا پانچواں راوی ''ابو الھیاج اسدی'' ہے اس کا نام حیان بن حصین ہے۔ اگرچہ کتب رجال میں اس کی تضعیف مرقوم نہیں ہے لیکن ترمذی نے اس سے کوئی حدیث نقل نہیں

۱۔ تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی جلد ۱۱ ص ۱۲۵، ۱۳۱

۲۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۵

۳۔ ''تدلیس'' کا مقصد ہے کہ سند کے عیب کو چھپانا۔ تیسیر مصطلح الحدیث ص/ ۷۸

۴۔ تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۷۸

۵۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۶۲

کی اور صحاح ستہ میں بھی اس سے مذکورہ حدیث کے علاوہ اور کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔(۱)

ب۔ دلالتِ حدیث

اسناد کے لحاظ سے یہ حدیث ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ جس حدیث کے راوی خطائی الحدیث اور تدلیس سے متہم ہوں اسے بنیاد بنا کر حکمِ شرعی کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم رواۃ سے بالفرض چشم پوشی بھی کرلیں تو بھی اس حدیث سے جو کچھ وہابی ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ مطلب پھر بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے سمجھنے کے لئے دو کلمات کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے:

۱۔ قبراً مشرفاً ۲۔ اِلاَّ سوّیتہ

پہلے لفظ ''مشرفاً'' کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ لفظ ''مشرف'' مادہ شرف سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی و برتری حاصل کرنے والے کے ہیں یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ خاندان بالخصوص اولادِ رسول کو لفظ "شریف" سے پکارا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اونٹ کا کوہان چونکہ اس کے باقی بدن سے بلند ہوتا ہے اس پر بھی لفظ ''شرف'' کا اطلاق کیا جاتا ہے(۲)

کتاب تاج العروس میں مرقوم ہے: الشرف: بلندی اور اعلیٰ مکان اونٹ کا کوہان، اونچے محلوں کے کنگرے: شرف بلندی اور بلند مکان کے معنی میں ہے اونٹ کے کوہان کو شرف کہا جاتا ہے اور بلند نقاط اونچے محلوں غرض اونچی دیواروں کو بھی 'شرفہ' کا نام دیا جاتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ لفظ "مشرفا" سے ہر طرح کی بلندی مراد ہے یا کوئی مخصوص قسم کی بلندی مراد ہے جو کہ اونٹ کے کوہان یا مچھلی کی پشت کی طرح سے بلند ہو؟ جب ہم اس حدیث کے لفظ "سویتہ" کو دیکھتے ہیں تو اس سے مخصوص بلندی متعین ہوتی ہے۔

۱۔ تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۶۷۔ شرح صحیح مسلم نووی جلد ۷ ص ۴۱۔ ذہبی نے بھی میزان الاعتدال میں اس حدیث کے رواۃ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم بغرض اختصار اسے نقل نہیں کر رہے۔

۲۔ تاج العروس جلد ۲۳ مادہ شرف۔

حدیث میں دوسرا لفظ "سَوَّیْتَهٗ" ہے۔ حدیث میں استعمال ہونے والا یہ لفظ "تسویہ" مصدر سے مشتق ہے اور عربی زبان میں اس لفظ کے دو معانی ہیں۔

ا۔ کمیّت و کیفیت میں دو چیزوں کو ایک دوسرے سے مساوی بنانے کو لفظ "تسویہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً طول میں خط متوازی۔ یا دو سیب بلحاظ وزن برابر ہوں۔

لفظ تسویہ سے "سوّٰی" فعل مشتق ہے۔ اس فعل کو دو مفعولوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مفعول دوم کو "با" جیسے حرف جر سے نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً "سوّٰی هذا بهذا" اس نے ان دو چیزوں کو باہم برابر کر دیا۔ (۱)

۲۔ کسی ناہمواری اور کجی یا پستی و بلندی کو برابر کرنے کے لئے بھی لفظ "سوّٰی" استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں اس کا صرف ایک ہی مفعول ہوتا ہے اور اسے مفعول ثانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً جب کوئی بڑھئی لکڑی کی اونچ نیچ کو برابر کر دے تو اس وقت کہا جاتا ہے "سوّی الخشب" اس نے لکڑی کو برابر کر دیا۔ (۲)

تسویہ کے ان دو مفاہیم میں واضح فرق ہے۔ اس کے پہلے مفہوم میں "مساوات" مطلوب ہوتی ہے جس کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے مفہوم میں یہ ایک ایسا وصف ہے جو ایک چیز کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ مثلاً کسی لکڑی کی اونچ نیچ کو ہموار کرنا۔ اس میں کسی سے موازنہ مطلوب نہیں ہوتا۔

اس ابتدائی بحث کے بعد حدیث کے الفاظ "مشرفاً" اور "سویتہٗ" کا مفہوم ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے مفہوم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث بذات خود کیفیت قبر سے تعلق رکھتی ہے۔ (اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں اس کا ایک مفعول بیان ہوا ہے) اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جس بلند و بالا قبر کو دیکھو تو اسے زمین کے برابر کر دو۔

۱۔ جیسا کہ "اذ نسویکم برب العالمین" شعراء/۹۸

۲۔ مثلاً یہ آیت "الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾" سورہ اعلیٰ/۲، یا "فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" البقرہ/۲۹

اور اگر یہی حکم دینا مقصود ہوتا تو حدیث کے الفاظ یہ ہوتے "الا سویتہ بالارض"

امیر المومنینؑ نے ابوالھیاج کو اس مشن پر روانہ کیا تھا کہ تمہیں جس قبر میں ناہمواری اور بلندی وپستی دکھائی دے (جیسا کہ کوہان نما اور پشت ماہی کی مانند بنی ہوئی قبروں میں ہوتی ہے) تو اس کو صاف کردو اور اسے مسطح شکل میں لے آؤ۔ یہ حدیث اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ مسلمان کی قبر کو مسطح ہونا چاہیے اسے اونٹ کی کوہان یا پشتِ ماہی کی مانند نہیں ہونا چاہیے۔

اس حکم کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اس زمانہ میں قبور کی سطح ہموار نہ ہوتی تھی اور وہ درمیان میں اونٹ کے کوہان کی مانند بلند ہوتی تھیں یا پشتِ ماہی کی مانند ہوتی تھیں۔ امامؑ نے ابوالھیاج کو حکم دیا کہ وہ قبروں کی اس حالت کو ختم کردیں۔

قارئین کرام! خود انصاف فرمائیں کہ اس حدیث میں قبروں کو مسمار کرنے یا ان کے روضہ جات گرانے کا حکم کہاں دیا گیا؟

جو کچھ ہم نے اب تک بیان کیا ہے اسی مفہوم کو ناقلین حدیث اور شارحین حدیث نے بیان کیا ہے۔

۱۔ مسلم نے اس حدیث کو "باب الامر بستویة القبر" کے زیر عنوان بیان کیا ہے اور اس باب کے عنوان کا معنی یہ ہے "وہ باب جس میں قبر کو صاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے"۔ اس عنوان کے تحت یہ حدیث بیان کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حدیث لکھنے والے کی نظر میں لفظ "مشرف" مسطح کا متضاد ہے اور لفظ "تسویہ" سے قبور کی سطح کو ہموار کرنا مراد ہے۔

۲۔ مسلم نے اسی باب کے آغاز میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ فضالہ بن عبید ایک گروہ کے ساتھ سرزمین روم میں تھا۔ اس کے ایک دوست کی وفات ہوگئی اس نے اسے دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کو مسطح بنایا اور کہا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ قبروں کو مسطح اور مساوی شکل میں بناؤ۔

الغرض یہ قرائن واضح کرتے ہیں کہ لفظ ''مشرفاً'' سے قبر کی سطح زمین سے بلندی مراد نہیں ہے۔اس سے ایک خاص قسم کی بلندی مراد ہے۔(اور یہ اس سے عام ہے کہ وہ زمین سے مساوی ہو یا اس سے بلند یا پست ہو)۔

۳۔نووی اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ قبر کو زمین سے بلند تر یا اس کی سطح کو کوہان نما نہیں ہونا چاہیے بلکہ قبر کو زمین سے ایک بالشت بلند ہونا چاہیے اور اس کے اوپر کا حصہ مسطح ہونا چاہیے۔(۱)

۴۔قرطبی نے اپنی تفسیر میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے قبر کا مسطح ہونا سنت ہے اور کوہان نما ہونا بدعت ہے۔(۲)

۵۔ابن حجر عسقلانی قبر کے مسطح ہونے کے استحباب کے ضمن میں لکھتے ہیں: حدیث ابی الھیّاج کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ قبر بلحاظ سطح زمین کے مساوی ہو حدیث کا مقصد یہ ہے کہ قبر کے اوپر کا حصہ صاف اور مسطح ہو اگرچہ قبر زمین سے بلند ہی کیوں نہ ہو۔(۳)

اگر بالفرض ہم اپنے ان تمام دلائل سے صرفِ نظر بھی کر لیں اور یہ فرض کر لیں کہ حدیث یہ کہتی ہے کہ قبر کو زمین کے برابر کر دیا جائے پھر بھی اس حدیث سے قبور پر قائم عمارات گرانے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اور اس کی دو وجوہات ہیں۔

۱۔قبر کو زمین کے برابر کرنا تمام فقہائے اسلام کی آراء کے خلاف ہے کیونکہ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ قبر کو زمین سے ایک بالشت بلند ہونا چاہیے۔(۴)

۲۔اگر وہابیت کی تعبیر کو بالفرض صحیح مان بھی لیا جائے تو حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ قبر کو

۱۔نووی شرح صحیح مسلم جلد ۷ ص ۴۱

۲۔تفسیر قرطبی جلد ۲ ص ۳۸۰ تفسیر سورہ کہف

۳۔ارشاد الساری جلد ۲ ص ۴۶۸

۴۔الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اول/۴۲۰

زمین کے برابر کر دیا جائے۔ اس کا یہ مفہوم تو نہیں ہے کہ قبر پر بنی ہوئی عمارت کو بھی مسمار کر دیا جائے۔ اس حدیث کا تعلق بنیادی طور پر قبور پر بنی ہوئی عمارت سے ہے ہی نہیں۔ اس کا تمام تر محور اول و آخر قبر ہے اس پر بنا ہوا سائبان اور عمارت اس حدیث کا سرے سے موضوع ہی نہیں ہے۔

قبورِ اولیاءؑ کی تعمیر کے لئے امام صادقؑ کی حدیث

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے اور انہوں نے امام حسینؑ بن علیؑ سے اور انہوں نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے اور انہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''علی! تجھے سرزمین عراق میں شہید کیا جائے گا اور تو وہاں دفن ہوگا''۔

حضرت علیؑ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جو لوگ ہماری قبروں کی زیارت کو آئیں اور انہیں آباد کرنے کی کوشش کریں اور ہمیشہ وہاں آمد و رفت رکھیں، ان کی کیا جزا ہے؟

رسول خداؐ نے فرمایا: ابوالحسن! اللہ نے تیرے مرقد اور تیری اولاد کے مرقدوں کو سرزمین بہشت کا ایک حصہ اور اس کی خاک کا ایک ٹکڑا قرار دیا ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں میں سے چنے ہوئے افراد کو تمہارا ارادت مند قرار دیا ہے۔ وہ لوگ تمہارے لئے اذیت و تکلیف کو برداشت کریں گے اور تمہاری قبور کو آباد کریں گے اور ان کا ہدف خدا کی قربت اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوستی کا اظہار ہوگا۔ (۱)

۱۔ شیخ طوسی، تہذیب الاحکام جلد ۶ ص ۲۲ حدیث ۵۰۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۰ از ابواب مزار باب ۲۶ حدیث اول۔ قارئین سے التماس ہے کہ حدیث کے آخری الفاظ کا اچھی طرح سے مطالعہ فرمائیں۔

۱۳

قبور اولیاء کے پاس نماز پڑھنا

سوال: آیا انبیاء و اولیاء کی قبر کے پاس نماز پڑھنا اور دعا مانگنا جائز ہے؟

جواب: وہابی افراد کو اولیاء و انبیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنے اور دعا مانگنے سے خصوصی چڑ ہے۔ ایک عرصہ قبل وہ اس عمل کو مکروہ کہا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے "الصلاۃ فی المساجد و البیوت افضل منہا عند قبور الاولیاء و الصالحین" اولیاء و صالحین کی قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے مساجد اور گھروں میں نماز پڑھنا افضل ہے۔(۱)

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہابیت کے نظریات میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی اس مسئلے کو مرحلہ وار ممنوع کہا پھر نوبت شرک تک جا پہنچی۔

آیئے قرآن کریم اور سیرت مسلمین سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں تا کہ ہمیں اس مسئلہ کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زائرین بیت اللہ کو حکم دیا ہے کہ وہ مقام ابراہیمؑ پر نماز پڑھیں۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ

۱۔ رسالہ زیارۃ القبور ص ۱۶۰

مُصَلّٰی ۔ (سورۃ البقرۃ ۔۱۲۵)

(اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کی زیارت گاہ اور مقامِ امن قرار دیا۔ مقام ابراہیمؑ کو اپنی نماز کی جگہ بناؤ)۔

سوال یہ ہے کہ آخر خدا نے مقام ابراہیمؑ کو نماز گاہ بنانے کا حکم کیوں دیا؟ اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اس معلمِ توحید سے برکت تلاش کریں؟

تمام مسلمانوں سے سوال ہے کہ کیا مقامِ ابراہیمؑ اور مقامِ پیغمبرؐ میں کوئی فرق ہے؟ اور کیا مقام انبیاء اور اس جگہ جہاں ان کے اجسام مدفون ہیں۔ ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟

۲۔ احادیث بیان کرتی ہیں کہ شبِ معراج آنحضرتؐ نے مدینہ، طور سینا اور بیت اللحم میں نماز ادا کی تھی اور جبرئیل امین نے آپؐ سے کہا تھا: یارسول اللہ! آپؐ کو معلوم ہے کہ آپؐ نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ آپؐ نے ''طیبہ'' میں نماز پڑھی۔ یہ جگہ آپ کی ہجرت گاہ ہوگی۔ آپؐ نے طور سینا یہ نماز پڑھی جہاں خدا نے موسیٰ سے کلام کیا تھا اور آپؐ نے بیت اللحم میں نماز پڑھی جہاں عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ (۱)

اس حدیث پر توجہ کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا نبی کے مقامِ پیدائش اور اس کی آرام گاہ میں کوئی فرق ہے؟ جب کہ مذکورہ آیت اور یہ روایت ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ جو زمین مردانِ توحید و خدا سے تعلق رکھتی تھی یا تعلق رکھتی ہے وہ جگہ بابرکت ہے اور اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہوسکتی ہے کہ انسان اس بابرکت جگہ پر خدا کی عبادت کرے۔

ہم سب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان مقامات پر بندوں کی پوجا مقصود نہیں ہے بلکہ متبرک مقامات پر خدا کی عبادت مقصود ہوتی ہے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک صابر انسان کی جستجو اور ایک صاحبِ ایمان خاتون کے قدموں

۱۔ خصائص کبریٰ جلال الدین سیوطی جلد اول ص ۱۵۴

سے مَس ہونے والی جگہ کو خدا نے عبادت گاہ کا درجہ دیا ہے۔ اور لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس جگہ خدا کی عبادت کریں۔ مثلاً حضرت ہاجرہؑ مادرِ اسماعیل نے خدا کی راہ میں صبر کیا اور تکالیف کا سامنا کیا تو جہاں ان کے قدم لگے تھے، خدا نے اس جگہ کو اپنی عبادت گاہ کا درجہ دیدیا اور حکم دیا کہ بیت اللہ کے زائرین صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں جیسا کہ ہاجرہ دوڑی تھیں۔

خدارا بتائیے کہ جہاں اس عظیم خاتون کے قدم لگیں تو وہ جگہ متبرک بن جائے اور بیت اللہ کے زائرین کے لئے مقامِ عبادت بن جائے اور جہاں نبی اعظمؐ کا وجود مبارک مدفون ہو تو وہ جگہ بابرکت اور مقدس کیوں نہ ہوگی؟ جب کہ رسول خداؐ نے راہِ خدا میں ہاجرہؑ سے زیادہ مصائب و مشکلات کو برداشت کیا تھا!

عجیب بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ کے شاگرد ابن قیم نے نادانستہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے کہا: حضرت ہاجرہؑ اور ان کے فرزند نے دُوری اور تنہائی پر صبر کیا اور ماں اپنے فرزند کے ذبح ہونے پر آمادہ ہوگئی اس کا انجام یہ ہوا کہ ماں اور بیٹے کے قدموں کے نشانات کو خدا نے مومن مردوں اور عورتوں کے لئے عبادت کا مرکز بنادیا۔ یہ خدا کی سنت ہے وہ اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا ہے بلندی عطا کرتا ہے۔ (۱)

۳۔ مسلمان چودہ صدیوں سے قبرِ رسولؐ کے پاس خدا کی عبادت کرتے آرہے ہیں اگر انبیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنا مکروہ یا حرام و باطل ہوتا تو پھر کسی صحابی، تابعی اور کسی عالم نے اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟

اگر کوئی شخص مسجد نبوی میں اصحابِ صُفّہ کے مقام پر نماز پڑھے تو اس کے سامنے قبرِ رسول ہوتی ہے۔ اب کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ ایسی نماز باطل یا مکروہ ہے؟

۱۔ ابن القیم، زاد المعاد جلد اول ص ۱۷ طبع قاہرہ آفسٹ دار الفکر۔ اس کی عبارت یہ ہے "ان عاقبة صبرها جرو ابنها علی البعد والوحدة والغربة والتسلیم الی ذبح الولد آلت الی ما آلت الیه من جعل آثارهما ومواطئ اقدامهما مناسك لعبادة المؤمنین ومتعبدات لهم الی یوم القیامة وهذه سنته تعالیٰ فیمن یرید رفعه من خلقه"

۴۔ہم سب دختر رسولؐ کی عظمت سے واقف ہیں۔حضرت سیدہ کے متعلق رسول اکرمؐ نے فرمایا:

فاطمۃُ بَضعَۃٌ مِنّی فَمَن اغضَبَھا اغضَبَنی (۱)

(فاطمہ میرا حصہ ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا)۔

یہی دخترِ پیغمبر جمعہ کے دن اپنے بزرگوار چچا حمزہؓ کی زیارت کے لئے جاتی تھیں وہاں جا کر نماز پڑھتی تھیں اور قبر کے پاس بیٹھ کر گریہ کرتی تھیں (۲)۔

۵۔حضرت عائشہؓ رسول خداؐ کی زوجہ تھیں۔آنحضرتؐ کی وفات کے بعد وہ کئی سالوں تک زندہ رہیں۔آنحضرتؐ ان کے حجرہ میں دفن ہوئے تھے۔آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بی بی عائشہ اسی حجرہ میں قبرِ مطہر کے پہلو میں نماز پڑھتی رہتی تھیں۔کسی نے بھی ان پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

سمہودی اپنی کتاب ''وفاء الوفا'' میں یہ یاددہانی کرتے ہیں کہ بی بی عائشہؓ نے کہا عمر کی وفات کے بعد جب وہ میرے حجرہ میں دفن ہوئے تو میرے اور مذکورہ تین قبروں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔بعدازاں میرے اور ان قبور کے درمیان دیوار بنادی گئی۔(۳)

بی بی عائشہ کی اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پندرہ برس تک رسول خداؐ کی قبر کے پاس نمازیں پڑھی تھیں اور کوئی تاریخ یہ گواہی نہیں دیتی کہ وہ نماز کے وقت اپنے حجرہ سے باہر نکل کر کسی اور جگہ جا کر نماز پڑھتی تھیں۔

۶۔ہم بخوبی جانتے ہیں کہ حجر اسماعیلؑ (جو کہ خانہ کعبہ کے ساتھ متصل ہے جہاں ''میزابِ رحمت'' کا پانی گرتا ہے) اس جگہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہؑ مدفون ہیں۔اس

۱۔صحیح بخاری جلد ۵ باب مناقب قرابۃ رسول اللہ حدیث ۳۷۱۴

۲۔سنن بیہقی جلد ۴ ص ۷۸ مستدرک حاکم جلد اول ص ۳۷۷

۳۔وفاء الوفا، سمہودی جلد ۲ ص ۵۴۴

کے باوجود کسی فقیہ نے آج تک یہ فتوی صادر نہیں کیا کہ حجر اسماعیل میں نماز مکروہ یا باطل ہے۔

ان حقائق کے باوجود وہابیوں کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ قبورِ شہدا کے پاس نماز پڑھنا حرام جانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں دعا کے وقت حجرہ پیغمبرؐ کی طرف منہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ قبرِ مطہر کی طرف پشت کر کے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگنی چاہیے۔ جب کہ ابو جعفر منصور نے حرم پیغمبرؐ میں فقیہ مدینہ مالک بن انس سے پوچھا تھا: کیا میں قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگوں یا قبرِ رسولؐ کی طرف منہ کر کے خدا سے دعا مانگوں؟

امام مالک نے جواب دیا کہ تم پیغمبر سے کیوں منہ موڑتے ہو جب کہ آنجنابؐ تمہارے اور تمہارے باپ آدمؑ کے لئے وسیلہ نجات ہیں۔ رسولؐ کی طرف منہ کرو اور ان سے شفاعت طلب کرو۔ خدا انہیں تیرا شفیع قرار دے گا(۱)

ہم نے مذکورہ بالا چھ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انبیاء و اولیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنا جائز ہے۔ ہمیں وہابیوں کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ انبیاء و اولیاء کے مشاہد کو بنجر زمین جتنی بھی اہمیت دینے پر آمادہ نہیں ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ بنجر اور ویران زمین پر نماز جائز ہے لیکن انبیاء و اولیاء کے مشاہد میں نماز صحیح نہیں ہے۔

بحث کے اختتام پر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہابی افراد یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رات کے وقت قبروں کے پاس چراغ جلانا حرام ہے۔ اور وہ اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

"لَعَنَ رسولُ اللهِ زائرات القُبُور والمُتَّخِذِین عَلَیهَا المساجدَ والسرجَ"

(رسول خداؐ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے اور ان پر لعنت کی ہے جو انبیاء کی آرام گاہ کو اپنا مقامِ عبادت بناتے ہیں اور جو وہاں چراغ جلاتے ہیں)۔

کس طرح یہ حدیث قابل استدلال ہے۔ جب کہ یہ بات نا قابل تسلیم ہے کہ

۱۔ سمہودی، وفاء الوفا جلد ۴ ص ۱۳۷۶

آنحضرتؐ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہو بلکہ آپؐ خود اپنی زوجہ بی بی عائشہؓ کو ساتھ لے کر زیارت قبور کے لئے جاتے تھے۔

ہر شخص کو فطری طور پر اپنے والدین اور رشتہ داروں سے خصوصی تعلق ہوتا ہے اور موت کے بعد یہ رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا۔ ہر شخص کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیاروں کا احترام کرے اور ان کی قبروں پر جانا ان کے احترام کا مظہر ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ "والمتخذین علیھا المساجد" سے وہ لوگ مراد ہوں جو عام لوگوں کی قبروں کے پاس نماز پڑھتے ہیں۔ یہاں الٰہی شخصیات کی بات نہیں کی گئی اس لئے قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

سابقہ دلائل پر توجہ دینے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء و اولیاء کے مراقد اس سے مستثنیٰ ہیں اگر رسول خداؐ نے قبر پر چراغ جلانے کی ممانعت کی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس روشنی سے کسی کو فائدہ نہ پہنچتا ہو لیکن خواہ مخواہ کی فضول خرچی ہوتی ہو تو اس صورت میں چراغ جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ قرأت قرآن، دعا اور توجہ الی اللہ کے لئے چراغ جلایا جائے تو اس میں حرمت کا کون سا پہلو ہے؟

اتفاقاً شارحین حدیث نے بھی یہی نکتہ بیان کیا ہے۔(۱)

HASSAN ALI

۱۔ سنن نسائی جلد ۳/ ۷۷، جلد ۴/ ۹۵ طبع بیروت۔ شرح جامع صغیر جلد ۲/ ۱۹۸۔

۱۴

پیاروں کی جدائی پر سوگوار ہونا

سوال: مرحوم عزیزوں پر رونے کے لئے اسلام کا کیا حکم ہے؟

جواب: دوستوں اور وابستہ افراد کی موت پر غم کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ جب بھی کسی کا کوئی قریبی رشتہ دار اور دوست دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو انسان غم واندوہ میں ڈوب جاتا ہے اور بے ساختہ آنسو بہانے لگتا ہے۔ آج تک کسی بھی شخص نے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا۔

!سلام دین فطرت ہے اور اس نے کہیں بھی فطرت انسانی کے تقاضوں کی مخالفت نہیں کی۔ اسلام کے تمام احکام فطرت کے تقاضوں پر مبنی ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

" فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ "

(سورۂ روم/۳۰)

(اپنے چہرے کو آئین خالص کے طرف متوجہ رکھیں۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے)۔

یہ بات ناممکن ہے کہ فطرت کے تقاضوں پر مبنی دین دوستوں اور عزیزوں کی موت پر رونے سے منع کرے البتہ شرط یہ ہے کہ غم واندوہ اپنی حدود سے نکل کر خدا کی نارضگی کا موجب نہ ہو۔

جب ہم تاریخ کے اوراق کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور صحابہ وتابعین نے ان ہی فطرت کے تقاضوں پر عمل کیا تھا۔ ذیل میں ہم تاریخ سے کچھ شواہد پیش کرتے ہیں:

رسول خداؐ کے فرزند ابراہیم کی وفات ہوئی۔ بیٹے کی وفات پر آپؐ رو رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے:

"اَلْعَیْنُ تَدْمَع وَالْقَلْبُ یَحزَن وَلا نَقُولُ اِلّا مَا یَرْضیٰ رَبُّنا وَاِنّابِكَ یَا اِبراھیمُ لَمَحْزُونُونَ" (۱)

(آنکھ اشک فشاں ہے، دل جل رہا ہے ہم اس موقع پر وہی بات کریں گے جو ہمارے رب کی رضا کا موجب ہو۔ ابراہیم! ہم تیرے فراق میں غمگین ہیں)۔

مورخین اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم نزع کی حالت میں تھے تو آنحضرتؐ گھر میں داخل ہوئے اور اسے ماں کی گود میں دیکھا۔ آپ نے اسے اس کی ماں کی گود سے اٹھالیا اور اپنی گود میں لٹایا اور فرمایا:

"یَا اِبراھیمُ اِنّا لَنْ نُغْنی عَنكَ مِنَ اللهِ شَیْئاً۔ ثُمَّ ذَرَفَتْ عَیْناهُ وَقَالَ: اِنّا بِكَ یَا اِبراھیمُ لَمَحْزُونُونَ تَبکی العینُ وَیحزن القلبُ وَلا نَقُولُ مَا یُسخِطُ الرَّبّ وَلَوْلا اَنّه اَمرٌ حقٌّ وَوَعْدٌ صِدْقٌ وَاِنّها سَبِیل مأتیّة، لَحَزِنّا عَلَیكَ حُزناً شَدِیداً اَشدَّ مِنْ هٰذا"

ابراہیم! ہم بے بس ہیں ہم تجھے خدا کی تقدیر سے بچا نہیں سکتے پھر آپ کی آنکھیں برسنے لگیں اور کہا ابراہیم ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں۔ آنکھیں رو رہی ہیں اور دل جل رہا ہے۔ ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو ہمارے رب کو ناراض کرتی ہو۔ اگر موت حق نہ ہوتی اور سچا وعدہ نہ

۱۔ سنن ابوداؤد جلد اول ص ۵۸۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۴۸۲

ہوتی اور موت سب کا راستہ نہ ہوتا تو ہم اس سے زیادہ تجھ پر غم کرتے)۔

اس وقت عبدالرحمن بن عوف نے آپؐ سے عرض کیا۔ کیا آپؐ نے ہمیں مرنے والوں پر رونے سے منع نہیں کیا تھا؟

آنحضرتؐ نے اسے یہ جواب دیا:

"لَا وَلٰكِنْ نَهَيْتُ عَنْ صوتينِ احمَقَين وَاخرين، صوتٌ عِنْدَ مُصيبةٍ وَ خَمْشِ وُجوهٍ وَشقِّ جُيُوبٍ ورَنَّةِ شيطان، وصوتٌ عِنْدَ نغمةِ لَهْوٍ، وهٰذِهِ رَحمَة، وَمَنْ لَايَرْحَم لَايُرْحَم"۔ (۱)

(''نہیں، میں نے دو جاہلانہ صداؤں اور دو کاموں سے روکا ہے۔ مصیبت کے وقت چیخنا چلانا اور چہرے کو زخمی کرنا اور گریبان چاک کرنا اور رونے کی وہ صدا جسے گلے میں گھمایا جائے کہ وہ شیطانی عمل ہے اور لہو آمیز نغمہ کی صدا سے میں نے منع کیا ہے اور جہاں تک میرے رونے کا تعلق ہے تو یہ شفقت و رحمت کا نتیجہ ہے۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'')۔

اوپر کی پہلی اور دوسری مثال میں آنحضرتؐ کا گریہ اپنے عزیزوں کی مصیبت پر نہیں تھا۔ ابراہیم کے علاوہ آنحضرتؐ نے اپنے فرزند ''طاہر'' کی موت پر بھی گریہ کیا تھا اور یہ کہا تھا:

"اِنّ العَيْن تَذْرِفُ وَاِنَّ الدَّمعَ يَغْلِب وَانّ القَلْبُ يَحزن وَلَا نَعصِی الله عَزَّوجَلَّ"۔ (۲)

(آنکھیں رو رہی ہیں۔ آنسو ٹپک رہے ہیں اور دل غمگین ہے مگر ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے)۔

علامہ امینی نے اپنی گرانقدر کتاب ''الغدیر'' میں رسول اکرمؐ اور صحابہ و تابعین کے رونے کے بہت سے حوالے جمع کیے ہیں۔ چنانچہ ہم علامہ محقق کی مذکورہ کتاب سے چند حوالے

۱۔ سیرۃ حلبی: ج ۳ ص ۳۴۸

۲۔ مجمع الزوائد ھیثمی: ج ۳ ص ۸

یہاں نقل کرتے ہیں:

۱۔ جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؑ شہید ہوئے تو ان کی بہن صفیہؓ بنت عبدالمطلب میدان احد میں آئیں۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے انصار کو ان سے دور ہٹا دیا اور فرمایا کہ اسے اپنے حال پر رہنے دو۔ وہ اپنے بھائی حمزہ کی لاش پر آئیں اور دل کھول کر روئیں۔ جب ان کے رونے کی صدا بلند ہوتی تھی تو آنحضرتؐ کی صدا بھی بلند ہو جاتی اور جب وہ آہستہ روتیں تو رسول خداؐ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی آوازیں بھی ہلکی ہو جاتیں اور آپؐ فرما رہے تھے کہ "تمہاری طرح سے کوئی بھی مصیبت زدہ نہیں ہوگا"۔ (۱)

جب آنحضرتؐ احد سے مدینہ تشریف لائے تو آپ کو معلوم ہوا کہ انصار کی عورتیں اپنے شہدا پر رو رہی ہیں۔ رسول خداؐ نے فرمایا: "اما حمزة فلابوا کی له" کیا حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں ہے۔

انصار نے یہ جملہ سنا تو انہوں نے اپنی عورتوں سے کہا کہ جو کوئی اپنے شہید پر گریہ کرے تو پہلے حمزہؓ پر گریہ کرے۔ چنانچہ مجمع الزوائد کے مؤلف لکھتے ہیں کہ مدینہ میں آج بھی رواج ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز مرجائے تو اس پر رونے سے قبل حمزہؓ کا غم کیا جاتا ہے۔ (۲)

۲۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؑ، زیدؓ بن حارثہ اور عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (۳)

۳۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر گئے تو آپؐ نے بہت زیادہ گریہ کیا جس کی وجہ سے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بھی رونے لگے۔ (۴)

۱۔ الاسماع مقریزی ص ۱۵۴

۲۔ مجمع الزوائد جلد ۶ / ۱۲۰

۳۔ صحیح بخاری کتاب "المناقب فی علامت النبوۃ فی الاسلام"، سنن بیہقی جلد ۴ ص ۷۰۔

۴۔ سنن بیہقی جلد ۴ ص ۷۰۔ تاریخ خطیب بغدادی جلد ۷ ص ۲۸۹

۴۔ آنحضرت کے ایک صحابی عثمانؓ بن مظعون کی وفات ہوئی تو آپؐ نے ان کے جنازے کو بوسہ دیا اور آپ اتنا روئے کہ آپؐ کے آنسو آپؐ کے چہرے پر جاری ہو گئے۔(۱)

۵۔ آنحضرتؐ نے اپنی ایک بیٹی کے فرزند کی موت پر گریہ کیا تھا۔ عبادہ بن صامت نے آپؐ سے رونے کا سبب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: رونا رحمت ہے جسے خدا نے نسل آدم کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ اللہ اپنے مہربان بندوں پر ہی رحم کرتا ہے۔(۲)

۶۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ روتی رہتیں تھیں اور آپؑ بین کر کے یہ کہا کرتی تھیں: ابا جان! آپ اپنے پروردگار کے پاس چلے گئے۔ آپؐ نے خدا کی دعوت کو قبول کیا۔ ابا جان! جنت الفردوس آپ کا مسکن ہے۔(۳)

دختر رسول اپنے والد ماجد کی قبر کے کنارے بیٹھیں اور اپنے والد کی قبر سے ایک مٹھی خاک اٹھائی اور اسے سونگھا پھر اشک آلود آنکھوں کے ساتھ یہ مرثیہ پڑھا

ماذا علی مَنْ شَمَّ تربةَ اَحمدٍ
انْ لَایَشَمَّ مَدَیَ الزّمانِ غوالیا
صُبّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوانّها
صُبّتْ عَلَی الاَیَامِ صِرْنَ لیالیا

(جو شخص ایک بار تربتِ احمد کی خوشبو سونگھ لے تو اسے پوری زندگی اور کسی خوشبو کو سونگھنے کی کیا ضرورت ہے؟)

مجھ پر اتنے مصائب ٹوٹے کہ اگر وہ دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں بدل جاتے۔

۱۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۶۳۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۴۴۵

۲۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۵۸۔ سنن ابن ماجہ جلد اول ص ۴۸۱

۳۔ صحیح بخاری باب ''مرض النبی ووفاتہ'' مسند ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۹۷۔ سنن نسائی جلد ۴ ص ۱۳۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۶۳۔ تاریخ خطیب جلد ۳ ص ۲۶۲۔

۶۔ حضرت ابوبکر نے رسول خداؐ پر گریہ کیا تھا اور انہوں نے آپؐ کے سوگ میں ایک مرثیہ بھی کہا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

یاعَینُ فابْکی وَلا تسأمی
وَحَقَّ البُکاء علی السیّدِ

(اے آنکھ گریہ کر اور گریہ سے ملول نہ ہو۔ اسی سردار پر رونا زیب دیتا ہے)۔

۷۔ صدرِ اسلام کے مشہور شاعر حسانؓ بن ثابت نے آنحضرتؐ کی وفات پر گریہ کیا اور یہ مرثیہ پڑھا:

ظَللتُ بِها اَبکی الرّسولَ فَاَسعَدَتْ
عُیونٌ وَمِثلاھا مِنَ الْجُفنِ اَسعدُ
یُبکّونَ مِنْ تبکِی السّماواتُ یومَهُ
وَمَنْ قدبَکتهُ الارْضُ فَالنّاسُ اَکمدُ

(میں رسول خداؐ کی رحلت پر ہمیشہ گریہ کرتا رہتا ہوں اے میری آنکھوں اور میری پلکوں رونے میں میری مدد کرو۔
لوگ ان کے غم میں رو رہے ہیں کہ جن کے غم میں آسمان رو رہا ہے۔ اور جن پر زمین رو رہی تو انسانوں کو اس سے بھی زیادہ غم لاحق ہے)۔

حسان نے اپنے ایک اور شعر میں کہا:

یا عَینُ جودی بَدَمعٍ مِنکَ اسبالِ
وَلا تَملنَّ مِنْ سَحٍّ وَ اعوالِ

(اے آنکھ! ہمیشہ کے لئے اشک فشانی میں مصروف رہنا اور گریہ وشیون سے ملول نہ ہونا)

۸۔ اروی بنت عبدالمطلبؑ آنحضرتؐ کے فراق میں روئی تھیں اور وہ یہ مرثیہ پڑھا

کرتی تھیں:

اَلَایا عینُ! وَیحکِ اَسعَدِینی
بِدَمعِکِ مَابَقیتِ وَطاوِعینی
اَلایا عَینُ ویحکِ واستَھلّی
عَلِی نُورِالبلادِ وَاَسعِدینی

(اے میری آنکھ! تجھ پر افسوس، میں جب تک زندہ رہوں اس وقت تک اشک فشانی میں میری مدد کرتی رہنا اور میری اطاعت گزار رہنا۔

اے میری آنکھ! تجھ پر افسوس، اس پر گریہ کر جو شہروں کی روشنی تھا اور اس مصیبت میں میری مدد کر)۔

۹۔ حضرت عبدالمطلبؑ کی دوسری دختر ''عاتکہ'' نے آنحضرتؐ کا یہ مرثیہ کہا تھا

عُیینیَ جُوداً طِوالَ الدَّھر وانھمِرا
سَکْباً وَسَحاً بَدَمعٍ غیرَ تعذِیرِ
یَا عینُ فَاسحَنفِری بِالدَّمعِ وَاحتَفِلی
حَتّی المَمَاتِ بِسَجلٍ غیر مَنذُورِ
یاعینُ فَانھَمِلی بالدَّمعِ وَاجتَھِدی
لِلْمُصطَفٰی دُونَ خَلقِ اللّٰہِ بِالنُّورِ

(اے میری دونوں آنکھو! ہمیشہ کے لئے اشک افشانی کرو کسی عذر و بہانے کے بغیر اے چشم! آنسو بہانے کے لئے نرمی اختیار کر اور میرے مرنے تک یہ اہتمام جاری رکھ اس میں کوئی دیر نہ کر۔

اے چشم! زیادہ سے زیادہ اشک افشانی کر۔ برگزیدہ نور کے سوگ میں برستی رہ)۔

۱۰۔ رسول اکرمؐ کی ایک اور پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلبؑ آنحضرتؐ کے سوگ میں یہ مرثیہ پڑھا کرتی تھیں:

أفاطِمُ بَکّی وَلا تسأمی
بِصَحبِکِ مَاطَلَعَ الکَوکبُ
هُوَالمَرءِ یُبکیٰ وَحَقَّ البُکاءُ
هُوَ المَاجِدُ السَیّدُ الطیّب

(اے فاطمہ اپنے ہمدم کے سوگ میں ستارہ کے ہنگامِ طلوع تک گریہ کر اور ملول نہ ہو، اس کے غم میں گریہ کر جو کہ سرور اور پاک طینت سردار ہے جس کے لئے گریہ کرنا حق ہے)۔

بی بی صفیہ کا ایک اور مرثیہ یہ ہے

أعینیَ! جودا بدمعٍ سَجِمٍ
یُبادِرُ غُرَباً بما مُنهَدِمٍ
أعینیَ! فاسحَنفِرا و اسکبا
بوَجدٍ وَحُزنٍ شَدیدِ الألَم

(اے میری دونوں آنکھو! اشکِ رواں بہاؤ۔ اس مصیبت پر جو کہ ویران کر دینے والی ہے۔

اے میری دونوں آنکھو! حزن اور شدید غم والم کے لئے نرمی اختیار کرو اور آنسو بہاؤ)۔

۱۱۔ ہند دختر حارث بن عبدالمطلبؑ نے چشم گریاں کے ساتھ حضرتؐ کا یہ مرثیہ پڑھا

یاعین جُودی بِدَمعٍ مِنکَ وَابتَدِری
کَما تَنَزَّلَ ماءُ الغَیثِ فانثعبا

(اے چشم! آنسو بہا اور اس کے بہانے میں تیزی کر جیسا کہ بارش کا پانی اترتا ہے اور بہنے لگتا ہے)۔

HASNAIN ALI BOOKS

۱۲۔ ہند دخترِ اثاثہ نے آنحضرتؐ کے سوگ میں یہ مرثیہ پڑھا تھا:

أَلا يَاعينُ! بَكّي لاتَمَلّى

فَقَدْ بَكَرَالنعيُ بِمَنْ هَوَيتْ

(خبردار اے چشم آنسو بہا اور ملول نہ ہو کیونکہ میرے محبوب کی اچانک موت کی خبر آئی ہے)۔

۱۳۔ عاتکہ بنت زید نے اپنے ایک مرثیہ کے ضمن میں کہا:

وَ اَمُسَتْ مَرا كِبُهُ أُوحَشَت

وَقَدْ كانَ يَر كَبها زَينُها

وَ اَمُسَت تُبَكّي عَلى سَيّدِ

تُرَدّدُ عَبرَتُها عَينَها

(اس کی سواریوں نے وحشت زدہ ہو کر شام کی۔ جب کہ ان کی زینت ان پر پہلے سواری کیا کرتا تھا۔ انہوں نے اس عالم میں شام کی کہ وہ اپنے سردار پر اشک افشانی کر رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے)۔

۱۴۔ حضرت ام ایمنؓ نے رسول اللہؐ کے سوگ میں یہ مرثیہ کہا تھا:

عَينُ جودى فِاِنَّ بِذلِک لِلدَّمِ

عشفاءُ فاكثِرى مِنْ بَكاءِ

بِدُموعٍ غزيرةٍ مِنكِ حَتى

يقضى اللهُ فيكِ خَيرَ القَضاءِ

(اے چشم! آنسو بہا کہ یہ آنسو شفا ہیں۔ تو زیادہ سے زیادہ گریہ کر زیادہ سے زیادہ اشک افشانی کر اور تب تک روتی رہ جب تک خدا تیرے متعلق فیصلہ نہ کر دے)۔

۱۵۔ جنگ احد میں جابر بن عبداللہ کی پھوپھی اپنے بھائی عبداللہ بن عمر پر گریہ کر رہی

تھیں۔ جابر نے کہا کہ لوگ مجھے رونے سے منع کر رہے ہیں لیکن رسول خدا مجھے منع نہیں کر رہے۔

رسول خداؐ نے فرمایا کہ اس کے غم میں روؤ (کیونکہ تمہارا عزیز تم سے رخصت ہو گیا) یا گریہ نہ کرو (کیونکہ) جب تک تم نے اسے خاک کے سپرد نہیں کیا تھا اس وقت تک فرشتوں نے اس کے بدن پر اپنے پروں سے سایہ کیا ہوا تھا۔(۱)

گریہ روکنے کی دستاویز

حضرت عمر بن خطاب اور عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا:

"اِنَّ الْمَیِّتَ یُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَھْلِہٖ" (گھر والوں کے رونے سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے)(۲)

جواب: اس روایت کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر نے خود کئی بار اس روایت کی عملی طور پر مخالفت کی تھی اور اس مخالفت کے چند مواقع حسب ذیل ہیں:

۱۔ جب نعمان بن مقرن المزنی کی وفات کی خبر حضرت عمر تک پہنچی تو آپ اپنے گھر سے باہر آئے اور منبر پر گئے اور لوگوں کو اس کی موت کی اطلاع دی۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور رونے لگے۔

۲۔ جب خالد بن ولید کی وفات ہوئی تو حضرت عمر روئے۔ پھر کسی نے ان سے کہا کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو رونے سے منع کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ جب تک ابی سلیمان پر بنی مغیرہ کی عورتوں کا گریہ لغو اور لقلقہ (گلے میں آواز کو گردش دینا) تک نہ پہنچے اس وقت تک کوئی عیب نہیں ہے۔(۳)

۱۔الغدیر جلد ۶ ص ۱۶۴۔۱۶۷

۲۔صحیح مسلم جلد ۳ ص ۴۱۔۴۴۔ کتاب الصلاۃ باب "انمیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ"

۳۔عقد الفرید ابن عبد ربہ اندلسی جلد ۳ ص ۲۳۵۔

۳۔ حضرت عمر کے ایک بھائی کا نام ''زید بن خطاب'' تھا اس کی وفات ہوئی کچھ دنوں بعد بنی عدی بن کعب قبیلہ سے تعلق رکھنے والا اس کا ایک دوست آیا۔ جب حضرت عمر نے اپنے بھائی کے دوست کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اس سے کہا ''تم نے زید کو آگے روانہ کر دیا اور خود میرے پاس چلے آئے!'' (۱)

ب۔ اس حدیث کے ظاہری الفاظ آیت قرآن سے تضاد رکھتے ہیں کیونکہ اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے جبکہ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے:

''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط'' (سورۂ فاطر/۱۸)

(کوئی کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔

یہ عجیب منطق ہے کہ رو اہل خانہ رہے ہیں اور عذاب میت کو دیا جا رہا ہے؟

۳۔ اگر اس حدیث کی سند صحیح ہوتی تو اس کے ساتھ اس کا محل وقوع بھی ضرور بیان کیا جاتا جب کہ اس روایت میں کسی موقع محل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لئے کچھ لوگوں نے اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میت پر رونا مطلقاً حرام ہے۔ ان لوگوں نے اس کے اصل مفہوم سے غفلت برتی ہوئی ہے۔

کتاب صحیح مسلم میں ہشام بن عروہ سے منقول ہے اور اس نے اپنے والد عروہ سے روایت کی ہے۔ عروہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بی بی عائشہ کے سامنے حضرت عمر کا یہ قول کسی نے نقل کیا کہ ابن عمر کہتے تھے کہ رسول خدا کا فرمان ہے:

''اِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهِ''

(اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے)۔

۱۔ عقد الفرید جلد ۳ ص ۲۳۵

بی بی عائشہ نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خدا عبدالرحمن کے والد کی مغفرت کرے اس نے ایک چیز سنی ضرور تھی لیکن اسے اچھی طرح سے یاد نہ کر سکا تھا۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا اس کے رشتہ دار اس پر رو رہے تھے۔ رسول خداؐ نے اس وقت فرمایا کہ تم اس پر رو رہے ہو جب کہ اسے عذاب دیا جا رہا ہے۔ (۱)

ابوداؤد سنن میں لکھتے ہیں کہ عروہ نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی کہ رسول خداؐ نے فرمایا "اہلِ خانہ کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے" جب یہ بات بی بی عائشہؓ تک پہنچی تو انہوں نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ رسول خداؐ ایک یہودی کی قبر سے گزر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ میت کو عذاب دیا جا رہا ہے جب کہ اس کے اہل خانہ اس پر رو رہے ہیں۔ پھر بی بی عائشہؓ نے قرآن کریم کی اس آیت مجیدہ کی تلاوت کی:

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ" (سورۂ فاطر/۱۸) (۲)

(کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)

امام شافعی لکھتے ہیں کہ ابن عمر کی بیان کردہ حدیث کی بہ نسبت بی بی عائشہ کی بیان کردہ حدیث پیغمبر اکرمؐ کے فرمان سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے پاس قرآنی آیت کی کیا دلیل ہے؟ اس کے جواب میں ہم حسب ذیل آیات پیش کریں گے۔

۱۔ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ" (سورۂ فاطر/۱۸)

(کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)

۲۔ اور "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾" (سورۂ النجم/۳۹)

(ہر انسان کو اس کی محنت کی ثمر ملتا ہے)۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۳ ص ۴۴ کتاب الصلاۃ باب "المیت یعذب ببکاء اہلہ علیہ"

۲۔ سنن ابی داؤد جلد ۳ ص ۱۹۴ حدیث ۳۱۲۹۔ اس صورت میں "ببکاء اھلہ" کا حرف "با" "مع" کے معانی میں ہوگا۔ یعنی اس کے خاندان کے گریہ کے باوجود میت پر عذاب ہو رہا ہے۔

۳۔ اور "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝" (سورۂ زلزال/۷۔۸)

(جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا)۔

۴۔ اور لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ۝ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۵)

(یہاں تک کہ ہر شخص اپنی کوشش اور سعی کا اجر پالے گا)۔

اور اگر کوئی ہم سے یہ کہے کہ تمہارے پاس سنتِ رسولؐ کی بھی کوئی دلیل ہے؟ اس کے جواب میں ہم اس روایت کو پیش کریں گے۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا یہ شخص تیرا بیٹا ہے؟

اس شخص نے جواب دیا: جی ہاں، یہ میرا بیٹا ہے

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اَمَا اَنَّهٗ لَا يَجْنِيْ عَلَيْكَ وَلَا تَجْنِيْ عَلَيْهِ"

(وہ اپنے اعمال کی وجہ سے تجھے اذیت نہیں دے سکتا اور تو اپنے اعمال کی وجہ سے اسے اذیت نہیں پہنچا سکتا)۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس جملہ سے اسی مطلب کو ادا کیا ہے جسے خدا نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے کہ کسی ایک کا جرم دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اسی طرح سے ہر شخص کا نیک عمل خود اس کی ذات کے لئے مفید ہے دوسروں کے لئے مفید نہیں ہے اور کسی کا نیک عمل اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔(۱)

صحیح مسلم میں ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ"

۱۔ اختلاف الحدیث، با حواشی کتاب الام شافعی جلد ۷ ص ۲۶۷

(اہل خانہ کے رونے سے میت کو عذاب کیا جاتا ہے)

اس روایت کے بعد ابن عباس نے یہ اضافہ کیا کہ حضرت عمر کی وفات کے بعد یہ حدیث بی بی عائشہ کے سامنے بیان کی گئی۔ بی بی عائشہ نے کہا کہ خدا عمر کی مغفرت فرمائے۔ نہیں، خدا کی قسم! پیغمبر اکرمؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ کسی کے رونے کی وجہ سے مومن کو عذاب کیا جاتا ہے، آنحضرتؐ نے تو یہ فرمایا تھا کہ اللہ کافر کے عذاب کو اس کے اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے زیادہ کر دیتا ہے۔ تمہارے لئے قرآن کی یہ آیت کافی ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ط "(سورۂ فاطر/۱۸) (۱)

(کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)

یہاں یہ نکتہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صحیح مسلم کے اندر ہشام بن عروہ سے جو توجیہ نقل کی گئی ہے وہ زیادہ صحیح اور پائیدار ہے۔

جو حدیث ابن عباس کی زبانی ہم نے ابھی نقل کی ہے یہ صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اگر خدا کسی کافر پر اس کے خاندان کے رونے کی وجہ سے عذاب میں اضافہ کرے تو یہ بات عدل الٰہی کے خلاف ہے اور قرآن مجید کی آیات سے یہ بات مناسب نہیں رکھتی (۲)

۱۔ صحیح مسلم جلد ۳/ ۴۳، کتاب الصلاۃ باب "المیت یعذب ببکاء اھله علیه"

۲۔ مزید تفصیل کے لئے ہماری کتاب ''بحوث قرآنیہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔ ہماری اس کتاب کا ترجمہ محترم مہدی عزیزی نے کیا ہے۔

۱۵

شہداء کی سوگواری

سوال: راہِ حق کے شہدا کی عزاداری کا کیا فلسفہ ہے؟

جواب: شہیدانِ راہِ حق کی عزاداری کا فلسفہ یہ ہے کہ ان کی یاد کو قائم رکھا جائے اور ان کے نظریہ کی حفاظت کی جائے۔ وہ نظریہ جس کی اساس دین کے لئے فداکاری پر مبنی ہے اور وہ ذلت و خواری کی زندگی پر موت کو گلے لگانا بہتر جانتا ہے۔ شہدا کی منطق یہ تھی کہ ''مرگ سرخ ذلت کی زندگی سے بہتر ہے'' باالفاظ دیگر ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔

شہدا نے خدا کے دین کی سربلندی اور مومنین کی عزت کے لئے موت کو گلے لگایا تھا۔ ان کی یاد قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شہداء کی منطق قائم و دائم رہے اور ملت ان سے سبق حاصل کر کے ان کے مقصد کو جاری رکھے۔

شہید ایک شمع کی مانند ہوتا ہے جو خود تو جل جاتا ہے لیکن ماحول میں روشنی بکھیر دیتا ہے شہید اپنے خون کے قطرات اور اپنی حیات مادی کو قربان کر کے معاشرے کو غلامی اور ستم گروں کی حکومت سے آزاد کرتا ہے۔ کیا ایسے افراد کی یاد منانا منطق اور عقل سلیم کے تقاضوں کے مطابق نیک اور پسندیدہ عمل نہیں ہے؟

پیغمبر خداؐ نے تو طبعی موت مرنے والوں پر گریہ کیا تھا خود بھی روئے تھے اور دوسروں کو

رُلایا تھا۔سوال یہ ہے کہ مکتب شہادت کے احیا اور شہداء کے احترام کے لئے مختلف مواقع پر اگر مجالس ومحافل اور سیمینار منعقد کیے جائیں تو اس سے کون سی قباحت لازم آتی ہے؟

شہدا میں سے رہبر آزادگان ابوالشہدا حضرت حسینؑ بن علیؑ کے نام پر سب سے زیادہ مجالس منعقد ہوتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے باقی شہدا سے پہلے آزادانہ زندگی بسر کر کے اور ظلم وستم کے ضابطوں کو نہ ماننے کا دنیا والوں کو درس دیا تھا۔اور آپ نے آبرومندانہ موت اور شمشیر دشمن کے نیچے ضربات کھانے کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی تھی اور آخر کار ''بستر شہادت'' میں ''لقاءاللہ'' کی منزل پر قدم رکھا۔

آپ کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے ایثار وفدا کاری کا بلندترین نمونہ تھے۔اسی لئے آپ نے مسکرا کر شہادت کا استقبال کیا تھا۔

نشان مردِ مومن باتو گویم
اگر مرگش رسد خندان بمیرد(۱)

(تجھے مردِ مومن کی نشانی بتاؤں جب اس پر موت آتی ہے تو مسکرا کر مرتا ہے)۔

دشمن نے حسینؑ کو امان دینے کے لئے اپنا ہاتھ دراز کیا تھا لیکن آپ نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور دشمن کی امان کو قبول نہیں کیا تھا۔کیونکہ آپ کو بخوبی معلوم تھا کہ امان قبول کرنے میں ذلت وخواری اور حقیقی موت مضمر ہے۔

جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے دراصل یہ علامہ ابن ابی الحدید محقق تاریخ کے الفاظ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے حضرت سید الشہداء کے متعلق کہے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے عربی الفاظ کو نقل کریں۔انہوں نے لکھا:

سید اهل الاباء الذی علّم الناس الحمیّة والموت تحت ظلال السیوف

۱۔علامہ اقبال نے بھی ایک ایسا ہی شعر کہا تھا:

نشانِ مردِ مومن باتو گویم   چون مرگ آید تبسم برلب اوست

اختیار آلہ علی الدنیّۃ، ابو عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب علیہ السلام۔

عرض علیه الامان فأنف من الذل، وخاف من ابن زیاد ان یناله بنوع من الهوان، ان لم یقتله فاختار الموت علی ذلك۔ (۱)

اس مقام پر عام طور پر یہ دو سوالات کیے جاتے ہیں:

۱۔ کیا مذہب شیعہ، غم اور رونے دھونے کا مذہب ہے؟

۲۔ آپ لوگ امام حسینؑ کی عزاداری کیوں کرتے ہیں جبکہ وہ تو جنت میں ہیں؟ ایک جنتی کے لئے رونے کا کیا فائدہ ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ مذہب شیعہ حق طلبی، عدالت جوئی اور جہاد و مبارزہ کا مذہب ہے یہ رونے دھونے کا مذہب نہیں ہے۔ البتہ شیعوں میں یہ خاصیت ضرور ہے کہ وہ رسول خداؐ اور ان کے اصحاب باصفا کی طرح سے دنیا سے رخصت ہونے والے عزیزوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں اہل بیتؑ کی محبت موجزن رہتی ہے اور اسی محبت کے آثار ان کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔

بالفاظ دیگر محبت و اخلاص کے جذبات کے ساتھ اشعار پڑھنا شہیدانِ راہِ حق سے ہمدردی اور ہمراہی کا مظہر ہے اور اس ذریعہ سے مکتبِ شہدا کا تحفظ ہوتا ہے۔ ایسا مکتب جس کی بنیاد دین اور تن میں فداکاری نہ ہو وہ ذلت وخواری کا نشانہ بنتا ہے۔

اگر یہ مجالس بند ہوجائیں اور ہر سال شہداء کی یاد کی تجدید نہ کی جائے تو ایثار و شہادت کا مکتب فراموشی کی نذر ہوجائے گا۔ محرم وصفر میں شیعہ مجالس عزا برپا کر کے حسینؑ ابن علیؑ کی منطق کو از سر نو زندہ کرتے ہیں۔ جو تمام شہداء کی منطق ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ ہم

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۳ ص ۲۴۹

لوگ امام حسینؑ پر اس لئے نہیں روتے کہ آپ جنت میں ہیں، اس وجہ سے تو ہم خوش ہیں، روتے اس لئے ہیں کہ امت نے آپ پر جو ظلم وستم ڈھائے تھے آپ اس کے لائق نہیں تھے امت نے آپ کو آپ کے بہتر ساتھیوں سمیت دریا کے کنارے پیاسا قتل کیا تھا ہم اس غم کو یاد کر کے روتے ہیں۔

حضرت رسولؐ مقبول حضرت حمزہؓ پر اس لئے نہیں روئے تھے کہ وہ فرشتوں کے ہم نشین ہیں، آپ ان پر توڑے جانے والے ان مظالم کی وجہ سے روئے تھے جو ابوسفیان کی بیوی ہند جگر خوار نے آپ پر توڑے تھے۔ ابوسفیان کی بیوی، معاویہ کی ماں اور یزید کی دادی نے حضرت حمزہ کا پیٹ چاک کیا تھا اور آپ کا جگر نکال کر چبایا تھا۔

ہم یہاں دامنِ گفتگو کو سمیٹ رہے ہیں۔ ہم سردست شہادت امام حسینؑ کا فلسفہ جس سے اسلام کو نجات ملی حضرت کے فلسفہ پر گفتگو نہیں کریں گے کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

HASAN ALI

۱۶

جنازہ کو مقاماتِ مقدسہ منتقل کرنا۔

سوال: دیکھا گیا ہے کہ شیعہ اپنے جنازوں کو مقامات مقدسہ کی طرف منتقل کرتے ہیں۔کیا یہ کام جائز ہے؟

جواب: ایک جگہ سے دوسری جگہ جنازہ منتقل کرنے کی دو حالتیں ہیں:

الف: کسی خاص مقام پر دفن کرنے سے پہلے جنازہ کو منتقل کیا جائے

ب: پہلے ایک جگہ دفن کیا جائے پھر لاش کو دوسری جگہ منتقل کیا جائے۔

مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہم اہل سنت کے چاروں ائمہ فقہ کی آراء نقل کرتے ہیں۔

چاروں ائمہ فقہ اس بات پر متفق ہیں کہ دفن سے پہلے جنازہ کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔

ہم کتاب ''الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' سے ائمہ اربعہ کے فتاویٰ یہاں نقل کرتے ہیں:

مالکی یہ کہتے ہیں کہ کسی جنازہ کو دفن سے پہلے یا دفن کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے لیکن اس کے لئے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے:

الف: جنازہ منتقل کرنے سے خراب ہونے کا امکان نہ ہو۔

ب: اس سے مرنے والے کی بے ادبی نہ ہوتی ہو۔

ج: ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا مقصد تبرک حاصل کرنا ہو یا خاندان کے

قریب کرنا ہو۔

حنابلہ کہتے ہیں کہ جنازے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی صحیح وجہ موجود ہو مثلاً اس لئے جنازہ کو منتقل کیا جارہا ہو کہ لوگ چاہتے ہوں کہ اسے کسی باشرف جگہ پر دفن کیا جائے یا کسی نیک انسان کے قریب دفن کیا جائے۔

لیکن اس کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ جنازہ بدبودار نہ ہونے پائے اور اس حوالے سے دفن سے پہلے یا دفن کے بعد منتقل کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شافعی کہتے ہیں کہ جنازہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ناجائز ہے۔ بعض افراد کہتے ہیں کہ یہ عمل مکروہ ہے البتہ اگر جنازہ منتقل کرنے کا مقصد اسے مکہ، مدینہ یا بیت المقدس میں دفن کرنا ہو یا کسی نیک انسان کی قبر کے پاس دفن کرنا مقصود ہو تو پھر جائز ہے۔ اگر کسی شخص نے زندگی میں وصیت کی ہو کہ اس کے جنازہ کو فلاں جگہ دفن کیا جائے تو وصیت پر عمل کرنا لازم ہے۔

حنفی کہتے ہیں کہ جہاں انسان کی موت واقع ہو وہیں دفن کرنا مستحب ہے جنازہ کو دفن سے پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔ لیکن دفن کے بعد اسے قبر سے نکالنا حرام ہے۔ البتہ اگر زمین غصبی ہو تو پھر اسے منتقل کیا جاسکتا ہے" (۱)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دفن سے قبل جنازہ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بالاتفاق جائز ہے۔

اتفاقاً صحابہ اور تابعین کے جنازے منتقل ہونے کی بہت سی روایت موجود ہیں۔ مثلاً "مقداد بن عمرو" نے مدینہ سے چھ کیلومیٹر دور مقام جرف میں وفات پائی تھی، ان کا جنازہ مدینہ لایا گیا اور انہیں قبرستان بقیع میں دفن کیا گیا۔

حضرت ابوبکر کے فرزند عبدالرحمن کی وفات مکہ سے چھ کیلومیٹر دور "حُبشی" کے مقام پر

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد اول ص ۴۲۱

واقع ہوئی تھی، ان کا جنازہ مکہ لایا گیا اور مکہ میں ہی انہیں دفن کیا گیا۔(۱)

ان سے بڑی مثال شہدائے احد کی ہے۔ احد کے کچھ شہداء کو سرزمین احد میں دفن کیا گیا تھا جب کہ کچھ شہداء کو مدینہ لایا گیا اور انہیں قبرستان بقیع میں دفن کیا گیا۔ قبرستان بقیع میں شہدائے احد کی جگہ آج بھی مشخص ہے۔

اور جہاں تک دفن کے بعد میت کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا سوال ہے تو اگر مرنے والے نے اپنی زندگی میں وصیت کی ہو کہ اسے دفن کے بعد مقامات متبرکہ منتقل کیا جائے تو اس کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ اس نے ایک پسندیدہ امر کی وصیت کی ہے لہٰذا اس کی وصیت کا اجرا ہونا چاہیے اور اگر اس نے وصیت نہیں کی تو پھر قبر کھود کر اس کے جسم کو کسی مقدس مقام پر منتقل کرنا اشکال سے خالی نہیں ہے(۲)

HASSAN ALI BOOKS

۱۔ الغدیر، جلد ۵ ص ۷۵ تا ۸۵

۲۔ تحریر الوسیلہ جلد ۱ ص ۸۳

فصل چہارم

شیعوں کی نظر میں قرآن کا مقام

۱۔ کیا شیعہ عقیدہ کے مطابق قرآن میں تحریف ہوئی ہے؟

۲۔ اگر شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں تو کتاب ''فصل الخطاب'' کی تردید کیوں نہیں کرتے؟

۳۔ مصحفِ فاطمہؑ کیا ہے؟

۴۔ مصحف علیؑ کیا ہے؟

۵۔ کیا شیعہ دعاؤں کو قرآن سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟

۶۔ تحریف پر مبنی روایات کو کتابوں سے حذف کیوں نہیں کیا جاتا؟

۷۔ شیعہ اور آیات قرآنی کی تاویل

۸۔ شیعہ اور عہد خلفاء میں تدوین قرآن کا انکار

HASAN ALI BOOK DEPOT

مقدمہ

قرآن کریم ایک ایسا گہرا اور نا پیدا کنار سمندر ہے جس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور فکر بشر اس تک پرواز نہیں کر سکتی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن جہانِ مادی کا دوسرا نسخہ ہے اور بعض افراد کے مطابق انسان کی دانش و بینش جتنی ترقی کرے گی اتنے ہی قرآن کے راز آشکار ہوتے جائیں گے قرآن کی تجلیات میں اضافہ ہوگا اور جتنا علم ترقی کرے گا اتنا ہی قرآن کے تازہ حقائق کھلتے جائیں گے۔

قرآن کو ''غیر محدود'' خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے روانہ کیا۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے تو اس کی کتاب بھی اس کی اس صفت کی مظہر ہے اور وہ بھی غیر محدود ہے۔ قرآن خلّاقِ کائنات اور عالمِ وحی سے اپنے انتساب کے لئے کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے کیونکہ سورج کے اثبات کے لئے کسی دوسری گواہی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی سورج اپنی گواہی خود آپ دیتا ہے۔ سورج کی طرح سے قرآن کریم بھی کسی بیرونی گواہی کا محتاج نہیں ہے۔ اور قرآن اپنی صداقت و واقعیت کا خود آپ گواہ ہے۔

پیغمبر اسلام نے قرآن کے غیر متناہی ہونے کے خاصیت کو مدنظر رکھ کر اپنے تاریخی کلمات میں قرآن کی اہمیت و عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''ظَاهِرُهُ اَنيقٌ وَبَاطِنُهُ عَميقٌ... لَا تُحْصىٰ عَجَائِبُهُ وَلَا تُبْلَىٰ غَرَائِبُهُ'' [1]

(قرآن کا ظاہر خوش نما ہے اور اس کا باطن گہرا ہے...... اس کے عجائب کو شمار نہیں کیا

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۵۹۹ باب فضل قرآن حدیث ۲

جاسکتا اور اس کی تازگیاں بوسیدہ نہیں ہوتیں)۔

حضرت علیؑ مکتب الٰہی کے ممتاز تربیت یافتہ انسان تھے۔آپ نے اپنے ایک خطبہ میں قرآن مجید کے لئے حسب ذیل کلمات فرمائے تھے:

"سراجالا تخبو توقّدُہ، وبحراً لا یُدرك قعرُہ" (۱)

(قرآن وہ مشعلِ فروزان ہے جس کے فروغ اور تابش کو بجھایا نہیں جاسکتا اور وہ گہرا سمندر ہے جس کی گہرائی تک فکر انسانی کی رسائی نہیں ہے)۔

جو بھی انسان وسیع معلومات اور عظیم جہاں بینی سے قرآن کا مطالعہ کرے گا یہ حقیقت اس پر بخوبی عیاں ہوجائے گی اور صداقتِ قرآن کے عقیدہ میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

بلند مرتبہ مفسرین سائنسی وعلمی معلومات کے ساتھ قرآن کے مطالعہ میں مصروف ہیں اور روزانہ اس سے تازہ ترین انکشافات کا استخراج کررہے ہیں۔

قرآن کریم کے لامتناہی اور غیر محدود ہونے کی ایک علت تو یہ ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن ابدی آئین کا جاودانی معجزہ ہے خداوند کائنات نے اس ہدف کے لئے ایسی کتاب نازل کی ہے جو کہ عمیق اور لامتناہی ہے تاکہ ہر دور کے محقق اپنی دانش واطلاعات کے مطابق اس سے فیض یاب ہوسکیں اور قرآن کی نور افشانی کسی زمانہ اور خاص گروہ تک محدود نہ ہو۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ عبدہ خطبہ ۱۹۳

شیعوں کے نزدیک قرآن کا مقام و منزلت

سوال: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیعہ قرآن کریم میں تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں، کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: شیعہ عقیدہ کے مطابق قرآن وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو تحریف سے پاک ہے اور آج بھی اپنی صورت اولیہ کے مطابق تمام مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ قرآن کائنات کی وہ واحد کتاب ہے جس کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی بھی کتاب کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کے علاوہ دنیا میں جتنی بھی کتابیں ہیں وہ سب کی سب محتاج تنقید و تحقیق ہیں۔

قرآن مسلمانوں کے لئے عقیدہ و شریعت کی دستاویز ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کے متعلق قرآن کا فیصلہ حتمی اور حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کریں۔ آپ کو یہ گواہی کہیں نہیں ملے گی کہ شیعوں کے پاس موجودہ قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن بھی تھا اور اس وقت دنیا میں شیعہ کروڑوں کی تعداد میں رہتے ہیں ہمارے پاس عمومی اور خصوصی کتب خانے ہیں کسی بھی شیعہ کتب خانے اور کسی بھی شیعہ کے گھر میں آپ کو موجودہ قرآن کے علاوہ اور کوئی قرآن دکھائی نہیں دے گا۔ سوائے اس قرآن کے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک ہے کوئی قرآن حتی کہ معمولی اختلاف سے بھی وجود نہیں رکھتا۔

شیعوں پر تحریف کا الزام لگانا بزدلانہ افترا ہے جس کی بنیاد یا تو مذہب شیعہ سے

جہالت ہے یا شیعوں سے دشمنی ہے۔ مخالفین نے کتب حدیث میں پائی جانے والی چند روایات کو بنیاد بنا کر شیعوں پر تحریف کی تہمت لگادی اور یہ نہ دیکھا کہ یہ روایت قرآن سے متضاد ہونے کی وجہ سے کسی بھی اہمیت کی حامل نہیں ہیں اگر چند روایات کی بنا پر شیعوں کو منکر قرآن کہا جاسکتا ہے تو کتب اہل سنت میں بھی تحریف کی بہت زیادہ روایات موجود ہیں تو کیا ان روایات کی وجہ سے اہل سنت کو منکرِ قرآن نہیں کہا جاسکتا؟

ہم اس نکتہ کو پہلے بھی دُہرا چکے ہیں کہ کتب حدیث کی حیثیت کتبِ عقائد کی نہیں ہے اور اصولِ عقائد کو قرآنِ کریم، عقل سلیم اور روایات متواترہ کے قطعی منابع سے حاصل کرنا چاہیے۔

ذیل میں ہم چند بزرگ شیعہ علماء کے ان اقوال کو نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے کھلے لفظوں میں عقیدہ تحریف کی تردید کی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم عدم تحریف پر کچھ عقلی بحث کرنا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے تحریفِ قرآن کے مسئلہ کو ہوا دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی مُسلَّم تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان اقوام کے پاس تورات وانجیل اپنی اصل صورت میں موجود نہیں ہیں، ان کتابوں میں تحریف اور تبدیلی ہو چکی ہے۔ اس لئے یہود و نصاریٰ اپنی خفت مٹانے کے لئے قرآن کریم کو بھی مُحرّف کتاب ثابت کرنے کی جستجو میں ہیں (تاکہ انہیں کوئی تحریف کا طعنہ نہ دے سکے اور اس حمام میں سب ہی ننگے دکھائی دیں)۔

تاریخ پوری قطعیت سے گواہی دیتی ہے مختلف تاریخی حوادث اور بالخصوص بیت المقدس پر بخت نصر کے حملہ سے تورات کے نسخے بھی محفوظ نہیں رہے تھے پھر ایک عرصہ بعد چند یہودی علماء نے اپنے حافظہ کے زور پر موجود تورات کو مرتب کیا تھا۔ (۱)

تاریخ گواہی دیتی ہے موجودہ انجیل کے چاروں نُسخے حضرت مسیحؑ کے کئی برس بعد لکھے

۱۔ ''قاموس کتاب مقدس'' اور ''الھدیٰ الی دین المصطفیٰ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

گئے تھے اور جو انجیل آسمانی کتاب کی صورت میں حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی آج اس کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا۔(۱)

یہود ونصاریٰ کے پاس ان کی مذہبی کتابیں اصل شکل میں محفوظ نہیں ہیں اسی لئے وہ قرآن کو بدنام کر کے دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس خدا کی کتابیں اصل حالت میں موجود نہیں ہیں تو مسلمانوں کے پاس بھی قرآن اصل صورت میں موجود نہیں ہے اور جس طرح سے ہماری کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اس طرح سے قرآن میں بھی تحریف ہوئی ہے۔

اس طرح سے یہود ونصاریٰ قرآن کریم کو اپنی کتابوں کی سطح پر لانا چاہتے ہیں حالانکہ تاریخ اسلامی کے تمام ادوار میں جس طرح سے قرآن کی جمع آوری اور نگہبانی ہوئی ہے اس کی کہیں مثال نہیں ملتی اور قرآن کی تدوین اور توراۃ وانجیل کی تدوین میں بڑا فرق ہے۔

تاریخ یہ نشاندہی کرتی ہے کہ کسی بھی دور میں قرآن ابہام و پیچیدگی سے دوچار نہیں رہا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل نکتہ پر توجہ کرنا انتہائی ضروری ہے اور اس کی وضاحت سے بہت سے سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں:

ا۔ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں انقلاب برپا کیا تھا۔ قرآن نے لوگوں کی سابقہ زندگی کو ختم کیا اور انہیں ایمان اور اصولِ انسانی کی اساس پر نئی زندگی دی۔ قرآن ایسی کتاب ہے جس کا مسلمانوں کی عملی زندگی سے گہرا ارتباط ہے۔ چنانچہ مسلمان اپنی سیاست، اقتصاد، اخلاقی قوانین اور گھریلو آداب ورسوم کو بھی قرآن سے حاصل کرتے ہیں، اپنی نماز پنجگانہ میں قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، علاوہ ازیں تمام روزمرہ کے معمولات کے لئے پہلے قرآن اور پھر سنت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

جو کتاب ہر وقت مسلمانوں کے لئے حرزِ جان کا درجہ رکھتی ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک

ا۔ ''قاموس کتاب مقدس'' اور ''الھدیٰ الی دین المصطفیٰ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

شخص اس میں تحریف کر دے اور عوام وخواص کو اس کا پتہ ہی نہ چلے؟

قرآن میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص یہ مذموم کوشش کرتا تو تمام مسلمان اس کی تحریف کی طرف متوجہ ہوتے اور میدان عمل میں آکر اس مذموم سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ دنیا کی کسی عظیم قوم کے بنیادی آئین ودستور میں اگر کوئی تبدیلی کر دے تو پوری قوم اس کا نوٹس لیتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں تبدیلی کر دی جائے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگے؟ قرآن بدل دیا جائے اور مسلمان احتجاج نہ کریں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

کسی بھی قوم کے آئین کو اس قوم کی زندگی میں اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جتنا کہ قرآن کو مسلمانوں کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا اگر قرآن میں کوئی تحریف کرتا تو ہر طرف سے مسلمان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے۔ چونکہ تاریخ میں اس طرح کے احتجاج کا کوئی واقعہ دکھائی نہیں دیتا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں تحریف ہی نہیں ہوئی۔

۲۔ جمع آوری قرآن سے مربوط تاریخ کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کی حیات ظاہری میں اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر جو پیغمبر اکرمؐ اور مسلمان حفظ و کتابت قرآن کو دیتے تھے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم سے ایک لفظ بھی کم ہونے کا امکان نہیں تھا۔

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی موجودگی میں دانشمند مسلمانوں کی کافی تعداد کہ جس کو ۴۳ تک لکھا گیا ہے حضرتؐ کے حکم کے مطابق ہر آیت اور سورت کو نزول کے مطابق لکھتے تھے(۱) اور یہ تحریریں ہر طرح کے اہتمام اور کوشش سے مسلمانوں کے درمیان محفوظ ہوجاتی تھیں۔ قرآن کی کتابت کا اہتمام کرنے والوں میں دیگر افراد سے مراتب میں بلند معروف ترین ہستیاں حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور زید بن ثابتؓ کی تھیں۔ اس ترتیب سے ان افراد کے ذریعے

۱۔ تاریخ قرآن زنجانی: فصل ششم ص ۲۰۔

بہت سے لکھے گئے قرآن وجود رکھتے تھے کہ تمام مسلمان شبانہ روزان کی طرف رجوع کر کے قرأت واستفادہ کرتے تھے۔

علاوہ ازیں بہت سے مسلمانوں کو قرآن کریم کی آیات اور سورتیں از برتھیں، وہ لوگ حفظ قرآن میں بڑے محتاط تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کلام اللہ کا ایک بھی حرف ضائع نہ ہونے پائے۔

حفاظ قرآن کو اس دور کی اصطلاح کے مطابق ''قاری'' کہا جاتا تھا۔ تمام مسلمان قاریوں سے ہمیشہ کسب فیض کرتے رہے۔

مسلمانوں اور قاریوں کو کلام اللہ کی حفاظت کتنی عزیز تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ خلیفہ وقت حضرت عثمان بن عفان اور ابی بن کعب کے درمیان اختلاف ہوا۔ حضرت عثمان کہتے تھے کہ قرآن کریم کی آیت ''والذین یکنزون الذھب والفضة...'' کی آیت مجیدہ کے آغاز میں ''واؤ'' نہیں ہے لہٰذا (قرآن کے نسخوں سے) ''واؤ'' کو حذف کردینا چاہیے۔

ابی بن کعب نے کہا کہ ہم نے رسول خدا کی زبانی اس آیت کو ''واؤ'' کے ساتھ سنا ہے۔

جب دونوں بزرگوں میں اختلاف بڑھا تو ابی بن کعب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے کہا اگر کسی نے اس آیت سے ''واؤ'' حذف کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی تلوار اٹھاؤں گا اور اُس کا خون کردوں گا۔

چنانچہ ''ابی بن کعب'' کی پامردی کی وجہ سے خلیفہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ آیت سے ''واؤ'' کو حذف کرتے۔(۱)

۱۔ تفسیر درمنثور جلد ۴ /۳۷۹

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان قرآن کریم کے لئے انتہائی حساس تھے مسلمان ایک حرف ''واؤ'' کے حذف کرنے پر مرنے مارنے پر آمادہ ہوجاتے تھے تو بھلا یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن میں تحریف ہوئی اوراس کی آیات کوحذف کردیا گیا۔

مذکورہ دو بنیادی مطالب کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن کریم میں اندرونی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ اس میں تحریف نہ ہوسکے گی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ⑨'' (سورۂ حجر آیت ۹)

(بے شک ہم نے ہی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں)

علمائے اسلام نے تفسیر و کلام کی کتابوں میں صراحت کی ہے کہ علمائے اسلام کا اجماع ہے کہ قرآن تحریف سے پاک ہے۔ اور اگر اتفاقاً دانش مندوں کے درمیان کوئی ایسا بھی پیدا ہوگیا جو تحریف کا معتقد تھا تو وہ ان جعلی احادیث کے زیر اثر تھا جو بعض مفاد پرستوں نے کتبِ احادیث میں داخل کردی تھیں۔

ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ اس طرح کی روایات درجۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ یا پھر کچھ روایات کا صحیح معنی ومفہوم ہی سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

عدم تحریف اور علمائے شیعہ

ذیل میں ہم کچھ شیعہ علماء و محققین کی زبانی عدمِ تحریف کی گواہی پیش کرتے ہیں:

۱۔ شیخ صدوق (۳۰۶۔۳۸۱ھ) نے اپنے ایک رسالہ میں شیعہ عقائد بیان کیے ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کے متعلق شیعہ عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ لکھا:

" اِعۡتِقَادُنَا اَنَّ الۡقُرۡاٰنَ الَّذِیۡ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰی نَبِیِّهٖ مُحَمَّدٍ ﷺ هُوَ مَا بَیۡنَ الدَّفَّتَیۡنِ، وَهُوَ مَا بِاَیۡدِی النَّاسِ لَیۡسَ بِاَکۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ وَمَنۡ نَسَبَ اِلَیۡنَا اَنَّهٗ اَکۡثَرُ مِنۡ

ذٰلِكَ فَهُوَ كَاذِبٌ"۔ (۱)

(ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد مصطفیؐ پر جو قرآن نازل کیا وہ وہی ہے جو دو گتوں کے درمیان ہے اور جو تمام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہی قرآن واقعی ہے۔ اس سے زیادہ قرآن نہیں ہے اور جو ہماری طرف یہ بات منسوب کرے کہ ہم اس سے زیادہ قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں تو وہ شخص جھوٹا ہے)۔

۲۔ شیخ مفید (۳۳۶۔ ۴۱۳ھ) لکھتے ہیں:

امامیہ کا ایک گروہ کہتا ہے:

"قرآن کریم سے ایک حرف، ایک آیت، ایک سورت بھی حذف نہیں ہے۔ البتہ امیر المومنینؑ کی فضیلت کے کچھ مطالب کو حذف کیا گیا ہے لیکن ان مطالب کا تعلق براہ راست قرآنی آیات سے نہیں تھا۔ اس کی بجائے ان کا تعلق تفسیر معانی سے تھا اور وہ کلام اللہ کا حصہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بعض اوقات کلام اللہ کی تاویل کو بھی کلام الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ بات حق سے زیادہ قریب ہے۔ جو قرآن میں کمی کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کی بات صحیح نہیں ہے"۔ (۲)

عین ممکن ہے کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ شیخ مفید کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ شیعہ تحریف کے بھی قائل ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ سے انہوں نے ان لوگوں کی نفی کی ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں روایاتِ تحریف کو نقل کیا ہے۔

ہم اس سے قبل کئی بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ کسی مؤلف کا کسی حدیث کو نقل کر دینا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کا عقیدہ بھی اسی پر ہے۔ ورنہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ایسی

۱۔ اعتقادات الامامیہ ہمراہ با شرح باب حادی عشر ص ۹۳

۲۔ اوائل المقالات ص ۵۳۔ ۵۴

روایات موجود ہیں جو تحریف پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم اتحاد المسلمین کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی احادیث کو نقل کرنے سے صرف نظر کر رہے ہیں۔

شیخ مفید اپنی ایک اور کتاب میں لکھتے ہیں:

تحریف کے متعلق جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ سب کے سب روایات احاد ہیں اور ان کی صحت پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے ہم نے ان روایات سے کنارہ کشی کی ہے۔ ہماری نظر میں ان روایات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔(۱)

۳۔ سید مرتضیٰ علم الھدی (۳۵۵۔۴۳۶ھ) بغداد کے بہت بڑے عالم دین اور اپنے دور میں دنیائے اسلام کے عظیم مرجع تھے۔ ایک مرتبہ انہیں ''طرابلس'' سے کچھ سوالات بھیجے گئے، ان کے جوابات کے ضمن میں آپ نے یہ کلمات بھی لکھے:

یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن میں تحریف واقع ہوئی ہے جبکہ عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب جیسے صحابہ کے پورے گروہ نے نبی اکرمؐ کو اول سے آخر تک کئی بار قرآن سنایا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید رسول خداؐ کے دور میں جمع ہو چکا تھا اور علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں کی شکل میں نہیں تھا۔(۲)

۴۔ شیخ طوسی (۳۸۵۔۴۶۰ھ) اپنی قابل قدر کتاب ''تبیان'' میں لکھتے ہیں:

''آیات قرآن میں زیادتی اور کمی قابل ذکر نہیں ہے۔ جہاں تک زیادتی کا تعلق ہے یعنی قرآن میں ایسی چیز شامل کی گئی جو اس میں شامل نہیں تھی تو اس کے بُطلان پر سب متفق ہیں۔ جب کہ قرآن میں کمی کا عقیدہ بھی تمام دنیا کے مسلمانوں کے عقیدہ کے خلاف ہے اور یہی ہمارا مذہب ہے''۔

اس کے بعد شیخ طوسی نے تحریف کی روایات کے متعلق فرمایا کہ یہ روایات احاد ہیں اور

۱۔ المسائل السرویہ ضمن مجموعۃ المسائل ص ۳۶۶

۲۔ مجمع البیان جلد اول ص ۱۰ بہ نقل از جواب مسائل طرابلس سید مرتضیٰ

ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ (۱)

عدم تحریف کے متقدمین ومتاخرین علماء کی فہرست کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔ تبیان جلد اول ص ۲۶۹

۲

کتاب ''فصل الخطاب'' پر تنقید

سوال: محدث نوری ایک مشہور شیعہ عالم تھے۔ انہوں نے تحریف کے اثبات کے لئے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''فصل الخطاب'' ہے۔ اگر شیعہ تحریف کے قائل نہیں ہیں تو وہ اس کتاب کی تردید کیوں نہیں کرتے؟

جواب: جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی تو شیعہ محققین نے اس کتاب کی تردید میں کتابیں لکھی تھیں جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں:

۱۔ فقیہ محقق شیخ محمود فرزند مرحوم شیخ ابوالقاسم المعروف بہ معرّب تہرانی (المتوفی ۱۳۱۳ھ) نے فصل الخطاب کی تردید میں تین سو صفحات پر مشتمل کتاب لکھی۔ جس کا نام ''کشف الارتیاب فی عدم تحریف الکتاب'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مضبوط دلائل سے تحریف قران کی نفی کی تھی اور جب محدث نوری نے اس کتاب کو پڑھا تو انہوں نے اپنے کچھ نظریات بدل دیئے تھے۔

۲۔ سید محمد حسین شہرستانی المتوفی (۱۳۱۵ھ) نے فصل الخطاب کی تردید میں عمدہ کتاب لکھی جس کا نام انہوں نے ''حفظ الکتاب الشریف عن شبھة القول بالتحریف'' رکھا۔

۳۔ علامہ شیخ محمد جواد بلاغی (۱۲۸۴۔۱۳۵۱ھ) نے اپنی کتاب ''الآء الرحمن''

کے مقدمہ میں فصل الخطاب کی تردید کی۔

۴۔ مرجع عالیقدر سید ابوالقاسم خوئی (۱۳۱۷۔۱۴۱۱ھ) نے تفسیر ''البیان'' میں ایک فصل قائم کی ہے جس کا عنوان " صیانة القرآن عن التحریف" ہے۔ اس فصل میں انہوں نے محدث نوری کی بیان کردہ احادیث کا مدلل جواب دیا ہے۔

۵۔ ہمارے استاد بزرگوار مرحوم آیت اللہ خمینی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: محدث نوری ایک صالح اہل تشیع تھے لیکن انہیں ضعیف و عجیب وغریب روایات جمع کرنے کا بڑا اشتیاق رہتا تھا وہ ایسی روایات نقل کرتے تھے جنہیں انسانی عقل قبول نہیں کرتی تھی۔

مگر اس کے باوجود فصل الخطاب انتہائی قدر و قیمت کی حامل ہے۔

واضح رہے کہ فصل الخطاب میں تحریف کے اثبات کے لئے مجموعی طور پر ۱۱۲۲ احادیث سے ثابت کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکسٹھ روایات ایسی ہیں جن میں عمومی طور پر تحریف کا اثبات کیا گیا ہے جب کہ ۱۰۶۸ روایات میں خاص جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں تحریف واقع ہوئی ہے۔

مذکورہ روایات کی بھاری اکثریت کو بے سند اور بے اعتبار کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔ بعض ایسی کتابوں سے بھی روایات نقل کی گئی ہیں جن کے مؤلف ہی مجہول ہیں یا ان کی سند منقطع ہے یا پھر جعلی اور بے اعتبار ہیں۔

فصل الخطاب کی زیادہ تر روایات حسب ذیل تین کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

۱۔ کتاب قراءات۔ مؤلفہ احمد بن محمد سیّاری۔ اس کا تعلق آل طاہر کے کاتبوں سے تھا اور اس کے متعلق علماء لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث، فاسد المذہب اور زیادہ تر مرسل روایات نقل کرتا تھا۔(۱)

۱۔ فہرست شیخ طوسی ص ۷۴ شمارہ ۷۰۔ رجال نجاشی جلد اول ص ۲۱۱ شمارہ ۱۹۰۔

۲۔کتاب علی بن احمد کوفی (المتوفّٰی ۳۵۲ھ) علمائے رجال نے اسے کذاب اور باطل کا پرستار قرار دیا ہے۔

علم الرجال کے مشہور شیعہ ماہر ''نجاشی'' اس کے متعلق لکھتے ہیں:

وہ کوفی تھا اور آل ابوطالب میں سے تھا اس نے زندگی کے آخری ایام میں ''غلو'' کا عقیدہ اپنایا تھا۔اس کا مذہب ختم ہوگیا۔اس نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں اور اس کی اکثر کتابیں خطا اور اشتباہ سے بھری ہوئی ہیں۔البتہ غالیوں کے ہاں اس شخص کا بڑا مقام ہے۔(۱)

۳۔تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔یہ تفسیر اگرچہ علی بن ابراہیم کے نام سے معروف ہے لیکن یہ ساری کتاب ان کی تالیف نہیں ہے۔اس کتاب کا ایک حصہ انہوں نے لکھا تھا جب کہ کچھ حصہ ابوالجارود کا لکھا ہوا ہے۔علی بن ابراہیم قمی کے شاگرد نے ابولجارود کے لکھے ہوئے حصہ کو بھی ان کی تحریر کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس کتاب کا راوی جو اپنے آپ کو علی بن ابراہیم کا شاگرد بتاتا ہے اور اس کا نام ابوالفضل عباس بن محمد بن علوی ہے، وہ مجہول ہے اور کتاب رجال میں اس کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔اسی لئے ایسی تفسیر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔(۲)

چنانچہ اس طرح کی کتابوں سے محدث نوری نے ۸۱۵ روایات نقل کی ہیں۔اگر ان روایات کو علیحدہ کر دیا تو پھر ۳۰۷ روایات باقی بچتی ہیں اور ان میں سے ۱۰۷ روایات کا تعلق اختلاف قرأت سے ہے اور مسئلہ تحریف سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔جبکہ محدث نوری نے صرف ۲۰۰ روایات معتبر کتابوں سے نقل کی ہیں جو کہ سب کی سب قابل توجیہ ہیں یا پھر یہ کہ وہ سرے سے تحریف پر دلالت ہی نہیں کرتیں اور محدث نوری نے انہیں خواہ مخواہ تحریف کی روایات میں شامل کیا ہے۔

۱۔رجال نجاشی جلد ۲ ص ۹۶ شمارہ ۶۸۹

۲۔تفسیر قمی کی قدر و قیمت معلوم کرنے کے لئے کتاب ''کلیات فی علم الرجال'' ص ۳۲۹۔۳۴۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

جو حضرات اس مسئلہ کے تفصیلی جائزے کے خواہش مند ہوں تو انہیں آیت اللہ معرفت کی کتاب "صیانۃ القرآن من التحریف" کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(مزید معلومات کے لئے سید ہاشم المعروف حسینی لبنانی کی کتاب بین التصوف والتشیع کا مطالعہ فرمائیں اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام "تصوف اور تشیع کا فرق" ہے)۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۳

مصحف فاطمہ سلام اللہ علیہا

سوال: کہا جاتا ہے کہ شیعوں کے پاس ایک اور قرآن ہے جسے ''مصحف فاطمہؑ'' کہا جاتا ہے۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟

جواب: قرآن کریم میں لفظ ''صحف'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ (سورۂ التکویر آیت ۱۰)

(جب اعمال نامے پھیلا دیے جائیں گے)۔

دوسرے مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

" اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ " (سورۂ اعلیٰ/۱۸۔۱۹)

(یہ بات پہلے صحیفوں میں موجود ہے۔ ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں)۔

لفظ مصحف بھی اسی مادہ سے ماخوذ ہے جس کا معنی رجسٹر یا جلد شدہ کتاب کے ہیں۔ واضح رہے کہ صدر اسلام اور حضرت رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں قرآن کریم کو لفظ ''مصحف'' سے یاد نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہر کتاب کو لفظ مُصحف سے یاد کیا جاتا تھا۔

ابن ابی داوٗد سجستانی نے قرآن کریم کو مصحف میں جمع کرنے کے متعلق محمد ابن

سیرین سے یہ روایت نقل کی ہے:

جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو علیؑ نے فرمایا:

" اَقْسَمَ عَلِیٌّ عَلٰی اَنْ لَایَرْتَدِی الرِّدآءِ اِلَّا لِجُمْعَۃٍ حَتّٰی یَجْمَعَ الْقُرْاٰن فِی مُصْحَفٍ"

(علیؑ نے قسم کھائی ہے کہ وہ جمعہ کے علاوہ اپنی دوش پر ردا نہیں رکھے گا جب تک قرآن ایک مجلہ شکل میں جمع نہ کردے)۔

ابوالعالیہ نے لفظ مصحف کو مجلد کتاب کے معانی میں استعمال کرتے ہوئے کہا

"اِنَّھُمْ جَمَعُوا الْقُرْاٰنَ فِی مُصْحَفٍ فی خلافَۃِ ابی بَکْرٍ"

(انہوں نے حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں قرآن کو "مُصحف" میں جمع کیا)۔

ابوالعالیہ نے مزید کہا:

"اِنَّ عُمَرَ بنَ الْخَطّابِ اَمَرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ وَکَانَ اَوَّلَ مَنْ جَمَعَهٗ فِی الْمُصْحَفِ"(1)

(عمر بن خطاب نے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا اور وہ پہلا شخص ہے جس نے قرآن کو "مصحف" میں جمع کیا)۔

مذکورہ جملوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں "مصحف" بڑے رجسٹر یا مجلہ کتاب کو کہا جاتا تھا جس کے اوراق کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے جلد بندی کر دی جاتی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ "مصحف" کے مفہوم میں تبدیلی آئی اور اس کا معنیٰ قرآن کیا جانے لگا۔

ہمارے ائمہ کرام کی روایات میں بھی لفظ "مصحف" جلد شدہ کتاب یا لکھے ہوئے رجسٹر کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ کتاب المصاحف تالیف حافظ ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد سجستانی ص ۹۔۱۰

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرآنَ فِي الْمُصْحَفِ يَتَمَتَّع بِبَصَرِهِ". (۱)

(جو کوئی قرآن کو مجلد کتاب سے پڑھے تو وہ اپنی نگاہ سے لطف اندوز ہوتا رہے گا)۔

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا:

"قِرأَةُ الْقُرآنِ فِي الْمُصْحَفِ تُخَفِّفُ الْعَذابَ عَنِ الْوالِدَينِ". (۲)

(مصحف پر دیکھ کر قرآن کو پڑھنے سے والدین کے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے)۔

مؤرخین نے خالد بن معدان کے حالات زندگی میں یہ کلمات لکھے۔

"اِنَّ خالدَ بنِ مَعْدانٍ کانَ عِلمُهُ فی مُصْحَفٍ لَهُ اِزارٌ وَعُرىً". (۳)

(خالد بن معدان نے اپنی معلومات کو ایک کتابچہ میں لکھ کر محفوظ کرلیا تھا اور کتابچہ پر اس نے بٹن لگوائے تھے اور اس کو پکڑنے کی جگہ بھی بنوائی ہوئی تھی)۔

واضح رہے کہ خالد بن معدان تابعی تھا اور اس نے ستر صحابہ سے ملاقات کی تھی۔ ابن اثیر نے اس کے حالات مادہ ''کلاعی'' میں نقل کیے ہیں (۴)

مذکورہ بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک لفظ ''مصحف'' قرآن کریم کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ یہ لفظ کسی بھی مجلد کتاب اور کسی بھی ایسے مجلد رجسٹر کے لئے استعمال ہوتا تھا جس میں لوگ اپنی معلومات کو جمع کرتے تھے۔ قرآن مجید کو ''مصحف'' کہنے کا رواج بہت بعد میں ہوا اور اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ الفاظِ قرآن ذہن سے باہر آئے اور انہیں اوراق پر منتقل کیا گیا اور ایک مجلد کتاب کی شکل دی گئی۔

۱۔ اصول کافی: ج ۲ ص ۶۱۳

۲۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۶۱۳

۳۔ المصاحف سجستانی ص ۱۳۴۔۱۳۵

۴۔ اللباب فی تھذیب الانساب، ابن اثیر جلد ۳ ص ۶۲۔۶۳

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ بنتِ رسول سلام اللہ علیہا کی پاس ایک مصحف تھا۔ مقصد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد گرامی قدر سے جو علم حاصل کیا تھا وہ علم انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک رجسٹر پر لکھ دیا تھا اور اسے اپنی اولاد کے لئے بہترین میراث کی شکل میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔

خوش قسمتی سے سیدہ کی اولاد نے بھی لوگوں کو اس مصحف کی حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مصحف فاطمہ میں حضرت رسول خدا سے سنی ہوئی باتوں یا کسی اور ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اس مفہوم کی چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے پاس ایک جامعہ ہے اس میں حلال وحرام کا ذکر ہے۔ اور ہمارے پاس مصحف فاطمہ ہے اس میں قران مجید کا ایک لفظ تک نہیں ہے، اس میں وہ فرامین ہیں جو رسول خدا نے لکھوائے تھے اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے وہ مصحف ہمارے پاس موجود ہے"(۱)

امام حسن مجتبیٰؑ نے پوری وضاحت سے ارشاد فرمایا کہ اس میں حلال وحرام کے مسائل نہیں ہیں کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ دخترِ رسول پر وحی تشریعی نازل ہوئی تھی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مصحفِ فاطمہ کے متعلق فرمایا:

"وَاللهِ مَافِيهِ مِنْ قُرانِكُمْ حَرْفٌ واحدٌ: قُلتُ هٰذا وَاللهِ العِلْمُ؟ قالَ: اِنَّهُ لَعِلْمٌ وَ ماهُوَ ابِذاك"(۲)

(خدا کی قسم! اس میں تمہارے قران میں سے ایک حرف بھی نہیں ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: کیا اس میں علم ہے؟

۱۔ بصائر الدرجات، صفاص ۱۵۷۔۱۵۸

۲۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۶۱۳ حدیث اول

امام نے جواب دیا: جی ہاں، اس میں عام علم نہیں ہے)۔

ہمارے نقل کردہ بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصحفِ فاطمہؑ کا قرآن سے کوئی ارتباط نہیں ہے۔ جو لوگ ان بیانات کو تحریف قرآن کی دستاویز قرار دیتے ہیں اگر وہ خواہ مخواہ الزام تراشنے والے نہیں ہیں تو پھر وہ کسی تحقیق کے بغیر یہ باتیں کہہ رہے ہیں اب ہم اپنے قارئین کے لئے حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں:

''اسلام میں ''مُحدَّث''

علمائے اسلام میں ''مُحدَّث'' ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ ''مُحدَّث'' نبی نہیں ہوتا اور اس پر وحی الٰہی نازل نہیں ہوتی لیکن اس کا مقام اتنا بلند ہوتا ہے کہ فرشتے اس سے گفتگو کرتے ہیں اور وہ ان کی گفتگو کو سنتا ہے۔ اس لئے اسے ''مُحدَّث'' (بروزن اسم مفعول) کہا جاتا ہے۔ اسے ''مُحدَّث'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ملائکہ اس سے ''حدیث'' (باتیں) کرتے ہیں۔ بخاری لکھتے ہیں کہ رسول اکرم نے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَر..." (۱)

(تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے افراد ہوا کرتے تھے جن سے (عالم غیب سے) باتیں کی جاتی تھیں جبکہ وہ نبی بھی نہیں ہوتے تھے اور اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص موجود ہے تو وہ عمر بن خطاب ہے)۔

اہل سنت کے ہاں لفظ ''محدث'' اتنی بار استعمال ہوا ہے جسے ہم یہاں نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ صحیح بخاری کے شارحین نے اس کی وضاحت میں بہت کچھ لکھا ہے (۲)

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۹۴ باب مناقب عمر بن الخطاب

۲۔ ارشاد الساری شرح صحیح بخاری جلد ۶ ص ۹۹

کلینی نے الکافی میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے:

"اِنّ الأَئِمّۃَ مُحَدَّثُونَ مُفَھّمُونَ" اور اس موضوع کی احادیث جمع کی ہیں۔ تمام احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ''محدث'' وہ ہوتا ہے جو فرشتے کی آواز کو سنتا ہے لیکن اسے فرشتہ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر کلینی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ تمام ائمہ اہل بیت ''محدث'' تھے۔ (۱)

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا محدثہ تھیں

رسول اکرمؐ کی دختر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے کمال وجود کی وجہ سے ''محدثہ'' تھیں یعنی آپ فرشتے کی آواز سنتی تھیں لیکن دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ جب آپ کے والد ماجد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی تو آپ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل امینؑ آپ کے گھر میں آتے تھے اور آکر حضرت سیدہؑ کو آنے والے حالات سے آگاہی دیتے تھے اور اس طرح سے بی بی کو تسلی اور ڈھارس بندھاتے تھے۔ آیئے مصحف فاطمہؑ کی خصوصیات اولاد فاطمہؑ کی زبانی سنیں:

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وفات دی تو شدید غم نے حضرت فاطمہؑ کو گھیر لیا تب اللہ تعالیٰ نے سیدہ کی تسلی کے لئے ایک فرشتے کو بھیجا۔ حضرت فاطمہؑ اس کی زبان سے جو کچھ سنتی تھیں اپنے شوہر امیر المومنینؑ سے بیان فرمادیتی تھیں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ جب آپ فرشتہ کی آواز سنیں تو مجھے آگاہ کریں تاکہ میں اس کی کہی ہوئی باتوں کو لکھ لوں۔ چنانچہ فرشتہ حضرت فاطمہؑ سے کلام کرتا تھا اور حضرت علیؑ اسے لکھ لیتے تھے یہاں تک کہ وہ ایک کتابچہ کی شکل میں جمع ہوا۔ اور اسے ''مصحف'' کا نام دیا گیا۔ اس میں حلال وحرام کے مسائل نہیں تھے۔ بلکہ اس میں آنے والے واقعات کی جھلکیاں تھیں (۲)

۱۔ اصول کافی جلد اول ص ۳۲۵۔۳۲۷

۲۔ الکافی جلد اول، باب فیہ ذکر الصحیفۃ حدیث ۲

۴۔

مُصحفِ علیؑ

سوال: کیا حضرت علی بن ابی طالبؑ کے پاس کوئی علیحدہ مصحف موجود تھا؟

جواب: یہ سوال دو طرح سے پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مصحفِ علیؑ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ''کتاب علیؑ'' سے کیا مراد ہے؟

''مصحف علیؑ'' سے قرآن کریم کا وہ نسخہ مراد ہے جسے آپ نے ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا تھا۔ ابن ندیم ''فہرست'' میں لکھتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے یہ محسوس کیا کہ لوگ وفات پیغمبر کو اپنے لئے فالِ بد تصور کر رہے ہیں اسی لئے آپ نے قسم کھائی کہ جب تک قرآن جمع نہ کرلوں تب تک اپنے کندھے پر چادر نہیں ڈالوں گا۔ آپ نے تین دنوں میں قرآن جمع کیا اور مسجد میں لے آئے۔ (۱)

یعقوبی لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے رسول خداؐ کی وفات کے بعد قرآن جمع کیا تھا اور اسے سات حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس وقت قرآن مجید کے سات اجزا اور ان میں مرقوم سورتوں کو یاد کیا جاتا تھا۔ (۲)

۱۔ تاریخ القرآن ص ۶۷ تالیف ابو عبداللہ زنجانی (المتوفٰی ۱۳۶۰ھ) طبع قاہرہ با مقدمہ احمد امین مصری)

۲۔ تاریخ یعقوبی (ابن واضح اخباری) جلد ۲ ص ۱۲۶

یعقوبی نے حضرت علیؑ کے جمع کردہ قرآن کی جو خصوصیات بیان کی ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو اس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اس کا موجودہ قرآن کے ساتھ سورتوں کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہ تھا البتہ اگر کوئی اختلاف تھا تو سورتوں کے جمع کرنے کی کیفیت کا تھا۔

اگر ایسا قرآن فی الواقع موجود ہوتا تو اس کی وجہ سے کسی تحریف کا خطرہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا، علیؑ کے مصحف ہی میں سورتوں کی ترتیب کا فرق نہیں تھا۔ ابن عباس کے مصحف میں بھی سورتوں کی ترتیب کا فرق پایا جاتا تھا۔

اب ہم دوسرے سوال کا جواب عرض کرتے ہیں:

''کتاب علیؑ'' سے وہ چیز مراد ہے جسے امیر المومنینؑ نے حیاتِ رسول میں لکھا تھا آپ رسول خدا سے جو بھی حلال وحرام کا مسئلہ سنتے یا دوسرے مطالب سنتے تھے ان سب کو لکھ لیتے تھے۔ رسول خدا کی بیان کردہ احادیث کو آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور اس مجموعہ کو ''کتاب علی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے بعد یہ کتاب نسلاً بعد نسلاً آپ کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ اس کتاب سے استفادہ کر کے احکام بیان کرتے تھے۔

نجاشی مذہب شیعہ کے مشہور علم الرجال کے ماہر گزرے ہیں۔ انہوں نے محمد بن عذافر صیرفی سے روایت کی۔ اس نے اپنے والد سے روایت کی کہ میں حکم بن عتیبہ کے ساتھ امام محمد باقرؑ کی خدمت میں موجود تھا۔ حکم مسلسل سوال کرتے رہے اور امام مسلسل جواب دیتے رہے لیکن ایک مقام پر ان کا آپس میں اختلاف ہوگیا۔ امام محمد باقرؑ نے اپنے فرزند امام جعفر صادقؑ سے فرمایا: فرزند! جاؤ (گھر سے) کتاب علیؑ لے آؤ۔ جعفر صادق گھر گئے اور وہاں سے ایک لپٹے ہوئے طومار کی مانند ایک بڑی سی کتاب لے آئے۔ امامؑ نے اختلافی مسئلہ اس میں تلاش کیا اور حکم بن عتیبہ سے فرمایا: اسے رسول خداؐ نے لکھوایا اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے پھر آپ نے اس سے فرمایا کہ تم اور تمہارے دوست سلمہ بن کہیل اور ابو المقدام جہاں بھی چلے جائیں تمہیں اس

علم سے زیادہ مستحکم علم اور کہیں نہیں ملے گا کیونکہ جبرئیل ہمارے گھرانے میں نازل ہوتے تھے۔(۱)

کچھ دوسری روایات میں یہ الفاظ مرقوم ہیں کہ اس کتاب کا طول ستر ہاتھ اور اس کی موٹائی اونٹ کی ران کے برابر تھی اور وہ ایک طومار کی طرح سے لپٹی ہوئی تھی۔

اس کتاب کے علاوہ امیر المومنینؑ کے پاس ایک اور کتاب بھی تھی جس کا نام ''صحیفہ'' تھا اس میں دیت کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ اس صحیفہ سے کتبِ حدیث میں بہت سی روایات آئی ہیں۔

محقق فرزانہ مرحوم جناب میرزا علی میانجی نے صحیفہ سے کتب احادیث میں لی گئی تمام احادیث کو جمع کیا ہے۔(۲)

ہم نے اپنی کتاب " تاریخ الفقہ الاسلامی وادوارہ" میں کتاب علیؑ اور صحیفہ علیؑ کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔(۳)

آخر میں ہم اپنے قارئین کرام کو یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ وفات رسول کے بعد خلفاء نے کتابتِ حدیث پر پابندی عائد کردی تھی لیکن حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد اور آپ کے شیعوں نے حدیث رسولؐ کو لکھا اور اس کی ہر ممکن حفاظت کی اور انہوں نے ایک سو سال تک حدیث پر جاری رہنے والی پابندی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم مناسب مقام پر گفتگو کریں گے۔

۱۔ رجال نجاشی۔ شمارہ ترجمہ ۹۶۷

۲۔ مکاتیب الرسول جلد اول ص ۶۶۔۷۱

۳۔ تاریخ الفقہ الاسلامی وادوارہ ص ۱۱۸

۵

دعا کو قرآن سے زیادہ اہمیت دینا

سوال: شیعہ حضرات قرآن کریم کی بہ نسبت دعاؤں کی کتابوں کو زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں؟

جواب: ائمہ اہل بیتؑ سے ہمیں جو تعلیمات حاصل ہوئی ہیں ان میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ دعا کو تلاوت قرآن سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔قرآن ایک جاودانی معجزہ ہے اور کتب آسمانی کی آخری کڑی ہے جس کی روشنی ہر دور اور ہر زمانہ میں باقی رہے گی۔ بہت سی روایات میں قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے اور خوش الحانی سے تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور اس کی اہمیت پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

اس بارے میں ''قرآن در روایات اہل بیتؑ'' نامی کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ یہ کتاب ایران اور مصر سے شائع ہوئی ہے اور اس میں ہادیان دین اور ائمہ طاہرینؑ کی زبانی قرآن کریم کی عظمت بیان کی گئی ہے۔

ہمارے ملک جمہوری اسلامی ایران میں مردوں، عورتوں حتی نونہالوں کے حفظ قرآن کے لئے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے پانچ چھ سال کے کچھ بچے بھی پورے قرآن کے حافظ ہیں اور انہوں نے حفظ قرآن کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں انعامات جیتے ہیں۔ ہمارے

ملک میں ہر سال قرآن مجید کے حفظ و قرأت کے بین الاقوامی مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور بین الاقوامی منصفین، حفظ، ترجمہ اور تفسیر کے منتخبین کو انعامات عطا کرکے انہیں تشویق دلاتے ہیں۔

جمہوری اسلامی ایران میں قرآن کریم کے لئے خصوصی ٹی وی چینل قائم ہیں جو دن رات قرآن مجید کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں ہمارے عوام دعائے کمیل اور دعائے ندبہ پر فریفتہ ہیں، ان دعاؤں کے اجتماعات شب جمعہ اور صبح جمعہ منعقد ہوتے ہیں۔ شاید لوگ ہمارے دعاؤں کے اجتماعات دیکھ کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہمارے یہاں قرآن کی بہ نسبت دعاؤں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اہل سنت کے ہاں اس طرح کی بلیغ اور موثر دعائیں انتہائی کم ہیں اسی لئے وہ دعاؤں کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں اور جب وہ شیعوں کو دعاؤں میں مصروف دیکھتے ہیں تو انہیں یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ ان کے ہاں دعاؤں کو تلاوتِ قرآن سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ (۱)

دعا اور مناجات کو عبادت کا بلند ترین درجہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق یہ حدیث وارد ہے ''الدعاء مخ العبادۃ'' (۲) (دعا اور خدا سے راز و نیاز عبادت کا مغز ہے)۔

۱۔ مترجم کو زیارتِ بیت اللہ کا شرف نصیب ہوا۔ چنانچہ بندہ نے ایک رات مقام ابراہیمؑ کے پاس بیٹھ کر دعائے جوشن کبیر پڑھی۔ میرے ساتھ ایک عرب جوان بیٹھا ہوا تھا وہ پوری توجہ سے دعا کو سنتا رہا اور روتا رہا۔ دوسری رات پھر اسی وقت میں نے وہاں بیٹھ کر دعائے کمیل پڑھی تو وہ جوان میرے قریب آ گیا اور دعا سن کر روتا رہا۔ دعا ختم ہونے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ شیعہ ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ جوان نے کہا کہ میں سعودیہ کا باشندہ ہوں آپ کے پاس ایسی پُر درد اور پُر اثر دعائیں کیسے آ گئیں جب کہ ہمارے ہاں تو ایسی موثر دعائیں دکھائی نہیں دیتیں؟

میں نے عرض کیا کہ آپ لوگ حضرت علیؑ اور امام زین العابدینؑ سے دور ہیں۔ اگر آپ ان کے قریب ہوتے تو یہ جواہر ریزے آپ کے پاس بھی ہوتے۔

جوان نے کہا: بے شک جن کی دعائیں اس قدر بلند مرتبہ ہیں وہ واقعی حقیقی امام تھے۔

۲۔ سفینۃ البحار جلد اول مادہ دعا

٦

تحریف کی روایات کو کتب حدیث سے حذف کیوں نہیں کر دیا جاتا؟

سوال: جب شیعہ قرآن کو تحریف سے پاک مانتے ہیں تو وہ ایسی روایات کو اپنی کتب حدیث سے حذف کیوں نہیں کر دیتے؟

جواب: اسلامی ثقافت میں علمائے شریعت کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ علمائے اسلام کا ایک گروہ وہ ہے جنہیں ''محدث'' کہا جاتا ہے۔ ان کا کام احادیث کو جمع کرنا ہے خواہ وہ مُسند ہوں یا مُرسل ہو۔ محدثین نے صحیح، سقیم، معتبر اور غیر معتبر احادیث کا خیال رکھے بغیر احادیث جمع کی ہیں۔ البتہ انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ جن الفاظ سے انہوں نے حدیث کو سنا ان ہی الفاظ سے اسے اپنے قارئین تک پہنچائیں۔

ب۔ علمائے اسلام کا ایک گروہ وہ ہے جسے علمائے عقیدہ و شریعت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ علمائے محدثین کی احادیث کی سند اور مضمون کی چھان بین کرتے ہیں چنانچہ تحقیق کے مراحل سے گزر کر وہ کچھ روایات کو قبول کرتے ہیں اور کچھ روایات کو رد کرتے ہیں۔ یہ گروہ حفظِ امانت کے تقاضوں سے مجبور ہے اسی لئے یہ محدثین کی کتابوں میں کوئی ردو بدل نہیں کرتا۔ البتہ انہوں نے بعض کتابوں کی تلخیص کی ہے اور بعض علماء نے کسی کتاب سے صحیح احادیث کو علیحدہ شکل میں شائع

کرایا ہے۔لیکن تاریخ میں مسلسل یہ کام ہوتا رہا ہے کہ محققین کا گروہ محدثین کے کام کی چھان پھٹک کرتا رہا ہے۔ بالکل ایک کارخانہ (کے معمولات) کی مانند کہ کچھ لوگ اس کے لئے خام مال فراہم کرتے ہیں اور انجینئرز کی ٹیم اس میں سے صحیح مواد چن کر اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔لہٰذا ہم نے کتاب ہذا میں بار ہا یہ گذارش کی ہے کہ کتب احادیث کو کتب عقائد نہیں سمجھنا چاہیے۔اگر کافی جیسی کتاب میں بھی کوئی ایسی روایت دکھائی دے جو تحریف کو ثابت کرتی ہو تو وہ روایت نا قابل قبول شمار کی جائے گی۔اگرچہ الکافی بذات خود ایک قابل قدر کتاب ہے۔

احمد بن حنبل (المتوفّٰی ۲۴۱) نے احادیث کو جمع کر کے مُسند تشکیل دی تھی اس کتاب میں تیس ہزار احادیث موجود ہیں۔ان روایات میں ضعیف اور غیر صحیح احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا انتخاب مشکل ہے۔اس کے باوجود احمد کا کام رضائے خداوندی پر مبنی تھا اسی طرح علمائے محققین کا کام بھی رضائے الٰہی کے جذبہ پر مبنی تھا۔

بنیادی طور پر علماء کی محنت، نقد و تبصرہ اور مباحثوں نے ہر زمانے میں اسلام کو نئی زندگی دی ہے۔اگر تحقیق کا یہ عمل ختم ہو جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں دین کے چہرے پر غفلت و نسیان کا گرد و غبار چھا جائے گا۔

۷

شیعہ اور آیات متشابہات کی تاویل

سوال: کیا شیعہ حضرات اپنے مذہب کی تائید کے لئے آیات قران کی تاویل کرتے ہیں؟

جواب: اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے کچھ آیات کی تاویل کے متعلق کچھ معروضات پیش کرتے ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تمام علمائے اسلام تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قران کریم کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور فرمایا ہے:

"هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ ۚ وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔ‌ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝" (سورۂ آل عمران/۷)

[وہی ہے جس نے آپ پر کتاب (قران) نازل کی اس میں کچھ آیات محکم ہیں جو کتاب کی بنیاد اور اصل ہیں اور ایک حصہ متشابہ ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی اور انحراف ہے وہ فتنہ انگیزی اور "تاویل طلبی" کے لئے "متشابہ" کی پیروی کرتے ہیں جبکہ اس کی تاویل کو خدا اور راسخین فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب

آیات ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور اہل عقل کے علاوہ اور کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔]

اس آیت مجیدہ نے قرآنی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔محکم ۲۔متشابہ

''محکم'' سے وہ آیات مراد ہیں جو بلحاظِ دلالت واضح اور مستقل ہوں اور ان میں دو مفاہیم کا احتمال موجود نہ ہو۔اس کے برعکس ''متشابہ'' وہ آیت ہے جس کا ظہور متزلزل ہو اور اسکی وضاحت کے لئے خود اس آیت میں اور اس سے مربوط دوسری آیات پر توجہ کی ضرورت محسوس ہو کہ اس کے بعد اس کا مطلب و مفہوم واضح ہو اور مفہوم میں پایا جانے والا تزلزل ختم ہو اور آیت کی صحیح تفسیر سامنے آئے۔

متشابہ آیات کے متعلق علماء میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے لیکن اس کی تاویل کی ضرورت پر سب متفق ہیں۔کبھی متشابہ آیات کی تاویل فتنہ گر افراد کرتے ہیں اور وہ اس سے غلط مطالب کا استنباط کرتے ہیں اور کبھی متشابہ آیات کی تاویل ایسے ''راسخین فی العلم'' کی وساطت سے سامنے آتی ہے جو پوری توجہ اور بے غرضی کے ساتھ اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات پر دِقّت کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انجام کار وہ مقصودِ الٰہی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ متشابہ کی تاویل کے لئے کچھ حدود و ضوابط ہیں جو کہ ایک مفسر میں ہونے ضروری ہیں۔

آج کل مغرب میں ایک علم متعارف کرایا گیا ہے جسے ''ہرمنوتیک'' (علم تشریح) کا نام دیا گیا ہے اور یہ علم کتاب مقدس کی تفسیر کے لئے متعارف کرایا گیا ہے۔

عالم اسلام کی خوش نصیبی ہے کہ علمائے اسلام نے آج سے صدیوں پہلے اس علم کی بنیاد

رکھی تھی اور تفسیر و مفسر کے شرائط کو اپنی کتابوں میں بیان کیا تھا۔(۱)

ذیل میں ہم تاویل مقبول کے چند نمونے بیان کرتے ہیں۔ یہ تاویل دراصل تفسیر الآیت بہ آیت کے اصول پر مبنی ہے۔

قرآن نے بلند و بالا معارف کو عام افراد کی ذہنی سطح تک لانے کی کوشش کی ہے تاکہ تمام افراد کسی استثنا کے بغیر ان معارف سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان معارف کو تمام افراد تک پہنچانے کے لئے مسائل عقلی کو حسّی لباس پہنایا جس کی وجہ سے احتمالات نے جنم لیا اور کچھ ایسے احتمالات بھی منظر عام پر آئے جو قرآن کے مسلمہ اصولوں سے سازگار نہیں تھے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ کوئی بھی ظالم و ستمگر خداوند عالم کے دست تصرف سے باہر نہیں ہے۔ خدا کو ان سب پر مکمل اقتدار حاصل ہے۔ اس کے احاطۂ قدرت سے کوئی بھی شخص باہر نہیں ہے۔ اس مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا:

"اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾" (سورۂ فجر/۱۴)

(بے شک تیرا پروردگار گھات میں ہے)

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اپنی ہیبت و عظمت کے اظہار کے لئے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾" (سورۂ فجر/۲۲)

(قیامت کے دن جب ملائکہ صفیں باندھے کھڑے ہوں گے تو تیرا خدا آئے گا)

ان آیات کا مقصد خدا کی قدرت اور اس کی حکومت کو بیان کرنا ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ خداوند عالم تمام کائنات کو محیط ہوگا۔ لیکن اس مفہوم کو محسوس مسائل کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ اس علم کی تفصیل کے لئے ہماری کتاب "المناهج التفسیریہ" کے صفحات ۱۹ تا ۴۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

آیات متشابہات کے حقیقی مفہوم کو تلاش کرنے کے لئے اس سے پہلے کی آیات میں موجود قرائن اور اس جیسی دوسری آیات پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور جب کوئی مفسر ان شرائط کی پابندی کرتا ہے تو متشابہ آیات محکمات کے مساوی ہو جاتی ہیں۔

تاویل کی ایک اور قسم

قرآن کریم میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جو کہ محکم ہونے کے باوجود تاویل کے قابل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ سائل کی مراد یہی تاویل ہو۔ تاویل محکم کا مقصد کسی کامل و اکمل مصداق کی نشان دہی ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کہتا ہے:

"اهدنا الصراط المستقیم"

مفسرین نے "صراط مستقیم" کی تفسیر میں مختلف احتمالات پیش کیے ہیں جب کہ ہماری تفاسیر میں اس سے رسول خداؐ اور آپؐ کے جانشینوں کا راستہ مراد لیا گیا ہے۔ یقیناً اس طرح کی تاویل سے "صراط مستقیم" کا کامل و اکمل مصداق بیان کیا گیا ہے کیونکہ تمام انبیاء اور اولیائے الٰہی صراط مستقیم پر تھے اور انہوں نے صحیح راستے پر ہی سفر کیا تھا لیکن رسول اکرم اور آپ کا خاندان اس کا کامل نمونہ تھے اور انکی رفتار و گفتار "صراط مستقیم" کو واضح کرتی تھی۔

اس طرح کی تاویل میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ روایتِ صحیح سے ثابت ہو۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝" (سورۂ الرعد/۷)

(پیغمبر! آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر ملت کا ہادی ہوتا ہے)

ہماری روایات میں وارد ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

"انا المنذر وانت الھادی"۔ (۱)

(میں ڈرانے والا ہوں اور تو ہادی ہے)۔

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ تمام افراد جن کے دوش پر پرچم ہدایت تھا وہ سب کے سب ہی ہادی تھے اور ہر دور میں ہادیوں کے سلسلے کو خدا نے جاری رکھا ہے جبکہ حضرت امیر المومنینؑ اس عظیم سلسلہ کے کامل واکمل فرد تھے۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۱۔ تفسیر البرہان تالیف محدث بحرانی جلد ۲ ص ۲۸۲ ضمن تفسیر آیت

۸

عصر رسول میں قران کی جمع آوری

سوال: کیا عصرِ رسالت میں جمعِ قران کا دعویٰ فضائل خلفاء سے انکار کے لئے نہیں ہے؟

جواب: عصرِ رسالت میں قرانی آیات اور سورتوں کا جمع کیا جانا ایک تاریخی حقیقت ہے جو کہ قطعی دلائل سے ثابت ہے۔ عصرِ رسالت میں قران کی جمع آوری پر اصرار خلفاء کی فضیلت سے انکار پر مبنی نہیں ہے بلکہ قران کو ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

ایسا سوچنا سوءظن ہے جسے قران نے حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

"یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" (سورۂ حجرات/ ۱۲)

(اے ایمان والو! زیادہ گمانوں سے پرہیز کرو کہ کچھ گمان گناہ ہوتے ہیں)

کیا ہی اچھا ہوتا کہ سائل الزام عائد کرنے سے پہلے تاریخی واقعات کی تحقیق کر لیتا۔

اس سلسلہ کے چند دلائل کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ طبرانی نے معجم میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں شعبی سے نقل کیا:

انصار کے چھ افراد نے رسول خدا کی زندگی میں قران جمع کیا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں

HASNAIN ALI DEPOT

۱۔ابی بن کعب ۲۔زید بن ثابت ۳۔معاذ بن جبل ۴۔ابوالدرداء

۵۔سعد بن عبید ۶۔ابوزید (۱)

۲۔قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے پوچھا کہ رسول اکرمؐ کے عہد میں کن لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا؟انس نے جواب دیا: وہ چار افراد تھے اور سب کے سب انصاری تھے۔

۱۔ابی بن کعب ۲۔معاذ بن جبل ۳۔زید بن ثابت ۴۔ابوزید(۲)

۳۔مسروق بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر کے سامنے عبداللہ بن مسعود کا نام لیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں ان کو دوست رکھتا ہوں۔میں نے رسول خداؐ سے سنا تھا آپ نے فرمایا کہ چار افراد سے قرآن حاصل کرو۔:

۱۔عبداللہ بن مسعود ۲۔سالم ۳۔معاذ ۴۔ابی بن کعب (۳)

۴۔نسائی نے سند صحیح سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر نے کہا:

میں نے قرآن جمع کیا اور ہر رات اس کا ختم کرتا تھا۔جب پیغمبر اکرمؐ نے یہ خبر سنی تو فرمایا کہ ایک ماہ میں قرآن ختم کرو۔(۴)

۵۔ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ مذکورہ افراد کے ذریعہ سے قرآن کی جمع آوری کی روایت سے حفظ قرآن مراد ہے، ایک مجموعہ کی صورت میں جمع کرنا مراد نہیں ہے۔لیکن یہ تصور بالکل بے اساس ہے کیونکہ حفظ قرآن صرف انہی افراد سے تو مخصوص نہیں تھا رسول مقبول کے عہد مبارک میں صرف چھ یا چار افراد تو حافظ قرآن نہیں تھے۔رسول خداؐ کی وفات کے چند دن بعد

۱۔منتخب کنز العمال جلد ۲ / ۴۸

۲۔منتخب کنز العمال جلد ۲ ص ۵۲

۳۔صحیح بخاری، باب القراء من اصحاب النبی جلد ۶ ص ۱۰۲

۴۔الاتقان، النوع العشرون جلد اول ص ۱۲۴

جنگ یمامہ ہوئی اس میں بہت سے حفاظ شہید ہوئے تھے[1]

٦۔ قرانی سورتوں کے ذریعہ سے دعوتِ مقابلہ

جو لوگ قران کریم کو وحی الٰہی نہیں مانتے تھے خدا نے انہیں چیلنج دیا کہ آؤ اس جیسا قران بنا کر دکھاؤ[2] پھر کہا کہ اس جیسی دس سورتیں بنا کر دکھاؤ[3] پھر کہا کہ اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھاؤ[4]

جب خدا نے یہ چیلنج دیا کہ اس جیسا قران بنا کر دکھاؤ۔ تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چیلنج کے وقت پورا قران اور اس کی تمام سورتیں جمع ہو چکی تھیں جو کہ منکروں کی دسترس میں بھی تھیں۔ قران کے اس چیلنج اور اس داخلی شہادت کی موجودگی میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عصر رسالت میں قران منتشر اجزا کی شکل میں تھا اور ایک مجموعہ کی صورت میں نہیں تھا۔

٧۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک متواتر اور صحیح السند حدیث میں فرمایا کہ میں تمہارے درمیان قران اور اپنی عترت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان سے وابستہ رہنا کیونکہ وابستگی کی صورت میں گمراہی سے محفوظ رہو گے۔

"اِنّی تارِکٌ فِیکُمُ الثّقلَین کِتابَ اللہِ وَعِترَتی"[5]

(میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور میری عترت اہل بیتؑ)۔

---

[1]۔ صحیح بخاری جلد ٦ ص ٩٨۔ (قول مشہور کے مطابق ستر افراد شہید ہوئے تھے)

[2]۔ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٨٨﴾ سورۂ بنی اسرائیل ٨٨

[3]۔ "قل فأتو بعشر سور مثله مفتریات" سورۂ ہود/ ١٣

[4]۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" سورۃ البقرہ/ ٢٣

٥۔ صحیح مسلم: ج ٧ ص ١٢٢۔ سنن ترمذی: ج ٢ ص ٣٠٧۔ سنن دارمی: ج ٢ ص ٤٣٢۔ مسند احمد: ج ٣ ص ١٤، ١٧، ٢٦، ٥٩،۔ ج ٤ ص ٣٦٦، ٣٧١۔ ج ٥، ص ١٨٢، ١٨٩۔ خصائص علویہ نسائی: ص ٢٠۔ مستدرک حاکم: ج ٣ ص ١٠٩، ١٤٨، ٥٣٣۔

لفظ ''کتاب'' بروزنِ ''فعال'' بمعنی مکتوب ہوتا ہے اگر عصر رسالت میں قرآن کتابی شکل میں موجود نہ تھا تو اس پر 'کتاب' کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر اس وقت قرآن کریم صرف حفاظ کے سینوں یا تراشے ہوئے پتھروں یا جانوروں کی کولہے کی ہڈیوں پر ہی لکھا ہوا تھا تو اسے لفظ ''کتاب'' سے موسوم نہیں کیا جاسکتا تھا۔

۸۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

''لَا صَلَاةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتَاب''۔(۱)

(کتاب اللہ کی افتتاحی سورت کے بغیر نماز نماز نہیں ہے)۔

اگر قرآن جمع نہ ہوا تھا تو سورہ الحمد کو کتاب اللہ کی افتتاحی سورت نہیں کہا جاسکتا تھا۔

۹۔ ہمیں یہاں عقل کے تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن رسالتِ پیغمبر کا جاودانی معجزہ ہے اور عقیدہ و شریعت کے استنباط کا منبع ہے۔ کیا رسول اکرمؐ جیسے فرزانہِ کائنات سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ نے خدا کی کتاب کو جمع نہ کر کے حوادث زمانہ کے سپرد کردیا ہوگا تاکہ جو حشر اُن کی سنت کا ہوا وہی حشر کتاب اللہ کا ہو؟

۱۰۔ رسول خداؐ نے قرآن کریم کے حفظ و تلاوت کا ثواب بیان کیا اور لوگوں کو ہر مرحلہ پر حفظِ قرآن کی ترغیب دی تھی۔ آنحضرتؐ کی طرف سے حفظ و نشرِ قرآن کا حکم دینا اس بات کی علامت ہے کہ قرآن آپ کی حیاتِ طیبہ میں جمع ہوگیا تھا آنحضرتؐ قرآن کے لئے اتنے حساس تھے کہ جب بھی باہر کا کوئی شخص مدینہ آکر اسلام لاتا تو آپ اسے قاریٔ قرآن کے پاس بھیجتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ جاؤ اور قرآن سیکھو(۲)

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر رسالت میں قرآن جمع ہو چکا تھا اور قرآنی نسخے مسلمانوں کی دسترس میں تھے۔

۱۔ سنن بیہقی: ج ۲ ص ۶۳، ۱۶۷۔ سنن دارمی: ج ۱ ص ۲۸۳، سنن ترمذی: ج ۱ ص ۱۵۴۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۳۲۴

فصل پنجم

امامت بہ نگاہ شیعہ

۱۔ اگر امامت اصول دین میں سے ہے تو قرآن میں اس کا بیان کیوں نہیں ہے؟

۲۔ قرآن میں ائمہ کے نام کیوں نہیں ہیں؟

۳۔ نبی اور امام اور نبوت و امامت میں کیا فرق ہے؟

۴۔ ائمہ شیعہ کے علوم کے منابع کیا تھے؟

۵۔ شیعوں کے نزدیک ائمہ کی تعداد بارہ ہی کیوں ہے؟

۶۔ کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ، امام حسن عسکریؑ کے بعد پیدا ہوا تھا؟

۷۔ کیا "الائمة الاثنی عشر کلهم من قریش" کی حدیث کے مصداق شیعوں کے بارہ امام ہیں؟

۸۔ کیا "الائمة الاثنی عشر" کی حدیث کی سند صحیح ہے؟

۹۔ کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے ماخوذ نہیں ہے؟

۱۰۔ آپ حضرت علیؑ کو وصی رسول کیوں سمجھتے ہیں؟

۱۱۔ قرآن میں موجود لفظ ''اولی الامر'' کو مخصوص افراد میں منحصر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

۱۲۔ کیا حدیث غدیر میں موجود لفظ ''مولیٰ'' محب اور ناصر کے معانی میں نہیں ہے؟

۱۳۔ حضرت علیؑ نے چھ رکنی شوریٰ کے انتخاب میں شوریٰ اختیار کی تھی۔ کیا آپ کی شمولیت سے یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ آپ امامت میں شورایت کے قائل تھے؟

۱۴۔ کیا نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ یا ان کی اولاد کی امامت کی کوئی نص قطعی موجود ہے؟

۱۵۔ آپ حضرات ائمہ کو صحابہ پر کیوں فوقیت دیتے ہیں؟

۱۶۔ آپ حضرات اپنے ائمہ کو انبیائے سابقین سے افضل کیوں مانتے ہیں؟

امامت

مقدمہ

امامت کا تعلق اصولِ اسلام سے ہے اور شیعہ اس پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں جو چیز اس گروہ کو باقی گروہوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شیعہ امامت کے لئے نص کا عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جس طرح سے نبوت کے عہدہ کا تقرر خدا کرتا ہے اس طرح سے امامت کے عہدہ کا تقرر بھی خدا کی جانب سے ہوتا ہے۔ شیعہ عقیدہ کے مطابق امامت ایک منصب الٰہی و سماوی ہے اور جانشین رسولؐ کے تعین کے لئے وحی الٰہی کی ضرورت ہے۔شیعہ علماء امامت کو اصولِ اعتقادی میں سے قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل سنت والجماعت امامت و خلافت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اجرا کے لئے ایک امام کی ضرورت سمجھتے ہیں اور ان کے پیش نظر یہ امت کا کام ہے کہ اپنا نظام چلانے کے لئے امام کا انتخاب کرے جو اس کام کو انجام دے سکے۔

الغرض اسلام کے دونوں مکاتب فکر اس امر پر متفق ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد امام کا ہونا ضروری ہے اگر اختلاف ہے تو امام کی تعین کے طریقے کار پر ہے امام کے تعین کے لئے دو طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں:

۱۔نص کا عقیدہ کہ امام کی تعین نص کی بنا پر ہوتی ہے

۲۔انتخاب کا نظریہ کہ امام کا انتخاب امت کی صوابدید پر منحصر ہے۔

امامت سے مربوط سوالات کا جواب دینے سے قبل مذکورہ بالا نظریات کا جائزہ لیتے ہیں اور دلائل سے موازنہ کرتے ہیں کہ مذکورہ نظریات میں سے کون سا نظریہ زیادہ مضبوط ہے۔

اگر صدرِ اسلام اور اس وقت کے حالات اور پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے وقت کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے مصالح اور اتحاد المسلمین کے لئے ضروری تھا کہ رسولِ خداؐ اپنے جانشین کا خود ہی اعلان کر کے جائیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت کی وفات کے وقت اسلام کو تین خطرات کا سامنا تھا اور خطرات کی تکون دین اسلام کو چیلنج کر رہی تھی۔ایک طرف سے رومی حکومت تھی اور دوسری طرف سے ایرانی شہنشاہیت تھی۔ (یہ دونوں بیرونی خطرے تھے)۔اندرونی خطرہ منافقین کی طرف سے تھا (جو اسلام کے وجود کو خاک میں ملانا چاہتے تھے)۔

رومی خطرہ حیاتِ پیغمبرؐ میں ہی پوری طرح سے سامنے آ چکا تھا اور آنحضرتؐ زندگی کے آخری لمحات تک اس خطرہ سے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔اسی خطرہ سے نمٹنے کے لئے آپؐ نے زندگی کے آخری ایام میں ایک لشکر تشکیل دیا تھا جس کا سربراہ اسامہ بن زید کو مقرر کیا تھا۔یہ معرکہ آپ کی نظر میں اتنا اہم تھا کہ آپ نے لشکرِ اسامہ سے پیچھے رہ جانے والوں پر لعنت کی تھی۔(۱)

خطرہ کی تکون کا دوسرا ضلع اسلام کا بد طینت دشمن تھا۔اور نفرت کی انتہا یہ تھی کہ خسرو پرویز نے آنحضرتؐ کے نامہ مبارک کو چاک کیا تھا اور اس نے اپنے یمن کے گورنر کو خط لکھا کہ محمد مصطفیؐ کو گرفتار کر لے یا انہیں قتل کر کے ان کا سر اس کے پاس بھیج دے۔

خطرے کی تکون کا تیسرا ضلع منافقین پر مشتمل تھا۔یہ مدینہ کے اندر اور باہر رسولِ اکرمؐ کی مزاحمت کرتے تھے اور ان کا کام مسلمانوں میں بد دلی پھیلانا تھا۔

قران کریم نے مختلف مقامات پر ان کی منفی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اور حد یہ ہے کہ اللہ نے ان کی مذمت میں ان کے نام پر ان کے برے افکار و اعمال کی وضاحت کے لئے قران کریم کا ایک پورا سورہ نازل کیا تھا۔

۱۔طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۱۹۰۔تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۱۷۔سیرت حلبی جلد ۳ ص ۲۰۷۔تاریخ طبری ۲ ص ۲۹۵۔تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۶۱

اس وقت کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کی مضبوط تکون قائم ہو چکی تھی اور دشمن ہر طرف سے گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو کیا ان حالات میں پیغمبرِ اکرمؐ امتِ اسلامی اور آئینِ اسلام کو بغیر رہبر کے اپنے حال پر چھوڑ دیتے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ عربوں کی زندگی قبائلی زندگی ہے اور قبائلی افراد اپنے سردار کے حکم پر عمل کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان حالات میں رہبر کا مقرر نہ کرنا قبائلی عصبیتوں اور قبائلی جھگڑوں کو برانگیختہ کرنے کا سبب بن سکتا تھا اور دشمن اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ الرئیس ابو علی سینا کہتے ہیں:

''نص رسولؐ کے تحت جانشین کا تقرر کرنا حقائق سے نزدیک تر ہے۔ کیونکہ جانشین کے تعین سے تمام اختلافات اور تنازعات ختم ہو سکتے ہیں''(۱)

HASSAN ALI

۱۔ شفاء، الھیات، مقالہ دہم، فصل پنجم ص ۵۶۴

۱

امامت در قرآن

سوال: اگر امامت کا تعلق اصول سے ہے تو قرآن مجید میں اسے بیان کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلامی معاشرہ کو ایک بلند قامت شخصیت کی ضرورت ہے، یہ وہ حقیقت ہے جسے ہر انصاف پسند انسان خود ہی محسوس کرسکتا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس مسئلہ کو سائل کے نظریہ کے برعکس ایک کلی صورت میں بیان کیا ہے۔

وہ آیات جن کا تعلق مسئلہ امامت سے ہے:

۱۔ آیت ولایت:

۱۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴿۵۵﴾ (سورۂ المائدہ/۵۵)

(تمہارا ولی صرف خدا ہے اور رسول ہے اور وہ جو ایمان لائے، نماز کو قائم کیا اور زکوۃ دیتے ہیں

جب وہ رکوع میں ہوتے ہیں)

بہت سے مفسرین ومحدثین نے اس آیت مجیدہ کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک سائل مسجد میں آیا اور اس نے نمازیوں سے مدد کی درخواست کی لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا۔ حضرت علیؑ رکوع کی حالت میں تھے، آپ نے سائل کو اپنی اُس انگلی کی طرف اشارہ کیا جس میں آپ نے انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ سائل آگے بڑھا اور اس نے آپ کی انگلی سے انگشتری اتار لی اور مسجد سے چلا گیا۔

پیغمبر اکرمؐ نے یہ سنا تو آپؐ نے اللہ تعالٰی سے درخواست کی: خدایا جس طرح تو نے موسیٰؑ کے لئے ان کے خاندان میں سے وزیر مقرر کیا تھا اسی طرح میرے خاندان میں سے میرا وزیر مقرر فرما۔ اس وقت فرشتہ وحی لے کر آیا اور "انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین۔۔۔" کی آیت مجیدہ کو آپ تک پہنچایا۔

اس آیت مجیدہ کے اس شانِ نزول کو شیعہ علماء کے علاوہ اہل سنت کے چھیاسٹھ (۶۶) محدثین و متکلمین نے الفاظ کے معمولی سے اختلاف کے ساتھ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ عظیم القدر محقق علامہ امینی نے اس کے تمام مصادر کو اپنی کتاب "الغدیر" میں نقل کیا ہے۔(۱)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت مسئلہ امامت کو کس طرح سے بیان کرتی ہے:

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "ولی" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے سرپرستی کرنے والا اور زمامِ امور سنبھالنے والا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت میں باپ کو اپنی اولاد کا اور حاکم کو اپنی رعایا کا ولی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اصول ہے "الاب ولی الطفل و الحاکم ولی القاصر" (باپ کمسن بچے کا ولی ہوتا ہے اور حاکم کمزور کا ولی ہوتا ہے)۔

اسی لفظ سے "ولی المومنین" کا جملہ ماخوذ ہے۔ لہٰذا آیت "ولیکم اللہ" سے حاکم مراد ہے

۱۔ الغدیر جلد ۳/۱۵۶ تا ۱۶۲

اور آیتِ مجیدہ کے قرائن اور اس کا شانِ نزول اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ''ولی'' سے امامت و سرپرستی مراد ہے۔

اس آیت کے قرائن ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ آیت ''ولیکم'' میں اگر لفظ ولی سے ولایت، دینی زعامت اور مقام سرپرستی مراد نہ ہوتا اور اس کی بجائے بقول اہل سنت ''ناصر اور محب'' مراد ہوتا تو پھر اس ولایت کو تین افراد میں مخصوص بھی نہ کیا جاتا کیونکہ تمام اہل ایمان ایک دوسرے کے محب و ناصر ہیں چنانچہ اس ولایت کو صرف تین شخصیات پر منحصر نہ کیا جاتا۔

۲۔ آیت کے ظاہری الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے سرپرست صرف یہی تین افراد ہیں۔ لہٰذا ولایتِ حکومت رکھنے والے اور ہیں اور ان کا محکوم گروہ علیحدہ ہے۔ اگر ہم ''ولی'' کو رہبر اور امورِ مسلمین کے سرپرست کے معنی میں لیتے ہیں تو حاکم ومحکوم گروہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اگر ہم ولی کے معنی دوست اور مددگار کے کریں تو پھر دونوں گروہ ایک ہی گروہ کے افراد قرار پاتے ہیں کیونکہ تمام افراد ایک دوسرے کے درست، محب اور مددگار و یاور ہیں۔

۳۔ اگر لفظ ''ولیکم'' کی آیت مجیدہ کے لفظ ''ولی'' سے صرف دوستی اور نصرت مراد ہوتی تو پھر صرف لفظ ''آمنوا'' ہی کافی تھا اور یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ''وہ نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ایماندار معاشرے میں رہائش پذیر مومن ایک دوسرے کے خیر خواہ اور مددگار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ رکوع کی حالت میں زکوۃ دیں یا نہ دیں اس آیت مجیدہ کا وہی مفہوم ہے جسے رسول خداؐ نے اپنی اور حدیث میں یوں بیان فرمایا:

''یَا عَلِیُّ اَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤمِنٍ مِنْ بَعْدِی'' (۱)

۱۔ مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۱۱، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۴۳۷

[اے علی! تو میرے اور ہر مومن کا ولی (سرپرست) ہے۔]

اس حدیث میں موجود لفظ ''بعدی'' یہ ظاہر کرتا ہے کہ ''ولی'' سے مقصود رہبری و حکومت اور دینی و دنیاوی امور میں مسلمانوں کی سرپرستی مراد ہے، اس سے محبت اور دوستی مراد نہیں ہے کیونکہ حضرت علیؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی اہل ایمان کے دوست اور مددگار تھے، اہل ایمان سے دوستی اور ان کی مدد کا جذبہ آنحضرتؐ کے بعد حضرت علیؑ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

۲۔ آیت ''اولی الامر''

حضرت علیؑ کی امامت و ولایت کے لئے صرف آیت ولایت ہی نازل نہیں ہوئی، آپ کی امامت کی گواہی ''اطاعت اولی الامر'' کی آیت سے بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

''یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج

(سورۂ النساء/۵۹)

(اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں صاحبانِ امر ہوں)

اس آیت میں ''اولی الامر'' سے ''فرمانروا'' مراد ہیں۔ اور یہ فرمانراؤں کا وہ گروہ ہے جن کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی مانند واجب ہے۔ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں کیا ہی خوب کہا ہے:

اس آیت کی رُو سے ''اولی الامر'' خدا اور رسول کے پہلو میں دکھائی دیتے ہیں۔ آیت کی ترتیب بتاتی ہے کہ اس منصب کے اہل وہ ہیں جو گناہ اور خطا سے معصوم ہوں۔

اولی الامر کے معصوم ہونے کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ انہیں خدا و رسول جیسی معصوم ذوات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لہٰذا انہیں بھی معصوم ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں اللہ نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم کسی قید اور شرط کے بغیر دیا ہے۔ اس غیر مشروط اطاعت کے حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے معصوم فرمانروا مراد ہیں اگر اس سے غیر معصوم

افراد مراد ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کی اطاعت کے حدود کو مقرر کرتا لیکن اللہ نے ان کے اطاعت کو غیر مشروط طور پر فرض کیا ہے۔ (۱)

چنانچہ قرآن حکیم کی یہ دو آیات (آیت ولایت اور آیت اولی الامر) مسئلہ امامت کو مکمل طور پر واضح کرتی ہیں۔ جبکہ قرآن مجید میں کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن کے ظاہری الفاظ سے اگرچہ مسئلہ امامت کی وضاحت نہیں ہوتی لیکن ان کی شان نزول سے یہ بات متعین ہوجاتی ہے کہ ان کا تعلق مسئلہ امامت سے ہے مثلاً ''اکمال دین'' کی آیت۔

۳۔ آیت اکمالِ دین

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" (سورۂ المائدہ/۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کی ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا ہے)۔

محدثین اور مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر غدیر خم میں حضرت علیؑ کی امامت و ولایت کا اعلان کیا تھا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مجیدہ نازل فرمائی (۲)

چنانچہ مذکورہ بالا تین آیات سے سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مسئلہ امامت و ولایت کو اچھی طرح سے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید نے اس اہم مسئلہ سے ہرگز بے توجہی نہیں کی ہے۔

۱۔ مفاتیح الغیب المعروف تفسیر رازی جلد ۱۰ / ۱۴۴

۲۔ درمنثور جلد ۲ ص ۲۹۸۔ فتح القدیر جلد ۲ ص ۵۷۔ ینابیع المودت ص ۱۲۰۔ تفسیر المنار جلد ۶ ص ۴۶۳۔ مزید حوالہ جات کے لئے علامہ امینی کی کتاب الغدیر جلد اول ص ۲۴۷۔ ۴۵۸ کا مطالعہ فرمائیں جہاں علامہ نے سولہ منابع کا تذکرہ کیا ہے۔

۲

قرآن کریم میں ائمہ کے نام

سوال: قرآن مجید میں بارہ ائمہ کے نام کیوں نہیں بیان کیے گئے؟

جواب: قرآن کریم کی روش یہ ہے کہ وہ صرف کلیات اور عمومی اصول کو بیان کرتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جزئیات و مصادیق کو بیان کیا تھا۔ آنحضرتؐ کا کام صرف تلاوت قرآن نہیں تھا آپ کو قرآن کے بیان اور توضیح کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا تھا جیسا کہ فرمان قدرت ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴿۴۴﴾

(سورۂ نحل/۴۴)

(ہم نے آپ کی طرف قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ آپ ان کے لئے ان احکام کو واضح کریں جو ان کی طرف نازل کیے گئے ہیں، شاید یہ غور وفکر کریں)۔

اس آیت مجیدہ پر غور کیجئے۔ اس آیت میں "لتبیین" کہا گیا ہے اور اس کی بجائے "لتقرأ" یا "لیتلوا" نہیں کہا گیا۔ یعنی نبی اکرمؐ کا کام احکام قرآن کو واضح کرنا ہے صرف آیات پڑھنا نہیں ہے آپ کا کام لوگوں تک صرف پیغام پہنچانا ہی نہیں تھا بلکہ احکام کی وضاحت بھی آپ کی ذمہ داری تھی۔ لہٰذا قرآن کریم سے یہ توقع کرنا کہ اس میں مصادیق اور جزئیات کی تفصیل بھی ہوگی تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم ملک کے آئین سے یہ توقع رکھیں کہ اس میں تمام قوانین کی

جزئیات بھی ہوں گی۔

ذیل میں ہم افراد کے تعارف کے چند نمونے قرآن حکیم سے نقل کرتے ہیں:

۱۔نام سے تعارف

کبھی حالات وواقعات متقاضی ہوتے ہیں کہ فرد کا نام بیان کیا جائے جیسا کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے اس قول کو نقل کیا ہے:

"وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" (سورۂ الصف/۶)

(میں ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام ''احمد'' ہوگا)۔

اس آیت میں حضرت مسیحؑ نے آنحضرتؐ کے اسمِ مبارک کو بیان کیا۔

۲۔تعداد سے تعارف

کبھی حالات وواقعات کا تقاضا ہوتا ہے کہ تعداد بیان کی جائے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

"وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا"

(سورۂ المائدہ/۱۲)

(اور جب اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے)۔

۳۔صفت سے تعارف

بعض اوقات حالات وواقعات کا تقاضا ہوتا ہے کہ موردِ نظر شخص کے اوصاف بیان کیے جائیں جیسا کہ تورات وانجیل میں آنحضرتؐ کے صفات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"الّذينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ الأُمّي الّذي يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِنْدَهُمْ فِي التَّوراةِ وَالإنْجيل يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّباتِ وَيُحَرِّمُ

عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ..."

جولوگ رسول نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جسے وہ اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ اشیاء کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان سے وہ بارگراں اور ان زنجیروں کو ہٹاتا ہے جو ان پر پڑی ہوئی تھیں)۔

مذکورہ بالا آیات پر توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم سے بارہ ائمہ اوران کے آباء کے نام کی توقع رکھنا سرے سے ہی عبث ہے۔ کیونکہ کبھی مصلحت نام لینے میں ہوتی ہے اور کبھی صفات بیان کرنے میں ہوتی ہے اور کبھی تعداد بیان کرنے میں ہوتی ہے۔

اگر ہم خواہ مخواہ کی ضد پر اتر آئیں اور یہ کہنا شروع کردیں کہ خدا نے تمام اختلافی مسائل کو قرآن میں بیان کیوں نہیں کیا، اگر وہ بیان کردیتا تو تفرقہ پیدا نہ ہوتا۔لیکن ایسا مطالبہ قرآن کی روش کے خلاف ہے اگر ایسا ہوتا تو خدا کو لاکھوں کلامی، فقہی، تشریعی، اور عقیدتی مسائل بیان کرنے پڑتے۔ جب کہ خدا نے ایسا نہیں کیا۔اسی طرح سے خدا نے ان مسائل پر بھی بحث نہیں کی جن کی وجہ سے مسلمانوں میں کئی صدیوں تک جنگ کا بازار گرم رہا۔ جیسا کہ قرآن نے یہ بیان نہیں کیا کہ

۱۔صفات خدا عین ذات ہیں یا زائد بر ذات ہیں؟

۲۔''استواء علی العرش'' کی واضح حقیقت کیا ہے؟

۳۔کلام خدا حادث ہے یا قدیم؟

۴۔جبر واختیار میں سے صحیح موقف کون سا ہے؟

یہ اور ان جیسے مسائل کا قرآن کریم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔قرآن کریم میں ان مسائل کے متعلق اشارات وکنایات موجود ہیں لیکن ایسی واضح آیات موجود نہیں ہیں جن سے ان

مسائل کے اختلافات کا قطعی اور حتمی فیصلہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے لوگوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے اور لوگوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آیات کے مفہوم پر توجہ کریں۔ اگر قرآن ہر ایک مسئلہ کو قطعی انداز میں بیان کرنا شروع کر دیتا کہ تمام لوگ راضی ہو جائیں تو یہ اس بنیاد کے خلاف ہوگا۔

نام لینے سے بھی اختلاف ختم نہیں ہوتا۔

سائل کا خیال یہ ہے کہ اگر قرآن کریم میں ائمہ ہدیٰ کا نام موجود ہوتا تو اختلاف کبھی نہ ہوتا۔ یقیناً ایسا سمجھنا سائل کی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ ہمیں ایسی مثال بھی ملتی ہے کہ نام کا اعلان ہوا تھا اس کے باوجود بھی اختلاف ختم نہیں ہوا تھا۔

بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ آپ خدا کی طرف سے ہم پر ایک شخص کو حاکم مقرر کریں تاکہ ہم اس کی سربراہی میں جہاد فی سبیل اللہ کریں، اپنی مقبوضہ زمین کو واپس لے سکیں اور اپنے قیدیوں کو آزادی دلا سکیں۔

"اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" (سورہ البقرہ ۲۴۶/)

(جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے بادشاہ مقرر کریں تاکہ ہم اس کی زیر قیادت اللہ کی راہ میں جنگ کریں)۔

چنانچہ اس وقت کے نبی نے اللہ کے حکم سے فرمانروا کے نام کا اعلان کیا اور کہا:

"اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا" (سورۂ البقرہ ۲۴۷/)

(اللہ نے تمہارے لئے "طالوت" کو حکمران مقرر کیا ہے)۔

آیئے دیکھیں کہ نبی نے تو اللہ کی طرف سے ایک شخص کی حکمرانی کا اعلان کر دیا تھا کیا اس کے بعد اختلاف ختم ہو گیا تھا؟ قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ اس کے باوجود بھی اختلاف ختم نہ ہوا۔ ان لوگوں نے الٹا طالوت پر اعتراض کیا اور یہ کہا:

"اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ط ..." (سورۃ البقرہ/۲۴۷)

(اسے ہم پر حکومت کیسے مل گئی جب کہ ہم حکومت کے لئے اس سے زیادہ اہل تھے اور وہ مال کے اعتبار سے بھی دولت مند نہیں ہے)

قرآن کریم کے بیان کردہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف دور کرنے کے لئے صرف نام بتادینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لئے معاشرہ کے حالات کا آمادہ ہونا ضروری ہے۔

عین ممکن تھا کہ اگر بارہ ائمہ کے نام ولدیت سمیت بیان کردیئے جاتے تو حکومت و اقتدار کے خواہش مند طالع آزما قسم کے لوگ اس سلسلہ کو روکنے کے لئے اس خاندان کی نسل کشی شروع کردیتے اور حالات وہی نہج اختیار کر لیتے جو فرعون نے پیدا کیے تھے اور حضرت موسیٰ کے لئے ہزاروں معصوم بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔

صد هزاران طفل سر ببریده شد
تا کلیم الله موسیٰ زنده شد

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مہدیؑ کے نسب اور خاندان کی طرف اشارہ کیا گیا تو اس سے کتنی زیادہ حساسیت وجود میں آ گئی تھی۔ اور ایک عرصہ تک حضرت امام حسن عسکریؑ کے گھر پر پہرے بٹھائے گئے تا کہ ان کی صلب سے کوئی بیٹا پیدا نہ ہونے پائے اور اگر پیدا بھی ہو جائے تو اسے فوراً قتل کردیا جائے۔

یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ قرآن کریم کو آئین کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن سے جزئیات کو تلاش کرنا بے محل ہے۔ نماز، روز اور زکوٰۃ اسلام کے اہم ترین واجبات میں شامل ہیں اور پورے قرآن میں ان کا حکم موجود ہے۔ لیکن ان کی جزئیات کی تفصیل قرآن کریم موجود نہیں ہے۔ بلکہ تفصیل کے لئے سنت نبوی سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

۳

امامت ونبوت کا فرق

سوال: امامت ونبوت میں کیا فرق ہے۔ اسی طرح سے امام ونبی میں کیا فرق ہے، شیعہ حضرات محمد مصطفیؐ کو اپنا نبی مانتے ہیں اور علیؑ اوران کی اولاد کو اپنا امام مانتے ہیں؟

جواب: ابن خلدون (المتوفیٰ ۸۰۸ ھ) ایک مشہور مورخ تھا، اس نے اپنے مقدمہ تاریخ میں سنی مکتب اور شیعہ مکتب کے مطابق امامت کی تشریح کی ہے اگرچہ اس نے نبوت کے مفہوم پر کچھ نہیں لکھا۔ ممکن ہے اس نے اس لئے نبوت کے مفہوم پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا ہو کہ نبی کے مفہوم پر دونوں متفق ہیں۔ اسی لئے اس نے نبوت کی بجائے امامت کے متعلق دونوں مکاتب فکر کی آرا پیش کی ہیں۔ جب کہ ہم مذکورہ بالا سوال کی تشریح کے لئے ''نبی'' کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

لفظ ''نبی'' لفظ ''نباء'' سے مشتق ہے۔ ''نباء'' کسی بڑی اور قابل توجہ خبر کو کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں نبی اس عظیم انسان کو کہا جاتا ہے جو غیب کی خبر دے یا غیب سے آگاہ ہو۔[1]

البتہ اس سے ہر غیبی خبر مراد نہیں ہے اس سے وہ خبر مراد ہے جس کا تعلق عقیدہ وشریعت کے تحت لوگوں کے فرائض سے ہو۔

---

[1]۔ نبی کی تعریف میں ہم نے لفظ ''یا'' اس لئے استعمال کیا ہے کہ اگر ''نبی'' ''متعدی'' ہو تو اس کا معنی خبر دینے والا اور غیب کی باتیں بتانے والا ہوتا ہے۔ اگر لفظ نبی ''لازم'' ہو تو اس کا معنی عالم غیب سے آگاہی رکھنے والا ہوتا ہے۔

انبیاء کی دو اقسام ہیں:

ا۔ایک گروہ وہ ہے جنہوں نے وحی الٰہی کے تحت شریعت کی اساس رکھی اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے حیات بخش قوانین لائے۔مثلاً شریعتِ نوحؑ وابراہیمؑ وموسیٰؑ و عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

۲۔دوسرا گروہ وہ ہے جنہیں خدا کی طرف سے پہلے سے موجود شریعت کی ترویج وتبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی مثلاً انبیائے بنی اسرائیل کہ وہ سب کے سب حضرت موسیٰ کی شریعت کی ترویج پر مامور تھے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی وحی تشریعی کا مخاطب ہوتا ہے خواہ وہ بصورت تاسیس ہو یا بصورت ترویج۔فرشتہ اس پر نازل ہوتا ہے اور وہ اس پر تشریعی اور دینی امور کی وحی لے آتا ہے۔اور نبی اس وحی کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔حضرت رحمۃ للعالمینؐ اس عظیم کڑی کا آخری حلقہ ہیں آپ کی آمد سے وحیِ تشریعی کا سلسلہ بند ہو گیا اور اب قیامت تک نہ تو دنیا میں نیا نبی آئے گا اور نہ ہی احکامِ اسلام کو بیان کرنے کے لئے کوئی نبی آئے گا۔

آیئے دیکھیں کہ امام کون ہوتا ہے؟

ابن خلدون لکھتا ہے کہ اہل سنت کی نظر میں امامت امور عامہ کا نام ہے جس کا معاملہ براہ راست امت سے ہے، امت جسے مقرر کردے وہ پیشوا بن جاتا ہے۔

شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق امامت دین کی اساس اور اسلام کا حصہ ہے اور پیغمبر کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ اس مسئلہ کو نظر انداز کر دے یا اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دے بلکہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ امام کو مقرر کرے۔امام کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ گناہانِ صغیرہ وکبیرہ سے معصوم ہو۔(۱)

۱۔مقدمہ ابن خلدون۔طبع مکتبہ تجارتی مصر ص ۱۹۲

ابن خلدون کے اس تجزیہ کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شیعوں کی نظر میں امام تمام وظائف پیغمبر کا حامل ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ اس پر وحیِ تشریعی نازل نہیں ہوتی اور اس سلسلے میں بھی اس پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر ''نبی'' وہ عظیم انسان ہے جس پر وحیِ الٰہی کا نزول ہو اور وہ وحی کی روشنی میں لوگوں کو دین کی تبلیغ کرے اور امام وہ معصوم فرد ہے جسے پیغمبر کی طرف سے دین کی نگہبانی اور امت کی رہبری کے لئے متعین کیا گیا ہو۔

الغرض پیغمبر دین کا مؤسس ہوتا ہے اور امام دین کا نگہبان اور پاسدار ہوتا ہے۔

وحی تشریعی نبی پر نازل ہوتی ہے۔ البتہ اس وحی تشریعی کے علاوہ امام کی بھی وہی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو نبی کی ہوتی ہیں اور ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ امام میں دو مؤثر شرائط موجود ہوں:

ا۔ اسلام کے اصول و فروع کو تمام افرادِ امت سے زیادہ بہتر طور پر جانتا ہوتا کہ وہ اسلام کے اصول و فروع کو بطریقِ احسن بیان کر سکے اور امت کی علمی اور معنوی رہنمائی کر سکے اور اسکی موجودگی کی وجہ سے امت کو کسی اور شخص کی احتیاج محسوس نہ ہو۔

۲۔ گناہوں سے بچنے کے لئے اس میں مادہ عصمت ہونا چاہیئے کیونکہ اگر وہ گناہوں سے پاک نہ ہوگا تو لوگ اس کی رفتار و گفتار پر اعتماد نہیں کریں گے۔ اور وہ لوگوں کے لئے عملی نمونہ نہ بن سکے گا۔ مقامِ عصمت کے بغیر وہ لوگوں کے دلوں میں گھر نہ کر سکے گا چنانچہ لوگوں کے اعتماد کے حصول اور لوگوں کے اذہان و افکار میں گھر کرنے کے لئے اس کا عمدی اور سہوی خطاؤں سے پاک ہونا نہایت ضروری ہے۔

شیعہ متکلمین نے ان دو شرائط کے ضروری ہونے کے متعلق تفصیلی بحثیں کی ہیں مزید آگاہی کے لئے علم الکلام کی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

۴

ائمہ کے علم و آ گا ہی کا سر چشمہ

سوال: شیعہ بالخصوص شیعہ امامیہ اپنے عقائد اور احکام کا کچھ حصہ قرآن اور سنتِ رسول سے لیتے ہیں لیکن زیادہ مواقع پر وہ اپنے ائمہ کی روایات پر انحصار کرتے ہیں۔ واضح کریں کہ ائمہ شیعہ کے علم و آ گا ہی کا سر چشمہ کیا ہے؟

جواب: اگر شیعہ زیادہ تر روایات اپنے ائمہ سے لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول خدا نے کتاب اللہ کے بعد انہیں دوسری حجت قرار دیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا:

"انی تارك فیکم الثّقلین کتاب اللہِ و عترتی" (۱)

(میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عترت)۔

لہٰذا وہ لوگ جو عقیدہ شریعت کو قرآن و عترت کے شفاف چشموں سے حاصل کرتے ہیں رسول خداؐ کے فرمان کے مطابق وہ گمراہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر امت اہل بیت کو چھوڑ کر اور لوگوں کی طرف رجوع کرتی ہے تو اس نے رسول مقبول کے حکم کی مخالفت کی ہے۔

اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ علوم اہل بیت کا منبع اور سر چشمہ کیا ہے؟ اس کے

۱۔ کنز العمال جلد اول ص ۱۶۵ حدیث ۹۴۵ طبع دوم۔ صواعق محرقہ ص ۱۴۸ طبع محمدی اور دیگر کتب

جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ائمہ شیعہ کے علمی منابع حسب ذیل ہیں:

الف: رسول خدا سے منقول

معصومین نے کچھ احادیث کو بلاواسطہ اور کچھ احادیث کو اپنے آبائے طاہرین کی وساطت سے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور وہ احادیث لوگوں تک پہنچائیں۔ روایات کی اس قسم میں ہر امام نے اپنے آبائے طاہرین کی وساطت سے رسول خداؐ سے روایات نقل کی ہیں اور شیعہ امامیہ کے ہاں اس طرح کی بکثرت روایات موجود ہیں۔ اگر ائمہ اہل بیت کی سند سے رسول خداؐ کی احادیث کو یکجا کر دیا جائے تو اس سے بہت بڑی مُسند تیار ہو سکتی ہے جو مسلمان محدثین وفقہاء کے لئے ایک عظیم خزانہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ائمہ ہدیٰ کی زبان سے منقول روایات کی حدیث کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہے بطور نمونہ اس نوع حدیث میں ایک حدیث کو محدثین ''سلسلۃ الذھب'' قرار دیتے ہیں اور آج تک وہ حدیث برکت کے لئے علم وادب پرور ''سامانیوں'' کے خزانہ میں محفوظ ہے۔ ہم ذیل میں اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شیخ بزرگوار صدوق (۳۸۱۔۳۰۶ھ) نے دو افراد کے واسطہ سے ابو الصلت ہروی سے نقل کیا، وہ کہتے ہیں کہ جب امام علی بن موسیٰ الرضاؑ شہر نیشاپور سے گزر رہے تھے تو اس وقت میں حضرت کے ساتھ تھا۔ اس وقت شہر نیشاپور کے بہت سے محدثین مثلاً محمد بن رافع، احمد بن حرب، یحییٰ بن یحییٰ، اسحاق بن راہویہ اور علم دوست افراد کی ایک کثیر جماعت نے آپ کی سواری کی باگ تھامی اور عرض کیا کہ ہم آپ کو آپ کے طاہر واطہر آباء کی قسم دے کر سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے والد کی بیان کردہ کوئی حدیث سنائیں۔

اس وقت آپ نے کجاوہ سے سر نکالا اور یوں ارشاد فرمایا:

" حدثنی ابی العبد الصالح موسیٰ بن جعفر علیہما السلام قال: حدثنی ابی الصادق جعفر بن محمد علیہما السلام قال حدثنی ابی ابو جعفر محمد بن علی باقر علم

الانبیاء علیہما السلام قال حدثنی ابی علی بن الحسین سید العابدین علیہما السلام قال حدثنی ابی سید شباب اھل الجنة الحسین علیہ السلام قال حدثنی ابی علی بن ابی طالب علیہما السلام سمعت النبی یقول: سمعت جبریل یقول سمعت اللہ جل جلالہ یقول:

لا الہ الا اللہ حِصنی فَمَنْ دَخَلَ حِصْنی اَمِنَ مِنْ عَذابی

(اپنے آبائے طاہرین کی سند سے حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول مقبولؐ سے سنا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں نے جبریلؑ سے سنا۔ جبریلؑ نے کہا میں نے اللہ سے سنا وہ کہتا ہے کہ "لا الہ الا اللہ" میرا قلعہ ہے جو میرے قلعہ میں داخل ہوا میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا، جیسے ہی سواری چلی تو آواز دے کر فرمایا "بشر وطھا و انا من شر وطھا"۔ (۱)
"لا الہ الا اللہ" کہنے کی کچھ شرائط ہیں اور میں بھی اس کی شرائط میں شامل ہوں)۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ کے علم و دانش کا ایک حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سینہ بہ سینہ ان کے پاس منتقل ہوا۔

ب۔ نقل از کتاب علیؑ

حضرت امیر المومنینؑ پیغمبر اکرمؐ کی بعثت کے تمام ایام میں آپ کے ساتھ رہے۔ اسی حسنِ صحبت کا یہ فیضان ہوا کہ آپ نے آنحضرت کی بہت سی احادیث کو ایک کتاب میں جمع کیا (در حقیقت حضرت رسول اکرمؐ لکھواتے تھے اور حضرت علیؑ لکھتے تھے) حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد یہ کتاب خاندانِ عصمت میں باقی رہی اور ائمہ اہل بیتؑ اس سے استفادہ کرتے تھے۔ احادیث اہل بیتؑ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی لمبائی ستر ہاتھ تھی، اسے رسول خداؐ نے لکھوایا اور یہ حضرت علیؑ کی تحریر میں ہے اس میں تمام وہ چیزیں موجود ہیں جن کی

۱۔ توحید شیخ صدوق باب اول۔ احادیث ۲۱، ۲۲، ۲۳

لوگوں کو ضرورت ہو سکتی ہے۔(۱)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب خاندانِ علیؑ میں ہاتھوں ہاتھ گردش کرتی رہی۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے متعدد بار اس کتاب کا حوالہ دے کر اس کتاب کے اقتباسات پیش کیے تھے اور اپنے دوستوں کو اس کتاب کا دیدار بھی کرایا تھا(۲)

بہت سی شیعہ کتابوں بالخصوص ''وسائل الشیعہ'' کے مختلف ابواب میں کتاب علیؑ کے حوالے سے بہت سی احادیث مرقوم ہیں۔

ج۔ کتاب وسنت سے استنباط

ائمہ علیہم السلام کتاب وسنت سے احکام کا استنباط کرتے تھے۔ اور انہیں استنباط کا وہ ملکہ حاصل تھا جو دوسروں کو حاصل نہ تھا۔ ہم یہاں ان کے استنباط کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کے استنباط کا انداز کتنا بلیغ تھا۔

متوکل عباسی کے دورِ حکومت میں ایک عیسائی نے ایک مسلم عورت سے زنا کیا اس نے اپنی بدکرداری کی وجہ سے ذمی ہونے کی شرائط سے تجاوز کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا خون رائیگاں اور اس کا قتل واجب ہو گیا تھا۔ جب عدالت نے اس کے قتل کا فیصلہ کرنا چاہا تو اس نے کلمہ اسلام پڑھ لیا۔ اور "الاسلام یجب ما قبلہ" (اسلام کی وجہ سے سابقہ گناہ مٹ جاتے ہیں) کے قانون سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ دربار میں موجود فقہاء میں اس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ فقہاء کے ایک گروہ کی یہ رائے تھی کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اس پر حد شرعی نافذ نہ ہو گی۔ ایک اور گروہ کا خیال تھا کہ اس پر حد شرعی نافذ کی جائے گی۔ ایک اور گروہ ان دونوں گروہوں کے علاوہ فتویٰ دیتا تھا۔ متوکل عباسی کو مجبور ہو کر امام علی نقیؑ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۱۸۔۶۶

۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۳ باب ۱۲ از ابواب لباس مصلی حدیث اول

امام علی نقیؑ نے فرمایا کہ وہ سزائے موت کا حقدار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے خوف اور مایوسی کے عالم میں اسلام قبول کیا اور اس طرح کے ایمان و اسلام کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

"فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾" (سورۃ مومن آیت ۴۷۔۴۸) (۱)

(جب انہوں نے ہمارے شدید عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ اب ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن معبودوں کو ہم خدا کا شریک بناتے تھے ان کا انکار کرتے ہیں لیکن ہمارے عذاب کو دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان لانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکا۔ یہ خدا کی وہ روش ہے جسے اس نے اپنے بندوں میں جاری کیا ہے اس وقت کافر خسارے میں رہیں گے)۔

اس آیت مجیدہ میں خداوند عالم نے عذاب کے خوف سے حاصل ہونے والے ایمان کو بے فائدہ قرار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ایسے ایمان کو خدا قبول نہیں کرتا اور یہ خدا کی وہ سنت ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے۔

دربار میں موجود تمام علماء و فقہاء اس آیت کو کئی بار پہلے بھی پڑھ چکے تھے لیکن ان کے ذہن میں اس سے استنباط کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یقیناً اس طرح کی گہری سوچ آل محمدؐ پر خدا کی خصوصی عنایت ہے اور ان کے علوم کا ایک پہلو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد باقرؑ فرمایا کرتے تھے کہ امت اسلامی کو جس بھی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اللہ نے اس چیز کو قرآن میں نازل کیا ہے اور اپنے رسول کے لئے بیان کیا ہے۔ (۲)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ باب ۳۶ من ابواب حد الزنا ص ۴۰۸

۲۔ اصول کافی جلد اول ص ۵۹ باب الرد الی الکتاب والسنۃ۔

"مَامِنْ شَیْءٍ اِلَّاوَفِیہِ کِتابٌ وَسُنَّۃٌ" (۱)

(ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا قانون کتاب وسنت پیغمبرؐ میں موجود نہ ہو)۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے دورِ امامت میں "سماعہ" ایک مشہور فقیہ تھے۔ سماعہ نے امامؑ سے کہا کہ آپ حضرات جو کچھ بھی کہتے ہیں کیا سب کی سب کتاب اللہ اور سنت رسول کے تحت کہتے ہیں یا اپنی طرف سے بھی کچھ کہتے ہیں؟

امام موسیٰ کاظمؑ نے جواب دیا:

"بَلْ کُلُّ شَیْءٍ فِی کِتابِ اللہِ وَسُنَّۃِ نَبِیِّہٖ" (۲)

ہم تمام باتیں کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت سے بیان کرتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام اپنی ہر بات کے لئے قرآن کریم سے ثبوت پیش کرتے تھے اور آپ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہارے سامنے جو بات کہوں تم مجھ سے یہ پوچھ لو کہ یہ بات قرآن میں کہاں ہے تاکہ میں تمہیں اس موضوع سے تعلق رکھنے والی آیت سے باخبر کرسکوں (۳)

ائمہ ہدیٰ معارف واحکام کے استنباط کے لئے نو وارد نہ تھے کہ ان کی گفتگو کی جڑیں قرآن وسنت میں نہ ہوتیں۔ وہ ہمیشہ قرآن وسنت سے استخراج کرتے تھے۔ جب کہ دوسروں کو یہ ملکہ حاصل نہیں تھا۔

د۔ خدائی الہامات

ائمہ اہل بیتؑ کے پاس علم ودانش کا ایک اور سرچشمہ بھی تھا اور اس منبع کو "الہام" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ "الہام" انبیاء سے مخصوص نہیں ہے۔ تاریخ میں ایسے عظیم افراد بھی

۱۔ اصول کافی جلد اول ص ۵۹ باب الرد الی الکتاب والسنۃ۔

۲۔ اصول کافی جلد اول ص ۵۹ باب الرد الی الکتاب والسنۃ۔

۳۔ احتجاج طبرسی ص ۱۷۶

گزرے ہیں جو کہ نبی نہیں تھے مگر وہ نعمتِ الہام سے مالا مال تھے۔قرآن مجید نے کچھ ایسے افراد کا تعارف کرایا ہے جو نبی نہ تھے لیکن ان پر اسرارِ جہانِ کا الہام ہوتا تھا۔قرآن کریم نے ایسے چند افراد کی نشاندہی کی ہے۔ایسے ہی افراد میں معلم موسیٰؑ (حضرت خضرؑ) بھی شامل تھے۔حضرت موسیٰ نے چند دنوں تک ان کی شاگردی اختیار کی تھی۔قرآن کریم نے ان کے متعلق یہ کلمات ارشاد فرمائے:

اٰتَیۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ﴿۶۵﴾ (سورۂ کہف/۶۵)

(ہم نے اپنی طرف سے اسے رحمت عطا کی تھی اور ہم نے اپنے خزانہ علم سے علم عطا کیا تھا)۔

حضرت سلیمانؑ کے ایک مصاحب (آصف بن برخیا) کے متعلق قرآن کریم نے یہ بیان کیا:

"قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ" (سورۂ نمل/۴۰)

(اس نے کہا جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا)

حضرت خضرؑ ہوں یا آصف بن برخیاؒ ہوں، ان لوگوں نے عام افراد سے علم حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ "علم لدنی" کے حامل تھے وہ "علمناہ من لدنا علما" کے مصداق تھے۔چنانچہ خدا کے خاص مقرب بندے نبی نہ ہونے کے باوجود الہام کے فیضان سے مالا مال ہوتے ہیں۔فریقین کی بیان کردہ احادیث میں ایسے افراد کو "مُحدَّث" کہا گیا ہے۔اور "محدث" اسے کہا جاتا ہے جو نبی نہ ہو لیکن فرشتے اس سے ہم کلام ہوتے ہوں۔

صحیح بخاری میں آنحضرتؐ سے منقول ہے۔آپؐ نے فرمایا:

"لَقَد کَانَ فِیمَن کَانَ قَبلَکُم مِنۡ بنی اِسرائیل یُکَلَّمونَ مِنۡ غیر ان یکونو

آنبیاءً (۱)

(تم سے قبل بنی اسرائیل میں ایسے لوگ موجود تھے جو نبی نہ تھے لیکن فرشتے ان سے کلام کرتے تھے)۔

ائمہ اہل بیت معارفِ الٰہی اور احکامِ دینی کی وضاحت کے لئے مرجعِ امت تھے۔ ایسے سوالات جن کے جوابات احادیث نبوی یا کتاب علیؑ میں موجود نہ ہوتے تھے انہیں ان کی تعلیم الہام کے ذریعے سے دی جاتی تھی۔(۲)

اس وضاحت سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ جو لوگ الہام کو وحی تشریعی کے مساوی قرار دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ صاحب الہام نبی ہوتا ہے، ایسے لوگ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ محدث ایسے ہی افراد کو کہا جاتا ہے جن سے ملائکہ خطاب کرتے ہیں لیکن وہ نبی نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مصاحب کو خدا نے "علم لَدُنّی" کا حامل قرار دیا ہے (وَعلّمناہُ من لدُنّا عِلماً) لیکن وہ نبی نہیں تھے۔

HASSAN ALI

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۴۹

۲۔ "محدث" اور اس کے حدود کے لئے ارشاد الساری شرح صحیح بخاری جلد ۶/ ۹۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۵

بارہ امام

سوال: ائمہ کے لئے بارہ کی تعداد پر ہی اصرار کیوں ہے۔ یہ تعداد کم و بیش کیوں نہیں ہو سکتی؟

جواب: شیعہ عقیدہ کے مطابق مسئلہ امامت امت کے سپرد نہیں کیا گیا۔ مسئلہ امامت کا تعلق خدا اور پیغمبرِ اکرمؐ کے اعلان سے ہے۔ جہاں تک بارہ کے عدد کا تعلق ہے تو اس کا فلسفہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔ اس کی مثالیں آسمانی شرائع میں بہت زیادہ موجود ہیں۔ ذیل میں ہم اس کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

ا۔ اولی العزم رسولوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوئی۔ اولی العزم ان رسولوں کو کہا جاتا ہے جو صاحبانِ شریعت ہوں اور دوسرے انبیاء ان کی شریعت کے مروّج ہوں۔ چنانچہ سورہ الشوریٰ کی تیرھویں آیت میں ان میں سے چار انبیاء کے نام لیے گئے ہیں اور اس کا پانچواں فرد وہ ہے جسے "اوحینا الیك" کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے یعنی اس مقدس سلسلہ کے پانچویں فرد جو حضرت حبیب خداؐ ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى" (سورۂ الشوریٰ آیت ۱۳)

(خدا نے تمہارے لئے وہی آئین مقرر کیا ہے جس کی نوحؑ کو وصیت کی تھی اور جس

کی وحی ہم نے آپ کو کی ہے اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی تھی)۔

(اب یہ سوال کرنا کہ اولی العزم رسولوں کی تعداد پانچ کیوں ہے اس سے کم یا زیادہ کیوں نہیں ہے؟ یقیناً اس طرح کا سوال غیر منطقی ہوگا۔ اسی طرح سے حدیث ابوذرؓ میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔ اب اس تعداد پر اعتراض کرنا کہ یہ تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کیوں ہے اس سے کم یا زیادہ کیوں نہیں ہے؟ یقیناً اس طرح کا سوال جہالت پر مبنی ہے۔ اسی طرح سے یہ سوال کرنا کہ ائمہ کی تعداد بارہ کیوں ہے اس سے کم یا زیادہ کیوں نہیں ہے؟ یہ سوال بھی سابقہ دو سوالوں کی طرح سے غیر منطقی ہے۔ اضافہ من المترجم)

۲۔ بنی اسرائیل کے بارہ نقیب تھے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

" وَلَقَدْ اَخَذَ اللهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ "

(سورۃ المائدہ/۱۲)

(اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان سے بارہ سرپرست مبعوث کیے)۔

کیا خدا سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ خدایا تو نے بارہ سردار ہی کیوں مقرر کیے اس سے کم یا زیادہ کیوں نہ مقرر کیے؟ یقیناً یہ سوال غلط ہے اسی طرح سے بارہ ائمہ کا سوال بھی غلط ہے۔ (اضافہ از مترجم)۔

۳۔ اہل سنت کی نظر میں خلفائے راشدین صرف چار ہیں۔ چار سے نہ کم ہیں نہ زیادہ ہیں۔

کیا پانچ اولی العزم رسولوں اور بارہ نقبائے بنی اسرائیل اور چار خلفائے راشدین کے اعداد کا فلسفہ واضح ہے؟

ائمہ کی تعداد بارہ ہی کیوں ہے اس سے کم و بیش کیوں نہیں ہے دراصل اس کی بنیاد حضرت رسول خداؐ کی ایک حدیث پر ہے۔

صحیح مسلم میں جابر بن سُبرہ سے منقول ہے کہ میں نے رسول خدا سے یہ کلمات سنے تھے:

"لَا یَزَالُ الِاسلامُ عَزِیزاً اِلٰی اثنیٰ عَشَرَ خلیفۃ"

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

لَا زَالَ ھٰذَا الدِّینُ عَزِیزاً مَنیعاً اِلٰی اِثنٰی عَشَرَ خَلیفَۃً کُلُّھُمْ مِنْ قُرَیْشٍ (۱)

ان دونوں احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ دین اسلام بارہ خلفاء کی رہبری کے زمانہ تک مضبوط و مستحکم رہے گا۔

اس مضمون کی روایات صحاح اور مسانید میں موجود ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد، (۲) ترمذی (۳) نے اپنی اپنی سنن میں اور احمد (۴) نے مسند میں اور حاکم (۵) نے مستدرک میں ان احادیث کو نقل کیا ہے۔

لہٰذا اگر شیعہ امامت کو بارہ معصومین میں محصور سمجھتے ہیں تو ان کی ایک دلیل بارہ خلفاء کی یہی حدیث ہے۔ البتہ ان خلفاء کی دوسری خصوصیات کے لئے دوسرے دلائل موجود ہیں جو اپنے مقام پر بیان کیے گئے ہیں۔

ولایت فقیہ کا مسئلہ غیبتِ امام سے مخصوص نہیں ہے۔ امام کی موجودگی میں بھی جامع الشرائط فقہاء منصب قضاوت پر فائز ہوتے ہیں اور لوگوں کے تنازعات نمٹاتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی جغرافیائی توسیع کی وجہ سے شیعہ براہ راست امام سے رابطہ نہیں کر سکتے فطری طور پر وہ کسی ایسے مستند مجتہد کی طرف رجوع کریں گے جو اسلام کو اچھی طرح سے جانتا ہو۔ اور ایسے علماء ہر دور میں ائمہ کے جانشین ہوتے ہیں خواہ وہ غیبت کا زمانہ ہو یا حضور وظہور کا زمانہ ہو۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۶ ص ۳۔۴۔

۲۔ سنن ابی داؤد کتاب مہدی ص ۲۰۷ طبع مصر

۳۔ سنن ترمذی جلد ۲ ص ۴۵ طبع سال ۱۳۴۲

۴۔ مسند احمد جلد ۵ ص ۸۶۔۱۰۶

۵۔ مستدرک حاکم، کتاب معرفۃ الصحابہ جلد ۳ ص ۶۱۷ طبع ہندوستان

۶

بارہ ائمہ کی امامت پر عقیدہ کا زمانہ

سوال: کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ عہدِ رسالت میں موجود تھا یا امام حسن عسکریؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوا؟

جواب: قریش یا بنی ہاشم سے تعلق رکھنے والے بارہ افراد کی خلافت کا عقیدہ عہدِ رسالت میں بالکل واضح تھا۔ البتہ ان کے ناموں اور حسب نسب سے آشنائی تدریجی طور پر عمل میں لائی گئی کہ ہر امام نے اپنے وصی اور بعد میں آنے والے امام کا تعارف کرایا۔ اور اس کی وضاحت کچھ یوں ہے:

دلائل قاطعہ سے ثابت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف مواقع پر بالعموم اور غدیر خم پر بالخصوص حضرت علیؑ کی امامت و رہبری کا اعلان کیا تھا اور یوں تشیع ایک اصل اعتقادی کے طور پر وجود میں آئی۔ اسی طرح سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں امام حسن مجتبیٰ اور امام حسینؑ کی امامت و رہبری کا بھی اعلان کر دیا تھا اور فرمایا تھا:

"اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"

(حسنؑ و حسینؑ دونوں امت کے پیشوا ہیں چاہے وہ زمام امور ظاہری طور پر ہاتھوں میں لے لیں یا خانہ نشین ہو جائیں)

حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور بنی امیہ کی رسوائی کے بعد امت کی نگاہیں آپ کے

فرزند امام سجادؑ پر پڑیں۔ انکے بعد امام محمد باقرؑ سنت نبوی کے احیا گر اور محدثین وفقہاء کے رہبر پھر امام جعفر صادق علیہ السلام پھر ترتیب وار ہر دور کے امام پر پڑتی رہیں۔ ائمہ ہدیٰ نے اعصاب شکن ماحول میں بھی حتی الامکان اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔ شیعہ ان کی امامت کا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ تصور کرنا کہ بارہ ائمہ کا عقیدہ امام حسن عسکریؑ کے دور میں پیدا ہوا تھا، یہ تاریخِ تشیع سے نا آگاہی کی علامت ہے۔ ہم پہلی فصل میں اس پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ شائقین کتاب ہذا کی پہلی فصل کی طرف رجوع کریں۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۷

ائمہ شیعہ اور مسندِ خلافت

سوال: یہ سچ ہے کہ جابر بن سمرہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ خلفاء کی حدیث روایت کی ہے۔ لیکن شیعوں کے بارہ امام اس کے مصداق نہیں ہیں کیونکہ وہ مسندِ خلافت پر کبھی فائز نہیں ہوئے تھے۔

جواب: انبیاء کا وظیفہ صرف یہی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کر دیں خواہ لوگ قبول کریں یا نہ کریں۔ حضرت موسیٰ ؑ نے اپنے بھائی ہارون ؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا:

" وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ (سورۃ الاعراف/ ۱۴۲)

(موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کرو اور مفسدین کی پیروی نہ کرو)۔

حضرت موسیٰ ؑ نے تو حضرت ہارون ؑ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا لیکن بنی اسرائیل نے ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا اور قریب تھا کہ انہیں قتل کر دیتے چنانچہ ہارون ؑ نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا تھا:

"اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَکَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ"(سورۂ الاعراف/۱۵۰)
(لوگوں نے مجھے کمزور بنا دیا تھا اور قریب تھا کہ قتل کر دیتے)۔

اگر خلافت کے جواز کی یہی شرط ہے کہ لوگ اسے قبول کریں تو پھر انبیاء و مرسلین کی رسالت پر بھی سوالیہ نشانات ڈالنے پڑیں گے۔ بہت سے انبیاء کے پیغام کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ (اگر لوگوں کے تسلیم نہ کرنے کے باوجود انبیاء کی نبوت قائم رہ سکتی ہے تو اقتدار نہ ملنے کے باوجود ائمہ ہدیٰ کی امامت بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اضافہ از مترجم)

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۸

بارہ ائمہ کی حدیث کی توثیق

سوال: کیا جابر بن سمرہ کی بیان کردہ بارہ ائمہ کی حدیث از روئے سند ضعیف نہیں ہے؟

جواب: بارہ خلفاء کی حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔ صحیحین کے علاوہ یہ حدیث سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم (۱) میں بھی منقول ہے۔ اہل سنت کے ہاں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ہر روایت صحیح ہے اور ان کی نظر میں مذکورہ دو کتابوں کی سند اور مضمون پر اعتراض کرنا غلط ہے۔

سنی علماء کا یہ نعرہ ہے "کل ما فی البخاری صحیح" صحیح بخاری میں موجود ہر روایت صحیح ہے۔

لہٰذا جابر بن سمرہ کی روایت کو ضعیف سمجھنے کا کسی کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ ابن حجر نے ''فتح الباری'' کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی ہے اور اس میں انہوں نے کہا ہے کہ صحیح بخاری کی تمام روایات معتبر ہیں۔ البتہ انہوں نے کچھ مناقشات لکھے ہیں اور پھر ان کا جواب بھی تحریر کیا ہے۔ (۲)

۱۔ بارہ خلفاء کی حدیث کے منابع کو پانچویں سوال کے جواب میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۲۔ ھدی الساری فتح البخاری ص ۱۱۔ واضح رہے کہ اس نام کی کتاب کو فتح الباری شرح صحیح بخاری کے مقدمہ کے طور پر ابن حجر نے لکھا تھا۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جابر بن سمرہ کی بیان کردہ روایت خبر واحد ہےاور عقائد کے لئے خبر واحد حجت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض تب صحیح ہوتا جب بارہ خلفاء کے لئے صرف جابر بن سمرہ کی ہی روایت ہوتی اور اس کے علاوہ کوئی اور روایت موجود نہ ہوتی۔ جب کہ دلائل امامت اتنے زیادہ ہیں جن سے ہر انصاف پسند شخص کو یقین پیدا ہوسکتا ہے۔

HASSAN ALI BOOK DEPOT

۹

بارہ افراد کی امامت اور عہد نامہ قدیم وعہد نامہ جدید

سوال: کیا بارہ ائمہ کی امامت کا عقیدہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے ماخوذ نہیں ہے؟

جواب: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے جب بارہ خلفاء کی حدیث بیان کی تھی تو آپ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے:

"یَملِکُ ھٰذِہِ الاُمَّۃُ اثنا عَشَرَ خَلِیفَۃً کَعَدَدِ نُقَبآءِ بَنِی اِسرائیل" (۱)

(اس امت کے زمام کار کو میرے بارہ جانشین سنبھالیں گے ان کی تعداد بنی اسرائیل کے نقباء کے برابر ہوگی)۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ امت کے امور کی زمام کتنے لوگ ہاتھ میں لیں گے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا: "اثنا عشر کعدة نقباء بنی اسرائیل" (۲)

رسول اکرمؐ نے ہی اپنے خلفاء کی تعداد بارہ بیان کی تھی۔ مقامِ افسوس ہے کہ انسان اپنے عقیدہ کے دفاع کے لئے اپنی علمی میراث کو خطاوار ٹھہرائے اور یہ کہے کہ بارہ ائمہ کا عقیدہ یہود

۱۔ منتخب کنز العمال، درحاشیہ مسند احمد جلد ۵ ص ۳۱۲

۲۔ تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۰

HAQANI ABOOK DEPOT

ونصاریٰ سے ماخوذ ہے۔ اگر یہی معیار صحیح ہے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ بخاری و مسلم نے بھی یہود و نصاریٰ سے احادیث حاصل کی تھیں۔

HASAN ALI BOOK DEPOT

۱۰

حضرت علیؑ کی وصایت

سوال: آپ حضرات حضرت علیؑ کو وصی رسولؐ کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب: حضرت علیؑ کی وصایت کے دو مراحل ہیں:

۱۔ مرحلہ تجہیز

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی مرض الموت کے آخری لمحات میں حضرت علیؑ کو وصیت کی تھی کہ تو مجھے غسل و کفن تمہیں دینا ہے اور میرے قرض کو بھی تمہیں ہی ادا کرنا ہے۔

چنانچہ امیر المومنینؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وصیت پر پورا عمل کیا تھا اور جب تک آپ ان مراحل سے فارغ نہ ہوئے اس وقت تک آپ نے کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔

وصایت کے اس مفہوم کو سبھی تسلیم کرتے ہیں اور کسی نے آج تک اس حقیقت سے انکار نہیں کیا(۱)۔

۲۔ آنحضرتؐ کی جانشینی

آنحضرتؐ نے امت کی رہبری اور سرپرستی کے لئے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اگر تعصب کی عینک اتار کر انصاف اور غیر جانبداری سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ بات

۱۔ تاریخ ابن عساکر شافعی جلد ۲ ص ۴۸۷ حدیث ۱۰۰۶۔ مستدرک حاکم جلد اول ص ۳۶۲۔ مسند احمد جلد اول ص ۲۶۰ طبع مصر

دکھائی دے گی کہ رسول اکرمؐ کی زندگی ہی میں حضرت علیؑ کی خلافت اور جانشینی کا مسئلہ واضح ہو چکا تھا اور حد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی میں ہی آپ کو ''وصی'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ لقب اس وقت بھی نظم ونثر میں بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا۔

آیت وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ (سورۂ شعراء آیت ۲۱۴) ''آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں) کی تفسیر میں محدثین ومفسرین نے لکھا کہ رسول اکرمؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع کیا اور انہیں دعوت اسلام دی۔ آپؐ نے فرمایا: اے فرزندانِ عبدالمطلب! میں تمہارے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی دعوت دوں۔

" فأيُّكم يُوازرني على امري هذا على ان يكونَ اخي ووصيّي وخليفتي فيكُم"

(تم میں سے کون ہے جو اس امر میں میری مدد کرے۔ وہ میرا وصی اور بھائی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہوگا)۔

کسی نے بھی آپ کی بات کا جواب نہ دیا۔ حضرت علیؑ سب سے کمسن تھے آپ نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس وقت رسولِ خدا نے فرمایا:

"إنَّ هذا اخي و وصيّي وخليفتي فيكُم فاسمَعو اله وأطيعوهُ"

(یقیناً یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہے اس کا فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو)۔

یہ حدیث ''حدیث یوم الدار'' کہلاتی ہے۔ بہت سے محدثین اور سیرت نگاروں نے اسے نقل کیا ہے۔(۱)

۱۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۳۱۹۔۳۲۱ طبع دار المعارف مصر۔ تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۶۲۔۶۳۔ منتخب کنز العمال در حاشیہ مسند احمد جلد ۵ ص ۴۱۔۴۲

وصایت امیرالمومنینؑ کے دلائل صرف اسی حدیث تک محدود نہیں ہیں بلکہ ''حدیث ثقلین''، ''اور حدیث سفینہ'' اور حدیث غدیر'' جیسی تمام احادیث آپ کی وصایت پر دلالت کرتی ہیں۔ اختصار کے مدنظر ہم انہیں نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے اہل بیت پیغمبر کے متعلق یہ جملے ارشاد فرمائے ''وفِيهِمُ الوَصِيَّةُ وَالوِرَاثَةُ''۔(۱) (یعنی پیغمبر اکرمؐ نے ان کے متعلق وصیت کی تھی اور وہ پیغمبر کے وارث ہیں)۔

عہد رسالت کے شعرا اور وصایت علیؑ کا ذکر

حضرت علیؑ کی وصایت عہد رسالت میں بھی مشہور تھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کی وصایت کا لوگوں میں اتنا چرچا تھا کہ عصر اول کے شعرا نے آپ کو وصی کے لقب سے یاد کیا تھا۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ عبداللہ بن ابی سفیان

وَصِيُّ النَّبِيِّ المُصْطَفىٰ وَابْنُ عَمِّهِ
فَمَنْ ذَايُدانِيهِ وَمَنْ يُقَارِبُهُ؟

(آپ نبی اکرمؐ کے وصی اور ان کے ابن عم ہیں، ایسا کون ہے جو ان کا مقابلہ کر سکے)؟

۲۔ عبدالرحمان جعیل

عَلِيًّا وَصِيُّ المُصْطَفىٰ وَابْنُ عَمِّهِ
وَاَوَّلُ مَنْ صَلّىٰ اَخَا الدِّينِ وَالتُّقىٰ

(علیؑ حضرت مصطفیٰؐ کے وصی اور ان کے ابن عم ہیں۔ وہ پہلے نماز گزار دیندار اور پرہیز گار ہیں)۔

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۔

۳۔ابن التیہان نے بدری صحابہ سے خطاب کر کے کہا:

اِنَّ الوَصیَ اِمامُنا وَ وَلِیُّنا

بَرِحَ الخِفَاءُ وَبَاحَتِ الأَسرارُ

(وصی ہی ہمارا امام اور ہمارا سرپرست ہے۔ جو کچھ مخفی تھا وہ کھل کر سامنے آ گیا اور راز طشت از بام ہو گئے)۔

ابن ابی الحدید نے اس سلسلے میں بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے کچھ اشعار عہد رسالت کے شاعروں کے ہیں اور کچھ اشعار تابعین کے ہیں۔ تمام شعراء نے آپ کو ''وصی'' کے لقب سے یاد کیا ہے (۱)۔

وصایتِ علیؑ کی تردید میں زیادہ سے زیادہ صرف ایک روایت پیش کی جا سکتی ہے جو کچھ یوں ہے کہ بی بی عائشہ سے لوگوں نے وصایت امام کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول خدا نے میرے حجرے میں وفات پائی تھی انہوں نے کسی کے بارے میں وصیت نہیں کی تھی (۲)

سوال یہ ہے کہ لوگوں نے بی بی عائشہ سے آخر یہ بات کیوں پوچھی تھی؟

اس کا جواب بھی واضح ہے کہ صدر اسلام میں حضرت علیؑ کا وصیِ رسولؐ ہونا انتہائی مشہور تھا اسی لئے تو لوگوں نے بی بی سے یہ بات کہی تھی۔ بی بی عائشہ کے جواب کو بنیاد بنا کر حضرت علیؑ کی وصایت کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ رسول خداؐ نے بی بی کے حجرے اور بی بی کے پہلو ہی میں وفات پائی تھی اور اس وقت آپ نے کسی کو وصیت نہیں کی تھی۔ تو کیا اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آپ نے اپنی صحت و عافیت کے ایام میں یا بیماری کے ابتدائی دنوں میں جب

۱۔شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد اول ص ۱۴۳۔۱۵۰ طبع مصر

۲۔صحیح بخاری جلد اول کتاب وصایا حدیث ۲۷۴۱

دوسرے گھروں میں تھے حضرت علیؑ کے بارے میں وصیت نہیں کی تھی؟

رسول خدا وصیت جیسے ضروری کام سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ آپ نے ہی لوگوں سے فرمایا تھا:

" مَاحَقُّ امرئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَئٌ يُوصى فِيهِ يَبيتُ لَيلَتَين اِلّاوَ وَصِيّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ"۔ (١)

(کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ اس کے پاس وصیت کے قابل کوئی چیز موجود اور وہ وصیت نہ کرے۔ ایسے مسلمان کو دو راتیں اس حالت میں نہیں بسر کرنی چاہئیں مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو)۔

جس ہستی نے تمام مسلمانوں کو وصیت کا حکم دیا تھا تو کیا خود انہوں نے وصیت نہیں کی تھی؟

HASSAN ALI BOOKS

۱۔ صحیح بخاری، کتاب وصایا حدیث ۲۷۳۸

۱۱

''اولی الامر'' سے کون لوگ مراد ہیں؟

سوال: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ'' (سورۂ النساء/۵۹) میں اولی الامر سے خاص افراد کیوں مراد لیے جاتے ہیں؟

جواب: ''اولی الامر'' سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق دو اقوال پائے جاتے ہیں

۱۔ اس سے سپاہ اسلام کے سالار مراد ہیں۔

۲۔ اس سے علماء و دانشور مراد ہیں۔

وہ گروہ جو لفظ ''الامر'' سے ''فرمان'' مراد لیتے ہیں وہ پہلے معنی پر اصرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ''فوجی سربراہ'' مراد ہیں جب کہ یہ تفسیر دو وجوہات کی بنا پر نا قابل قبول ہے۔

۱۔ لفظ ''الامر'' کے متعلق یہ احتمال موجود ہے کہ اس سے ''شان و منزلت'' مراد ہو اور اس صورت میں آیت کا مفہوم دوسری تفسیر سے سازگار ہو جاتا ہے۔

۲۔ مورد بحث آیت بعد کی آیت کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہے جس کے مطالب اور ترجمہ کو ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ اس کی شانِ نزول پہلی تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتی اس کی بجائے قول دوم کی تائید کرتی ہے۔

مفسرین نے آیت مجیدہ کے شانِ نزول کے متعلق لکھا ہے کہ ایک شخص جو کہ ظاہری طور پر مسلمان کہلاتا تھا اور اندرونی طور پر منافق تھا، اس کا ایک یہودی سے کسی بات پر اختلاف ہوا۔ یہودی نے کہا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ تمہارے نبی محمدؐ سے کراتے ہیں۔ یہودی نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ وہ جانتا تھا کہ محمد مصطفی رشوت نہیں لیں گے۔ منافق نے کہا: نہیں اس کا فیصلہ کعب بن اشرف یہودی سے کراتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منافق جانتا تھا کہ کعب بن اشرف رشوت لے کر اس کے حق میں فیصلہ دیدے گا۔(۱)

اس وقت آیت اولی الامر اور بعد کی آیت نازل ہوئی۔ ان دو آیات کا پورا متن حسب ذیل ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوٓا اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ وَاُولِی الاَمرِ مِنکُم فَاِن تَنَازَعتُم فِی شَیءٍ فَرُدُّوہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ اِن کُنتُم تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالیَومِ الآخِرِ ذٰلِکَ خَیرٌ وَّ اَحسَنُ تَاوِیلاً"

[اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو رسول کی اور جو تم میں صاحبانِ امر ہوں۔ اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ کام تمہارے لئے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت ہی اچھا ہے]۔

"اَلَم تَرَ اِلَی الَّذِینَ یَزعُمُونَ اَنَّھُم اٰمَنُوا بِمَآ اُنزِلَ اِلَیکَ وَمَآ اُنزِلَ مِن قَبلِکَ یُرِیدُونَ اَن یَّتَحَاکَمُوٓا اِلَی الطَّاغُوتِ وَقَد اُمِرُوٓا اَن یَّکفُرُوا بِہٖ وَیُرِیدُ الشَّیطٰنُ اَن یُّضِلَّھُم ضَلٰلاً بَعِیداً"

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ (ان آسمانی کتابوں پر) ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی اور جو آپ سے پہلے نازل ہوئیں (اس کے باوجود) وہ

۱۔ مجمع البیان جلد ۲ ص ۲۶۴

طاغوت اور حاکمان باطل سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں۔شیطان چاہتا ہے کہ انہیں انتہائی دور دراز کی گمراہی میں دھکیل دے]۔

ان آیات پر توجہ دینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولی الامر سے دوسرا مفہوم (یعنی علماءو دانش ور) متعین ہوتا ہے۔کیونکہ تنازعات کے فیصلے علمائے دین کیا کرتے ہیں فوجی سالار نہیں کیا کرتے۔اب سوال یہ ہے کہ جب اولی الامر سے علماء کا طبقہ مراد ہے تو کیا اس سے تمام علماء مراد ہیں یا وہ علماء مراد ہیں جن سے غلطی سرزنہیں ہوتی۔سوال کا جواب خود اسی آیت سے ہی مستنبط کیا جاسکتا ہے۔

ا۔لفظ ''اولی الامر'' کا عطف ''الرسول'' پر ہے ''اور عامل نصب دونوں کا ایک فعل ہے: اور وہ ہے "آطیعُوا الرسول واولی الامر منکم" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلوں کے لئے ''اولی الامر'' کا مقام ''رسول'' سے متصل ہے۔یعنی جس طرح سے رسول خدا فیصلہ میں غلطی نہیں کر سکتے اسی طرح سے ''اولی الامر'' بھی وہ ہیں جن سے فیصلہ میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس طرح سے ''اولی الامر'' سے وہ علماء مراد لیے جاسکتے ہیں جو گناہ اور خطا سے معصوم ہوں۔

۲۔اس آیت مجیدہ میں ''اولی الامر'' کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس اطاعت کو کسی طرح سے بھی مقید اور محدود نہیں کیا گیا۔مثلاً خدا نے یہ نہیں کہا کہ تم اس وقت تک اولی الامر کی اطاعت کرتے رہو جب تک وہ گناہ یا خلاف شرع بات کا تمہیں حکم نہ دیں اور تم اس وقت تک ان کی اطاعت کرو جب تک وہ کسی مغالطہ اور اشتباہ میں نہ پڑیں۔

اللہ نے اولی الامر کی اطاعت کا مطلق طور پر حکم دیا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں لگائی۔غیر مشروط اطاعت کے حکم سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا فیصلہ کبھی شریعت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہوگا۔اور وہ کبھی کسی مغالطہ میں مبتلا نہ ہوں گے۔اس سے اولی الامر کی ہر طرح کے گناہ اور خطا سے عصمت لازم آتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کی اطاعت کو مشروط کیا ہے اور فرمایا ہے:

"وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ" (سورۂ عنکبوت/۸)

(ہم نے انسان کو والدین سے نیکی کرنے کی سفارش کی ہے اور اگر وہ دونوں مشرک ہوں اور کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ انہیں شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے تو اس حالت میں ان کی اطاعت نہ کرنا)۔

والدین کی اطاعت مشروط اور مقید ہے جب کہ اولی الامر کی اطاعت کا غیر مشروط طور پر حکم دیا گیا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مخلوق جب خدا کی نافرمانی کا حکم دے تو ان کی اطاعت کرنا ناجائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ"۔(۱)

(خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے)۔

اس حدیث پاک کا مفہوم قرآن کریم میں بھی موجود ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے

"إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ" (سورۂ اعراف/۲۸)

(اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ "اولی الامر" کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے

۲۔ جب کوئی شخص شریعت کے حکم کے خلاف حکم دے تو اس وقت اس کی اطاعت خود بخود حرام ہو جاتی ہے۔

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۸ باب ۵۹ ابواب وجوب الحج حدیث ۷

مذکورہ بالا دو مطالب سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قرآن نے "اولی الامر" کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور "اولی الامر" وہ ہیں جو معصوم ہیں جنہوں نے پوری زندگی شریعت کے خلاف عمل نہیں کیا اور پوری زندگی میں ان سے خطا صادر نہیں ہوئی۔ اور اتنی معصومانہ زندگی اگر کسی کی ہے تو وہ صرف بارہ امام ہیں۔ تمام مسلمان متفق ہیں کہ ان حضرات کے علاوہ اور کوئی معصوم نہیں ہے۔

مضمونِ آیت کے علاوہ تیس سے زیادہ مسند و مرسل احادیث ایسی بھی موجود ہین جن میں "اولی الامر" سے بارہ ائمہ معصومین کو مراد لیا گیا ہے۔ (۱)

HASSAN ALI BOOK DEPO

۱۔ تفسیر البرہان جلد اول ص ۳۸۱۔۳۸۶

۱۲

حدیث غدیر میں لفظ مولیٰ کا معنی

سوال: حدیث غدیر میں ''من کنتُ مولاہ فعلیؑ مولاہ'' کے الفاظ وارد ہیں کیا لفظ ''مولا'' سے محب اور مددگار مراد نہیں ہے؟

شیعہ اسی حدیث سے رسول خداؐ کے بعد حضرت علیؑ کی امامت و خلافت کا استدلال کرتے ہیں اور ان کا استدلال تب صحیح ہوسکتا ہے جب ''مولیٰ'' ''اولیٰ یا ولی'' کے معانی میں ہو۔ جب کہ اس لفظ کے لئے احتمال یہ ہے کہ یہ محب اور ناصر کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔ گویا رسول خداؐ نے لوگوں سے یہ سفارش کی تھی کہ میرے بعد علیؑ کی مدد کریں اور ان سے دوستی رکھیں۔

جواب: حدیث میں موجود لفظ ''مولیٰ'' کے مفہوم کی وضاحت کے لئے دو نکات پر بحث کرنا پڑے گی:

الف۔ کیا عربی زبان میں لفظ ''مولیٰ'' بمعنی ''اولیٰ'' استعمال ہوتا ہے؟

ب۔ اگر بالفرض استعمال ہوتا ہے تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حدیث سے بھی یہ مطلب و معنی مراد ہے؟

الف: لفظ ''مولیٰ'' عربی زبان میں ''اولیٰ'' کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے روشن ترین ثبوت کے لئے ہم چند آیات پیش کرتے ہیں۔

"فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑮" (سورۂ حدید/۱۵)

(آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ کفار سے، تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے وہی تم سب کا صاحبِ اختیار ہے اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے)۔(۱)

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ ''مولیٰ'' ''اولیٰ'' کے معانی میں ہے کیونکہ ان لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ ہی ان کے زیادہ لائق ہے اور مناسب حال ہے(۲)

ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیں:

"يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬" (سورۂ حج)

(یہ ان کو پکارتے ہیں جن کا نقصان ان کے فائدے سے قریب تر ہے وہ ان کے بدترین سرپرست اور بدترین ساتھی ہیں)۔

اس آیت مجیدہ اور اس کے ماقبل کو پڑھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں لفظ ''مولیٰ'' ''ولی'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ بت پرست گروہ اپنے بتوں کو اپنا قرار دیتا تھا۔ اور انہیں اپنا سرپرست سمجھ کر ان سے خطاب کیا کرتا تھا۔

الغرض مذکورہ بالا دو آیات اور ان کے علاوہ کچھ اور آیات میں لفظ ''مولیٰ'' ''اولیٰ'' کا ایک معنی ''اولیٰ اور ولی'' بھی ہوتا ہے۔

اب ہم یہ واضح کریں گے کہ حدیث غدیر میں لفظ ''مولیٰ'' سے کیا مفہوم مراد ہے؟ اور

۱۔ علامہ ذیشان حیدر جوادی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب لکھا: دنیا میں مولا کو مولا تسلیم نہ کرنے کا انجام یہ ہوا کہ آخرت میں جہنم کو مولا تسلیم کرنا پڑا۔ اب وہی مددگار ہے اور سرپرست اور تصرف کرنے والا۔ (اضافہ من المترجم)

۲۔ مفسرین نے یہ جملہ لکھا ہے: "ای اولی لکم لما اسلفتم من الذنوب"

یہ واضح کریں گے کہ "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" کی حدیث میں اس سے "اولی بہ نفس" یا "اولی بہ الاطاعت" یا ولی وسرپرست مراد ہے جو کہ کسی شخص کی "ولایت مطلقہ" کو ثابت کرتا ہے یا پھر اس سے محب وناصر کا مفہوم مراد ہے۔

بہت سے قرائن یہ گواہی دیتے ہیں کہ "مولیٰ" سے اس کا پہلا معنیٰ مراد ہے جسے مولا" ولایت مطلقہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرانِ مجید میں اپنے حبیب کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ" (سورۂ الاحزاب/۶)

(نبی مومنین کی جان پر ان سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتا ہے)۔

جو شخص انسان کی جان پر ان سے زیادہ تصرف کا حق رکھتا ہو وہ اس کے مال پر بھی اس سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے۔ اس طرح کی "اولویت" ہی ولایت مطلقہ ہے جس کے ضمن میں امر ونہی کی اطاعت بھی شامل ہے۔

خدا نے اپنے نبی کو یہ منصب عطا کیا ہے۔ آپ ذاتی طور پر اس مقام کے حامل نہیں تھے خدا نے شرعی اور عقلی تقاضوں کے پیش نظر آپ کو اہل ایمان کے جان و مال پر مسلط کیا ہے اور آپ کو ہر طرح کے امر ونہی کے اختیارات عطا کیے اور آپ کے فرمان سے سرتابی کو حکم خداوندی سے سرتابی قرار دیا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث غدیر میں لفظ "مولیٰ" "اولیٰ" کے معانی میں ہے تو اس سے امیر المومنینؑ کو بھی وہی مقام حاصل ہوجائے گا جو کہ نصِ قرآن کے تحت آنحضرتؐ کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ پر نبوت کو تمام کیا ہے۔ لہٰذا حضرت علیؑ کو نبوت کے علاوہ باقی تمام اختیارات کا حامل ماننا پڑے گا۔ رسول خدا اپنے زمانہ میں امت کے رہبر و پیشوا تھے اور اہل ایمان کے جان و مال میں تصرف کا حق رکھتے تھے۔ اس بلند تر مقام کو لفظ امامت سے تعبیر

کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اسے ''ولایت الٰہیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (یعنی خدا کی طرف سے وسیع الاطراف ولایت) اب ہم وہ قرائن وشواہد پیش کرتے ہیں جس سے حدیث میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ثابت ہوتا ہے یا تمام معاملات میں صاحبِ ولایت ہونے کا اثبات ہوتا ہے۔

ا۔ جب غدیر خم میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کا بازو پکڑ کر من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کا اعلان کر چکے تو دربار رسالت کے شاعر حسانؓ بن ثابت اٹھے اور آنحضرتؐ سے کچھ اشعار پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرتؐ نے اجازت دی تو حضرت حسانؓ نے رسول اکرمؐ کے خطبہ کے مفہوم کو شعر کے قالب میں ڈھالا اور انہوں نے "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" کی حدیث کا منظوم ترجمہ یوں کیا:

فَقَالَ لَهُ: قُمْ یاعَلِیُّ فَاِنَّنی
رَضِیتُکَ مِنْ بَعْدِی اِمَاماً وَھَادِیاً

(رسول خداؐ نے ان سے کہا کہ علی! اٹھو، میں نے اپنے بعد تمہیں امام اور ہادی مقرر کیا ہے)۔

حضرت حسانؓ کا یہ شعر اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ انہوں نے لفظ ''مولیٰ'' سے امامت، پیشوائی اور امت کی رہبری و ہدایت ہی کو مراد لیا تھا (اگر بالفرض حضرت حسانؓ کو مفہوم سمجھنے میں مغالطہ ہوا تھا تو رسول خداؐ کا حق تھا کہ ان کی اصلاح کر دیتے اور فرماتے کہ میرے فرمان کا وہ مفہوم نہیں ہے جو تم نے بیان کیا ہے۔ حضرت حسانؓ کو نہ تو آنحضرتؐ نے ٹوکا تھا اور نہ ہی ہزاروں سامعین نے ٹوکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مفہوم حسانؓ نے بیان کیا تھا وہی صحیح مفہوم تھا۔ اضافہ از مترجم)

حضرت حسان کے علاوہ عرب دنیا کے چوٹی کے شعراء اور ادباء نے بھی لفظ مولا سے امام وہادی کے معانی بیان کیے ہیں۔ اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو عربی زبان کے استاد شمار کیے جاتے تھے۔ ان سب نے اسی لفظ سے وہی معنی مراد لیے ہیں جو حسان نے سمجھے تھے چنانچہ

موضوعِ امامت اور پیشوائی امت کے سوا کوئی اور چیز ان کی فکر تک نہیں پہنچی۔

۲۔ حضرت امیر المومنین نے معاویہ کو مخاطب کر کے کچھ اشعار ارشاد فرمائے تھے اور ان اشعار میں آپ نے واقعہ غدیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَوجَبَ لی ولایَتَهُ عَلَیکُم

رَسُولُ اللهِ یومَ غَدِیرِ خُمٍ (۱)

(رسول خداؐ نے غدیر خم کے دن تم لوگوں پر میری ولایت کو واجب قرار دیا تھا)۔

حضرت علیؑ سے بڑھ کر حدیث غدیر کے مفہوم کو اور کون سمجھ سکتا ہے باب مدینۃ العلوم نے اس حدیث کا یہی مفہوم بیان کیا کہ رسول خداؐ نے غدیر خم کے دن میری ولایت کو تم پر واجب کیا تھا۔ کیا یہ تفسیر وضاحت نہیں کرتی کہ اس لفظ سے سوائے زعامت اور معاشرہ کی رہبری کے واقعہ غدیر میں موجود تمام افراد کے اذہان میں اور کچھ مطلب نہیں آیا تھا؟

۳۔ الفاظ پیغمبر میں قرائن۔

رسول اکرمؐ کے خطبہ اور متن حدیث میں ایسے قرائن موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''مولیٰ'' اثباتِ زعامت اور جان و مال پر اولویت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کا پہلا قرینہ تو یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی حدیث میں فرمایا:

''اَلَستُ اَولیٰ بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ''

اس جملہ میں آنحضرتؐ نے ''اولیٰ بہ نفس'' کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں اور تمام حاضرین سے اپنے ''اولیٰ'' ہونے کا اقرار کرایا۔ جب تمام سامعین و حاضرین اقرار کر چکے کہ آپ ہمارے اولیٰ ہیں۔ اور آپ کو ہمارے جان و مال پر ہم سے بھی زیادہ حق تصرف حاصل ہے تو اس

۱۔ علامہ امینی نے گیارہ شیعہ شعراء اور چھبیس سنی شعراء کے اشعار نقل کیے ہیں اور اس شعر کو بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔
ملاحظہ فرمائیں: الغدیر جلد دوم: ص ۲۵۔ ۳۰

کے بعد آپ نے بلا فصل فرمایا:

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

آخر ان دو جملوں کو ملانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا اس کے سوا کوئی اور مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اولویت کا جو مقام و منصب مجھے حاصل ہے میرے بعد وہی مقام حضرت علیؑ کو حاصل ہے؟ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ میں جس پر بھی حق تصرف رکھتا ہوں میرے بعد علیؑ بھی اس پر حق تصرف رکھتا ہے۔(۱) اگر پیغمبر اکرم کا مفہوم کچھ اور ہوتا تو " من کنت مولاہ" سے قبل لوگوں سے اپنی اولویت کا اقرار نہ کراتے۔

اس مفہوم کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ رسول خداؐ نے آغاز گفتگو میں لوگوں سے تین اسلامی عقائد کا اقرار کرایا تھا اور فرمایا تھا:

" اَلَسْتُمْ تَشْهَدُونَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَاَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَالنَّارَ حَقٌّ"

(کیا تم توحید و رسالت کی گواہی نہیں دیتے اور جنت و دوزخ کے حق ہونے کی گواہی نہیں دیتے)؟

اس اقرار کرانے کا آخر کیا مقصد تھا؟ کیا اس کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ لوگوں کے اذہان کو قریب تر کیا جائے تاکہ وہ علیؑ کے مقام و منصب کے اقرار کے لئے آمادہ ہوجائیں اور انہیں یقین ہوجائے کہ جس طرح سے خدا کی توحید اور نبی اکرمؐ کی نبوت اور جنت و نار کا عقیدہ اسلام کا حصہ ہے اسی طرح سے حضرت علیؑ کی ولایت بھی اسلام کا حصہ ہے؟ اور اگر اس کے برعکس ''مولیٰ'' کے لفظ سے دوست اور مددگار کا مفہوم مراد ہوتا تو آنحضرتؐ کو اقرار کرانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور ایسا کرنے کی صورت میں کلام کا باہمی ارتباط منقطع ہوجاتا اور کلام حدِ بلاغت سے نیچے آجاتا۔ لہٰذا اس سے دوست اور مددگار کا معنی لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ:

۱۔ علامہ امینی نے " الست اولیٰ بکم من انفسکم " کے جملہ کو چونسٹھ محدثین اور اسلامی مورخین سے نقل کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے الغدیر جلد اول کے صفحہ ۳۷۱ اور اس کے بعد کے صفحات کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۔ حضرت علیؑ مقامِ ولایت کے علاوہ بھی اعلیٰ درجہ کے مسلمان تھے اور آپ اس اعلان سے پہلے بھی اہل ایمان کے دوست اور مددگار تھے۔ لہٰذا اتنی سی بات کہنے کے لئے آنحضرتؐ کو اتنا بڑا اجتماع منعقد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

۲۔ دوستی اور مددگاری کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اسے دین کے تین اصولوں کے ساتھ شامل کیا جائے۔

۳۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے خطاب کے آغاز میں اپنی رحلت کی خبر دی تھی اور آپ نے فرمایا:

"انّی اوشکُ اَن اُدعیٰ فاَجیب"۔ (۱)

(مجھے حضرتِ حق کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے اور میں لبیک کہوں گا)۔

آنحضرتؐ کا یہ جملہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ آپ دنیا سے رختِ سفر باندھنے والے ہیں اور آپ اپنی موت کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے خواہش مند ہیں۔ آپؐ کی موت سے پیدا ہونے والا خلا ایک ایسے رہبر کا تعین ہی رحلت کے بعد نظام امور کو سنبھال سکتا ہے نہ کہ مودّت اور دوستی اور یا نصرت اور اس کی مدد۔

۴۔ جب رسول اکرمؐ نے "من کنت مولاہ کے بعد فرمایا:

"اللهُ اَكْبَرُ عَلىٰ اِكْمالِ الدِّينِ وَ اِتْمَامِ النِّعْمَةِ وَرِضَى الرَّبِّ بِرسالَتی وَالْوِلايَةُ لِعَلِيٍّ مِنْ بَعْدِی"۔ (۲)

(دین کی تکمیل، نعمت کے اتمام اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر راضی ہونے کی وجہ سے میں خدا کی بڑائی بیان کرتا ہوں)

فرض کریں کہ "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" کا مفہوم اگر یہی تھا کہ علی تمہارا

۱۔ الغدیر جلد اول صفحات ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۴۷، ۱۷۶ کی طرف رجوع فرمائیں

۲۔ علامہ امینی نے اس حدیث کے منابع کو الغدیر جلد اول کے صفحات ۴۳، ۱۶۵، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳ اور ۲۳۵ پر نقل کیا ہے۔

دوست ہے تو یہ اتنی بڑی بات تو نہ تھی کہ اللہ خوش ہو کر اپنے دین کو مکمل کر دیتا اور اپنی نعمت کی تکمیل کر دیتا؟

حضرت رسول خداؐ نے تو واضح کر دیا " **والولایة لعلی من بعدی** " کہ خدا میری رسالت اور میرے بعد علی کی ولایت پر راضی ہوا ہے۔

۵۔ ولایت علیؑ کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جب رسول خداؐ خطبہ غدیر سے فارغ ہوئے تو اس وقت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور باقی صحابہ کرام نے حضرت علیؑ کو مبارک دی تھی اور مبارک بادی کا یہ سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہا تھا اور شیخین مبارک دینے میں سب سے پیش پیش تھے اور انہوں نے ان الفاظ سے حضرت علیؑ کو مبارک باد دی تھی:

هَنِيئاً لَكَ يَابنَ اَبِي طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَيْتَ مَولَايَ وَمَولىٰ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ" (۱)

فرزند ابوطالب! تمہیں مبارک کہ تم میرے اور ہر مومن مرد عورت کے مولا بن گئے۔

علیؑ کو اس روز ایسا کون سا مقام حاصل ہوا تھا کہ اس مبارک باد کے مستحق ٹھہرے؟ کیا مقامِ زعامت اور امت کی رہبری کے علاوہ جس کا رسمی اعلان اس سے پہلے نہیں ہوا تھا کوئی اور بات تہنیت کا سبب ہو سکتی ہے؟

۶۔ اگر آنحضرتؐ کو صرف یہی بتانا مقصود ہوتا کہ علیؑ تمہارا دوست اور مددگار ہے تو پھر سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں آنحضرتؐ ہزاروں افراد کے قافلہ کو گرم ریت اور جلتے ہوئے پتھروں پر بٹھا کر ایک بیابان میں خطاب نہ کرتے۔ کیونکہ اس اعلان سے پہلے اللہ کی طرف قرآن کریم میں یہ اعلان ہو چکا تھا:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (سورۂ الحجرات/۱۰)

(تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔)

۱۔ شیخین کی تہنیت کے لئے الغدیر جلد اول کے صفحات ۲۷۰۔۲۸۳ کا مطالعہ فرمائیں۔

کیا اس سے قبل قرآن مجید یہ واضح نہیں کر چکا تھا کہ اہل ایمان ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست ہیں۔ حضرت علیؑ بھی اسی اہل ایمان معاشرے کے ایک فرد تھے۔ اس کے لئے رسول خدا کو اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس قسم کی بچکانہ کم فہمیاں جن کی بنیاد یہ تھی کہ حدیث کا مقصد علیؑ کی دوستی اور نفرت تھی اور مولیٰ، محب اور مددگار کے معنی میں ہے، حدیث کے مفہوم کو بگاڑنے کی کوشش تھی جو علیؑ کے خلاف شدید تعصب (اور بغض) کی بناء تھی۔ حالانکہ ذکر شدہ قرائن اور دیگر شواہد کی بناء پر جو رسول اللہؐ کے خطبہ پر غور وفکر کرنے سے سامنے آتے ہیں مولیٰ کے معنی اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ وہ ولی، اولیٰ اور انسانوں پر اولیٰ بالتصرف ہے۔

HASSAN ALI BOOK LIB

۱۳

چھ رکنی شوریٰ میں شمولیت

سوال: حضرت علیؑ نے حضرت عمر کی مقرر کردہ چھ رکنی شوریٰ میں شرکت کی تھی۔ کیا آپ کی شرکت سے یہ بات واضح نہیں ہوجاتی کہ آپ امامت کے لئے شورائی نظام کو قبول کرتے تھے؟

جواب: اس سوال کے جواب سے پہلے ہم شوریٰ کا جائزہ لیتے ہیں:

جب حضرت عمر زخمی ہوئے اور ان کے زندہ رہنے کی امیدیں منقطع ہوگئیں تو ہر طرف سے یہ مطالبہ ہونے لگا کہ آپ کسی کو اپنا جانشین مقرر کریں۔ بی بی عائشہ نے عبداللہ بن عمر کے ذریعہ سے انہیں پیغام بھیجا کہ امت محمد کو چرواہے کے بغیر چھوڑ کر نہ جائیں جتنا جلدی ممکن ہو کسی کو اپنا جانشین مقرر کریں۔ اگر آپ نے اپنا جانشین مقرر نہ کیا تو فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔(۱)

خلیفہ نے حکم دیا کہ ان چھ افراد کو میرے پاس لایا جائے جن سے رسول خدا موت کے وقت راضی تھے۔ اس سے ان کی مراد حسب ذیل چھ افراد تھے:

۱۔ حضرت علی ۲۔ حضرت عثمان ۳۔ طلحہ ۴۔ زبیر

۵۔ سعد بن ابی وقاص ۶۔ عبدالرحمن بن عوف

اس شوریٰ کے عناصر کی ترکیب ہی کچھ ایسی تھی کہ حضرت علیؑ خلیفہ نہیں بن سکتے تھے

۱۔ الامامة والسیاسة، ابن قتیبہ جلد اول ص ۳۲

کیونکہ ارکانِ شوریٰ میں زبیر کے علاوہ باقی افراد حضرت علیؑ کے مخالف تھے۔

جیسے ہی اس کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا تو طلحہ نے حضرت عثمان کی تائید کی۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ علی وعثمان کی موجودگی میں اس کا انتخاب ناممکن ہے اسی لئے اس نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ علیؑ کی مخالفت میں عثمان کی تائید کرے اور علی کے منتخب ہونے کے مواقع کو کم سے کم کردے۔

طلحہ کو حضرت علیؑ سے اس لئے دشمنی تھی کہ اس کا تعلق بنی تیم سے تھا اور حضرت ابوبکر بھی اسی قبیلہ کے فرد تھے۔ حضرت ابوبکر کے حصول اقتدار کی وجہ سے بنی تیم اور بنی ہاشم کے تعلقات میں کھنچاؤ آ گیا تھا جو کہ بدستور قائم رہا۔

زبیر حضرت علیؑ کی پھوپھی (صفیہ بنت عبدالمطلب) کا بیٹا تھا۔ اس نے آپ سے رشتہ داری کا لحاظ رکھا اور اس نے حضرت علیؑ کی تائید کی۔

سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمن بن عوف کی تائید کی۔ اور اس حمایت کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ دونوں افراد کا تعلق ''زہرہ'' قبیلہ سے تھا۔

یوں تین افراد ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے اور ہر ایک امیدوار کو ایک ایک مؤید کی تائید حاصل تھی اور کامیابی اس امیدوار کو حاصل ہونی تھی جس کی تائید ان تینوں میں سے ایک کردے۔

اس وقت عبدالرحمن نے حضرت علی اور حضرت عثمان کی طرف رخ کر کے کہا کہ تم میں سے ایک فرد دوسرے کو اپنا ووٹ دے کر خود خلافت سے علیحدہ ہو جائے۔ اس پر حضرت علیؑ اور حضرت عثمان دونوں خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت عبدالرحمن نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنے آپ کو خلافت سے باہر نکالتا ہوں اور تم دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہوں۔

پھر اس نے حضرت علیؑ سے کہا کہ میں آپ کی اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتاب اللہ پر عمل کریں گے، سنتِ رسولؐ پر عمل کریں گے اور سیرت شیخین پر عمل کریں گے۔

حضرت علیؑ نے پہلی دو شرائط کو قبول کیا یعنی کتاب وسنت کو قبول کیا اور سیرتِ شیخین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں تیری بیعت اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر عمل کروں گا اور اپنے علم واجتہاد پر عمل کروں گا۔

جب عبدالرحمن کو حضرت علیؑ نے یہ ٹکا سا جواب دیا تو اس نے یہی تینوں شرائط حضرت عثمان کے سامنے پیش کیں۔ انہوں نے تینوں شرائط فوراً قبول کرلیں۔ اس وقت عبدالرحمن نے عثمان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اسے امیر المومنین کہہ کر اس کی بیعت کی۔ پھر اس نے باہر آ کر لوگوں کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔

حضرت علیؑ کے لئے شوریٰ کا یہ فیصلہ غیر متوقع نہیں تھا آپ کو پہلے سے ہی اس کا علم تھا۔ حد یہ ہے کہ جب ابن عباس نے ارکانِ شوریٰ کے نام سنے تھے تو انہوں نے اسی وقت ہی کہہ دیا تھا کہ اب تیسری بار بھی علیؑ کو خلافت سے محروم رکھا جائے گا۔

جب عبدالرحمن نے عثمان کی بیعت کی تو حضرت علیؑ نے اس سے فرمایا:

تو نے اسے اس لئے منتخب کیا ہے کہ تو چاہتا ہے کہ عثمان اپنی زندگی کے آخری ایام میں خلافت تیرے سپرد کر دے گا جیسا کہ ابوبکر نے خلافت عمر کے سپرد کی تھی۔ جب کہ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا تمہارے درمیان تفریق پیدا کر دے گا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کا فرمان پورا ہوا، ابھی خلافت عثمان کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی اور انہوں نے ایک دوسرے سے کلام کرنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ عبدالرحمن کی وفات ہوگئی۔ (۱)

اب ہم اصل سوال کا جواب دیتے ہیں:

۱۔ اس سلسلہ کی پہلی گذارش تو یہ ہے کہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت علیؑ شوریٰ کے

---

[1] ۔ یہ تمام مطالب ہم نے شرح ابن ابی الحدید (جلد اول ص ۱۸۸۔۱۸۵) سے بطور خلاصہ نقل کیے ہیں۔

اجلاس میں اپنی خوشی سے آئے تھے یا آپ کو مجبور ہو کر آنا پڑا تھا۔ کیونکہ خلیفہ دوم نے ارکان شوریٰ کو جو دھمکیاں دی تھیں وہ بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر نے ارکان شوریٰ کو اپنے پاس طلب کیا اور ان کے سامنے خلافت کا مسئلہ رکھا پھر انہوں نے محمد بن مسلمہ کی طرف منہ کر کے کہا:

"جب میرے جنازہ کو دفن کر لو تو پھر ان چھ افراد کو بلا لینا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا دینا تم پچاس مسلح افراد لے کر دروازے پر کھڑے ہونا اور اس وقت تک کھڑے رہنا جب تک وہ کسی ایک کو منتخب نہ کر لیں۔ اگر پانچ افراد کسی ایک پر متفق ہو جائیں اور ایک مخالفت کرے تو اس مخالفت کرنے والے کو قتل کر دینا۔ اگر چار ایک پر متفق ہوں اور دو مخالفت کریں تو پھر ان دونوں کو قتل کر دینا اور اگر یہ چھ افراد تین تین کی شکل میں تقسیم ہو جائیں تو پھر خلیفہ وہ ہوگا جس کی تائید عبدالرحمن کرے گا۔

اختلاف کرنے والے تین ارکان کو کہنا کہ وہ عبدالرحمن کے پسندیدہ امیدوار کو تسلیم کر لیں اور اگر وہ تسلیم نہ کریں تو انہیں بے دریغ قتل کر دینا۔ اور اگر تین دنوں تک ارکان شوریٰ کسی نتیجہ پر نہ پہنچیں تو چھ کے چھ کو قتل کر دینا اور مسلمانوں کو نئے خلیفہ کے انتخاب کی آزادی دے دینا"۔

چنانچہ جب لوگ حضرت عمر کی تدفین سے فارغ ہوئے تو محمد بن مسلمہ نے پچاس مسلح افراد کو ساتھ لیا اور ارکانِ شوریٰ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور انہیں خلیفہ دوم کے فرمان سے آگاہ کیا۔

جب جبر و استبداد کی یہ کیفیت ہو تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان اعصاب شکن حالات میں حضرت علیؑ نے برضا و رغبت شرکت کی ہو گی؟

خطبہ شقشقیہ میں حضرت علیؑ نے شوریٰ کی ہیئت پر تنقید کی تھی۔ آپؑ نے فرمایا

حَتّٰی اِذَا مَضٰی لِسَبِیْلِهٖ جَعَلَهَا فِیْ جَمَاعَةٍ زَعَمَ اَنِّیْ اَحَدُهُمْ فَیَا لَلّٰهِ

وَلِلشُّورىٰ! مَتَى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِيَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْهُمْ حَتّٰى صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰى هٰذِهِ النَّظَائِرِ، لٰكِنِّي اَسْفَفْتُ اِذْا اَسَفُّوا وَطِرْتُ اِذْطَارُوا فَصَغیٰ رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِهِ وَمَالَ الْاٰخَرُ لِصِهْرِهِ مَعَ هَنٍ وَهَنٍ"

[یہاں تک کہ دوسرا بھی اپنی راہ لگا اور وہ خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا فرد خیال کیا۔ اے اللہ مجھے اس شوریٰ سے کیا لگاؤ؟ ان میں کے سب سے پہلے کے مقابلہ ہی میں میرے استحقاق و فضیلت میں کیا شک تھا جو اَب ان لوگوں میں بھی شامل کرلیا گیا مگر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ زمین کے نزدیک ہو کر پرواز کرنے لگیں تو میں بھی ایسا ہی کرنے لگوں اور جب وہ اونچے ہو کر اڑنے لگیں تو میں بھی اسی طرح پرواز کروں (یعنی حتی الامکان کسی نہ کسی صورت بناہ کرتا رہوں)۔ ان میں سے ایک شخص تو کینہ وعناد کی وجہ سے مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی اور بعض ناگفتہ بہ باتوں کی وجہ سے ادھر جھک گیا۔]

اسلامی مصلحتوں کی وجہ سے خلفا سے تعاون کی پالیسی

حضرت علیؑ باوجود اسکے کہ اپنے آپ کو شرعی اور قانونی خلیفہ سمجھتے تھے اور آپ یہ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں نے میرے حق کو غصب کیا ہے اور اسے لوٹا ہے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ خلفاء کی خلافت اچھی طرح سے مستحکم ہوگئی ہے تو آپ نے اسلام کے فائدے کے مدنظر ان سے تعاون کی پالیسی کو اپنایا۔ اسی لئے خلفاء اپنے اہم معاملات میں آپ سے مشورے کرتے تھے اور آپ انہیں مخلصانہ مشورے دیتے تھے۔(۱)

یہود ونصاریٰ کے علمی وفود مدینہ آتے تھے اور وہ اسلام کے پیغام کو سمجھنا چاہتے تھے۔ حضرت علیؑ ہی دنیائے اسلام کی وہ واحد شخصیت تھے جو ان کے مشکل سوالات کے جواب دینے کے قابل تھے۔

۱۔ نہج البلاغہ: خطبہ ۱۴۶

آنجنابؑ نے محسوس کیا کہ جزیرۃ العرب میں الحاد وارتداد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اگر آپ ان حالات میں تعاون کی پالیسی نہ اپناتے تو اس سے خلفا کا کچھ بگڑتا یا نہ بگڑتا اسلام ختم ہو جاتا۔ چنانچہ امیر المومنین نے اپنے ایک مکتوب میں اسی چیز کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"حَتّٰی رَأَیْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْاِسْلَامِ، یَدْعُوْنَ اِلٰی مَحْقِ دِیْنِ مُحَمَّدٍ فَخَشِیْتُ اِنْ لَمْ اَنْصُرِ الْاِسْلَامَ وَاَهْلَهٗ اَنْ اَرٰی فِیْهِ ثَلْماً اَوْ هَدْماً، تَکُوْنُ الْمُصِیْبَةُ بِهٖ عَلَیَّ اَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَایَتِکُمُ الَّتِیْ اِنَّمَا هِیَ مَتَاعُ اَیَّامٍ قَلَائِلَ، یَزُوْلُ مِنْهَا مَا کَانَ کَمَا یَزُوْلُ السَّرَابُ، اَوْ کَمَا یَتَقَشَّعُ السَّحَابُ فَنَهَضْتُ فِیْ تِلْكَ الْاَحْدَاثِ حَتّٰی زَاحَ الْبَاطِلُ وَزَهَقَ" (۱)

(''یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہو کر محمدؐ کے دین کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب میں ڈرا کہ اگر کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور مسلمان کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لئے اس سے بڑھ کر مصیبت ہوگی جتنی یہ مصیبت کہ تمہاری یہ حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے جو کہ تھوڑے دنوں کا اثاثہ ہے۔ اس کی ہر چیز زائل ہو جائے گی اس طرح جیسے سراب بے حقیقت ثابت ہوتا ہے یا جس طرح بدلی چھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ میں ان بدعتوں کے ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہو گیا اور دین محفوظ ہو کر تباہی سے بچ گیا'')۔

چنانچہ چھ رکنی شوریٰ میں آپ کی شرکت شورائی نظام کو قبول کرنے کی بنا پر نہیں تھی، آپ کی شرکت ایک بنیادی اصول کے تحت تھی اور وہ اصول یہ تھا کہ حق اس وقت اپنے محور سے نکل چکا ہے لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اسلام اور اہلِ اسلام کے فوائد کی حفاظت کی جائے اور اختلاف کی خلیج کو کم سے کم کیا جائے تاکہ معاشرہ انارکی سے محفوظ رہے۔

۱۔ نہج البلاغہ مکتوب ۶۲

۱۴

نہج البلاغہ اور نصِ امامت

سوال: کیا نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے لئے کوئی نص امامت موجود ہے؟

جواب: سب سے پہلے نہج البلاغہ کے اسلوب کو سمجھنا چاہئے۔ سید رضی رحمۃ اللہ علیہ نے امیر المومنینؑ کے تمام خطبات جمع نہیں کیے تھے اور نہ ہی نہج البلاغہ امیر المومنین کے جملہ خطبات اور مکاتیب کی جامع ہے۔ سید رضی نے حضرتؑ کے کلام سے ادبی شاہپاروں کو یکجا کر کے اس کا نام ''نہج البلاغہ'' رکھا تھا۔ لہٰذا اگر نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے لئے نص قطعی دکھائی نہ دے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول خدا نے ائمہ ہدیٰ کی امامت پر نص کی ہی نہیں تھی۔

۲۔ نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر امیر المومنین اور آپؑ کے فرزندوں کی وصایت و امامت کا بارہا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم نہج البلاغہ سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں:

مقام اہل بیت:

امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے دوسرے خطبہ میں عظمت اہل بیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"هُم مَوضِعُ سِرِّهِ وَلَجأُ أَمرِهِ وَعَيبَةُ عِلمِهِ وَمَوئِلُ حُكمِهِ وَ كُهوفُ كُتُبِهِ وَ جِبالُ دِينِهِ

بِهِمْ اقامَ انْحِناءَ ظَهْرِهِ وَاَذْهَبَ ارتعادَ فرائِصِهِ... لَايُقاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صَلَی اللہ عَلَيْه وَاٰله مِنْ هٰذِهِ الأُمّة اَحد ولايُسوّىٰ بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتهُمْ عَلَيْهِ اَبداً هُمْ اَساسُ الدِّين وَعِمادُ اليَقين اِلَيْهِمْ يَفِئُ الغالى وَبِهِمْ يلحَقُ التالى وَلَهُمْ خصائصُ حَقِ الوِلايَه وَفِيهِمُ الوَصيّةُ وَالوراثةُ، الآنَ اِذْرَجَعَ الحَقّ اِلىٰ اَهْلِهِ وَنقل اِلىٰ مُنتقَله"۔ (۱)

وہ سرِ خدا کے امین اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں۔ علم الٰہی کے مخزن اور حکومتوں کے مرجع ہیں۔ کتب آسمانی کی گھاٹیاں اور دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ نے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور اسکے پہلوؤں سے ضعف کی کپکپی دور کی۔...... اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے۔ وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کی خصوصیات انہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کے لئے نبی کی وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوگیا"۔

بھلا "فیھم الوصیة والوراثة" سے بڑھ کر واضح نص اور کیا ہوسکتی ہے؟

ایک اور خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"اَيْنَ الَّذينَ زَعَمُوا انّهُمُ الرّاسِخُونَ فِي العِلْمِ دُوننا كذباًوَ بَغياً عَلَيْنا، اَنْ رَفَعَنا الله وَوَضَعَهُمْ وَاَعْطانَا وَحَرَّمهُمْ، وادخلنا واخرجهم بِنايُستَعطى الْهُدىٰ وَيُستَجلى العَمٰى اِنَّ الأَئِمَّة مِنْ قُرَيش غَرَسُوا فى هٰذا الْبَطْنِ مِنْ هاشِم لاتصلح عَلى سِواهُمْ وَلا تصلح الوُلاةُ من غَيْرِهِمْ"۔ (۲)

کہاں ہیں وہ لوگ جو جھوٹ بولتے ہوئے اور ہم پر ستم روا رکھتے ہوئے یہ ادعا کرتے

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۲

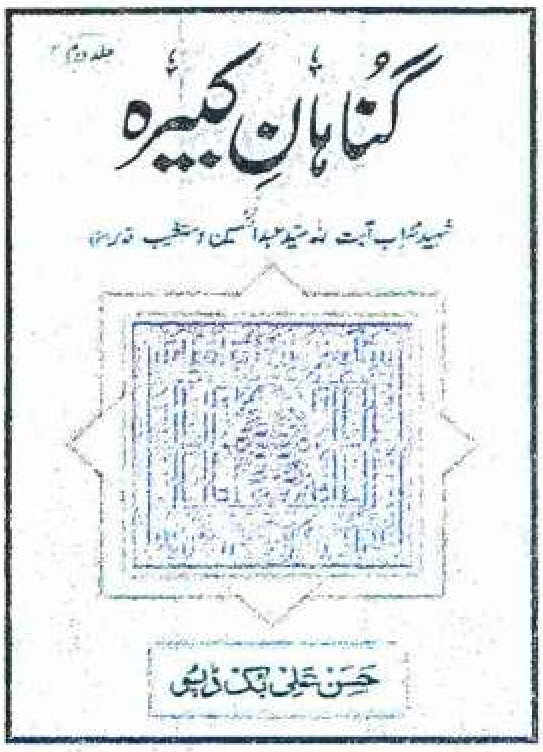
گناہانِ کبیرہ
حسن علی بک ڈپو

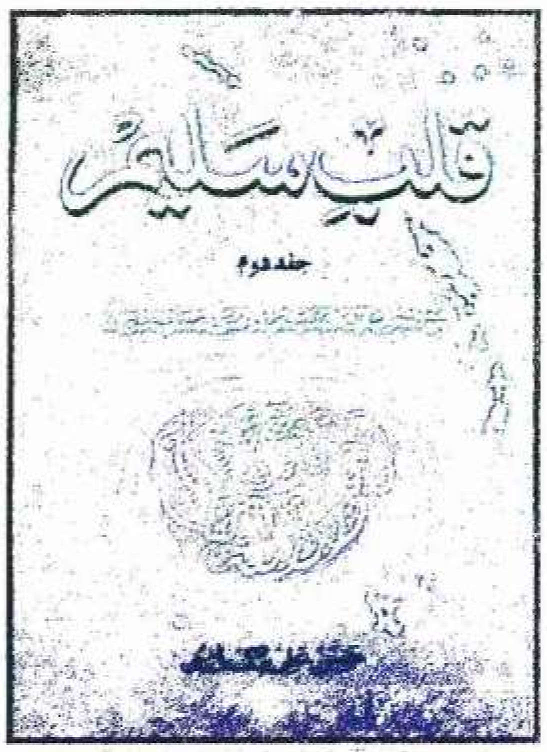
قلبِ سلیم
جلد دوم

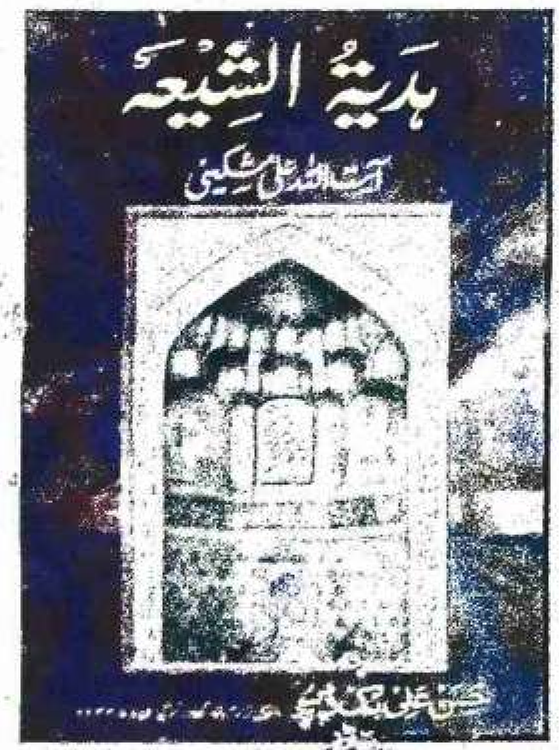
ہدیۃ الشیعہ
حسن علی بک ڈپو

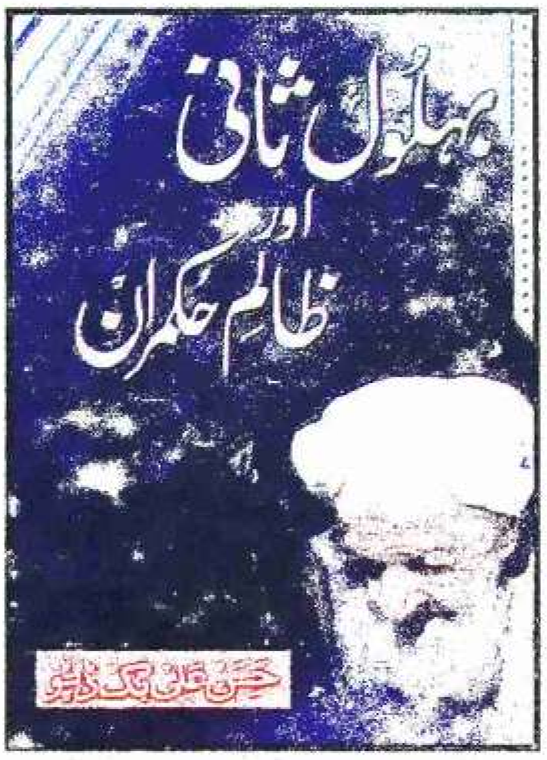
بہلول ثانی
اور
ظالم حکمران
حسن علی بک ڈپو

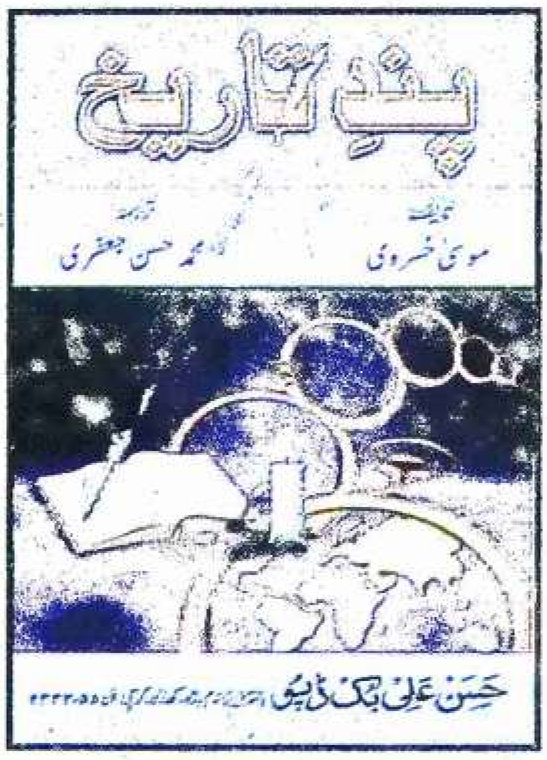
پندِ تاریخ
موسیٰ خسروی
محمد حسن جعفری
حسن علی بک ڈپو

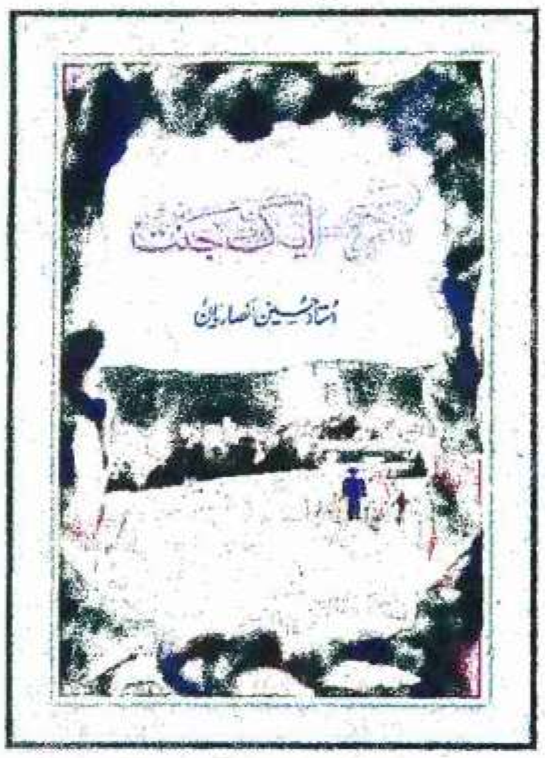

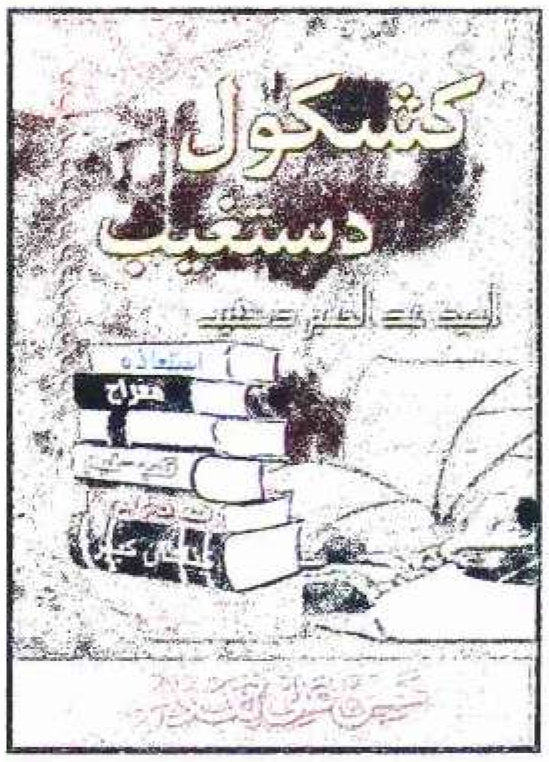
کشکول
دستغیب

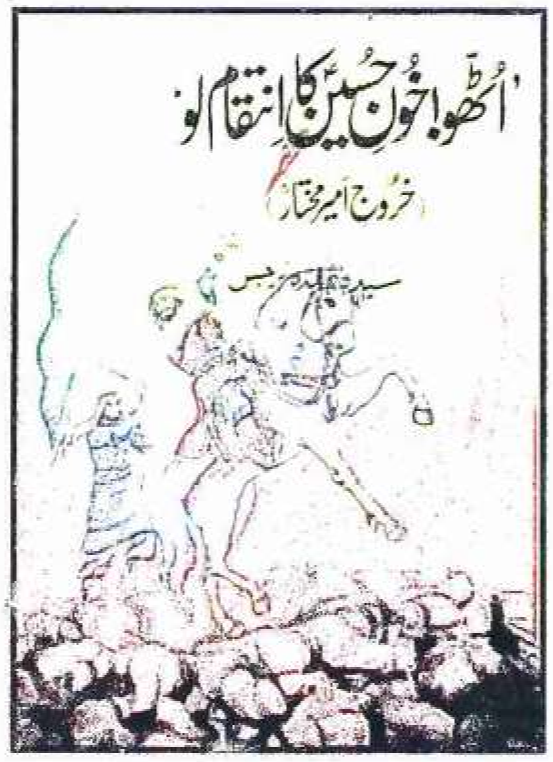
اُٹھو اخونِ حسین کا انتقام لو
خروج امیر مختار

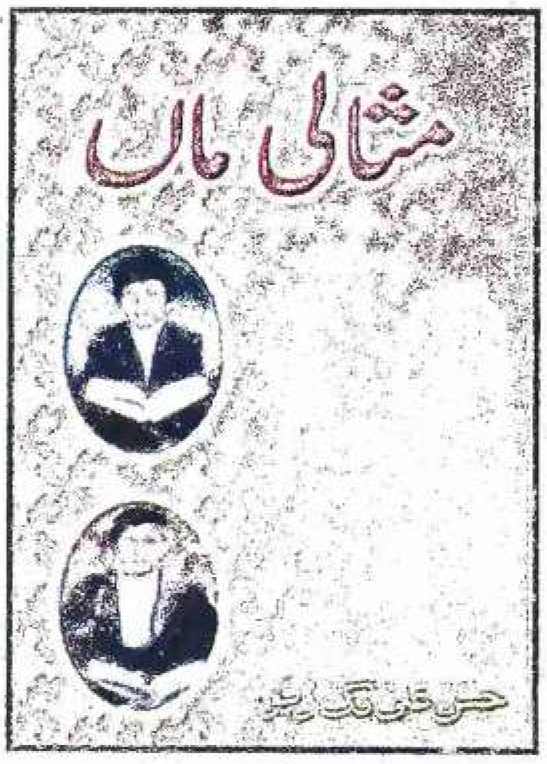
مثالی ماں
حسن علی بک ڈپو

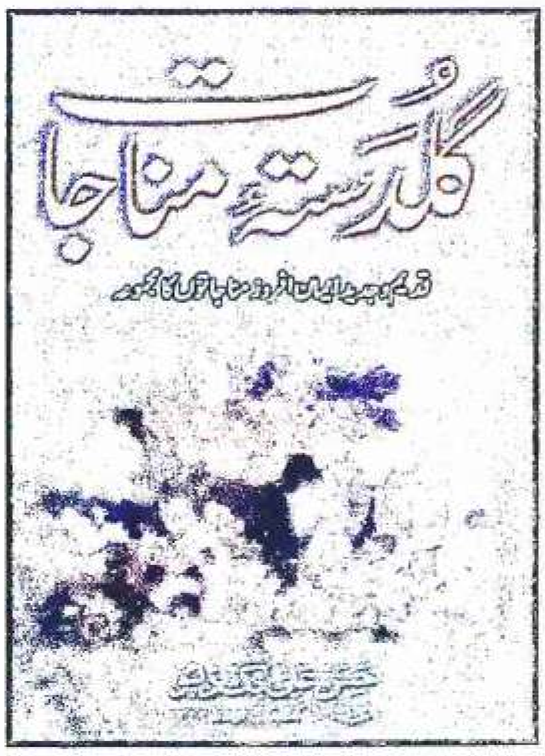
گلدستۂ مناجات

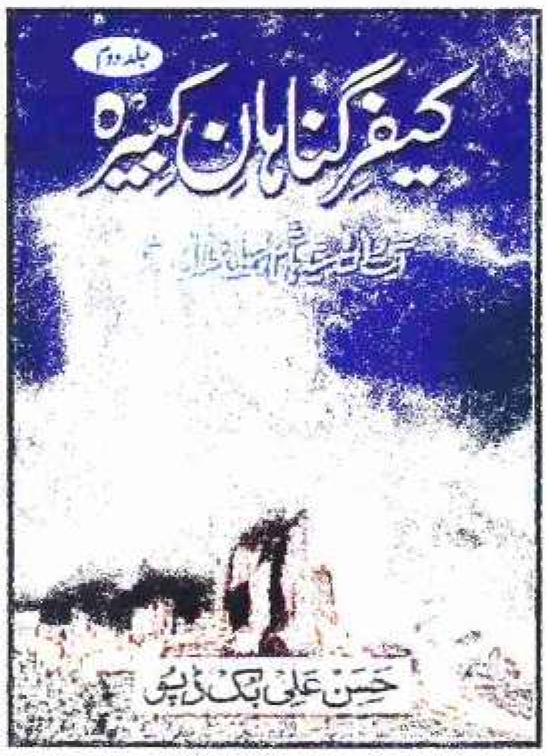
جلد دوم
کیفرِ گناہانِ کبیرہ
حسن علی بک ڈپو

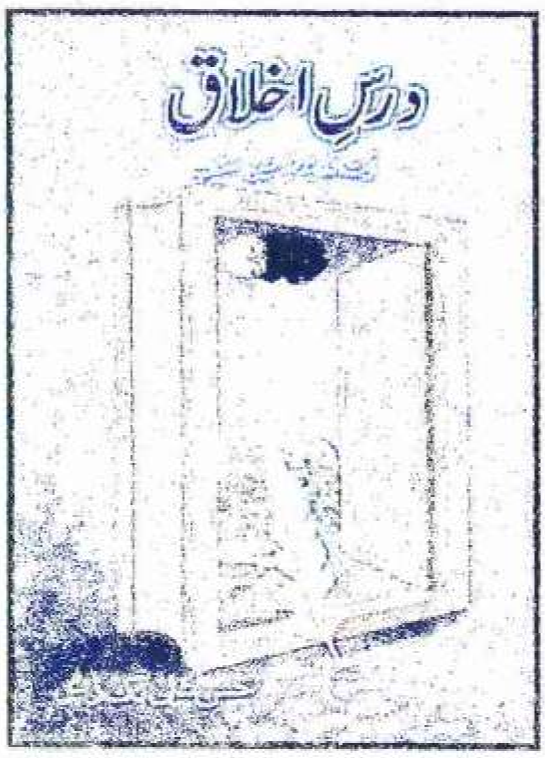
درسِ اخلاق

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ

(سورۃ النساء، آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور صاحبانِ امر (ائمہ اہل بیتؑ) کی۔

شہادتِ ثالثہ در تشہّد

کے متعلق

شرعی فیصلہ

فرصت کے لمحات میں ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بات پر غور کیجئے کہ جلیل القدر مراجع عظام وعلماء اعلام کے خلاف غیر مہذبانہ طرزِ تکلم کا اتنا زیادہ تکرار اور اصرار سے پروپیگنڈا آخر کیوں کیا جا رہا ہے؟ تو فوراً یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ دراصل اس کے پس منظر سامراجی مقاصد کارفرما ہیں۔

تفصیلات اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔

رشحاتِ قلم: حجۃ الاسلام علامہ آفتاب حسین جوادی مدظلہ العالی

معصوم پبلیکیشنز بلتستان